جلد ششم
جواهر الفقہ
فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ
مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مکتبہ دار العلوم کراچی

جواہر الفقہ

فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ

مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد ششم

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

مضمون صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

جواہر الفقہ جلد ششم

کتاب الجہاد

مضمون | صفحہ

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون صفحہ

کتاب الحدود

طریق السداد فی عقوبة الارتداد

مضمون صفحہ

کتاب الصید والذبائح

مضمون	صفحہ

مضمون صفحہ

کتاب الاضحیة

مضمون	صفحہ

مضمون صفحہ

رفع التّلاحی عن جلود الأضاحی

مضمون صفحہ

تحفة الإخوان في تحقيق معنى الضأن

کتاب الحظر والاباحة

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون | صفحہ

٨٣

جہاد

تاریخ تالیف ـــــــــ ۶ر شوال ۱۳۹۱ھ (مطابق ۱۹۷۱ء)

مقامِ تالیف ـــــــــ دارالعلوم کراچی

جہاد کی تعریف، فرضیت، فضائل و مسائل اور اس کے شرعی احکام کی تفصیل پر مشتمل اہم رسالہ، جس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے بہت ضروری ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدللّٰهِ الذى هدانا لِهٰذَا وما كنا لنهتدى لو لا ان هدانا الله والصلوة والسلام على من ارسله بالهدىٰ و دين الحق وكفاه وعلى اله وصحبه وكل من اهتدى بهداء

اما بعد :۔

جہاد اسلام کے فرائض میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی طرح اسلام کا پانچواں فرض ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "**الجهاد ماض الى يوم القيامة**" یعنی جہاد جاری رہے گا قیامت تک۔ قرآن وسنت کی بے شمار نصوص اور اجماع امت جہاد کی فرضیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو کھلے طور پر کفار کے ساتھ جہاد وقتال کے مواقع نہ رہے، اور رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہن سے اس کی ضرورت اور فضائل اور مسائل بھی غائب ہونے لگے۔ عام دیندار مسلمان بھی نماز روزے کے مسائل سے تو کچھ نہ کچھ واقف ہوتے ہیں، جہاد کب فرض ہوتا ہے؟ اس کے احکام کیا ہیں، آداب کیا ہیں؟ اس کی واقفیت تقریباً مفقود ہوتی چلی گئی۔

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان قائم ہو جانے کے بعد ہمارا فرض تھا کہ سب سے زیادہ اس فریضہ جہاد پر توجہ دیتے اور اس کے اسباب و وسائل جمع کرنے میں لگ جاتے اور پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جاتی، ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا جاتا، مگر افسوس ہے کہ ہم نے یہاں پہنچ کر بھی اس فریضہ کو اسی طرح نسیان میں ڈالے رکھا جس طرح پہلے سے تھا۔

قرآن وسنت کی نصوص نیز پوری تاریخ اسلام کا تجربہ شاہد ہے کہ جب بھی مسلمان جہاد چھوڑ دیتے ہیں تو دوسری قومیں ان پر غالب آ جاتی ہیں،، ان کے دل ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور پھر ان کی آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ وہ جذبہ شجاعت وحمیت جو کفار کے مقابلہ میں صرف ہونا چاہئے تھا وہ آپس میں صرف ہونے لگتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔

اس وقت ہم اپنی اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں، سب طرف سے دشمنوں کی یلغار ہے اور مسلمان مختلف پارٹیوں، فرقوں اور نظریوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کے مقابلے میں برسر پیکار ہیں۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے اچانک حملہ کے وقت احقر نے ایک رسالہ ''جہاد'' لکھا تھا جس میں جہاد کی تعریف اور اس کے احکام اور فضائل وبرکات کا مفصل بیان تھا۔ دوسرے علماء کی طرف سے بھی اخباری بیانات اور رسائل اس طرح کے شائع ہوئے اور عام مسلمان دعا کی طرف متوجہ ہوئے۔

الحمدللہ اُس وقت حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے بہت جلد تمام مسلمانوں میں جذبہ جہاد عام فرما دیا، اور فسق وفجور کے بازار سرد پڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ بڑھ گئی۔ اس کے نتیجے میں حق تعالیٰ کی غیبی امداد کا کھلی آنکھوں سب نے مشاہدہ

کیا۔ اس کا شکر تو یہ تھا کہ ہم جنگ کے ختم ہونے کے بعد اور زیادہ اللہ کی طرف رجوع ہوتے اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے جہاد کی تیاری میں لگ جاتے، مگر افسوس ہے کہ معاملہ برعکس ہوا اور اب پھر اسی پرانے دشمن نے ہماری سرحدات پر حملے شروع کر دیئے اس لئے اب یہ رسالہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ پھر شائع کیا جا رہا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت پاکستانی افواج میں اور عام شہریوں میں کثرت سے ہو۔ شاید اللہ تعالیٰ ہماری غفلتوں اور گناہوں کو معاف فرمادیں۔ اور ہمارے دلوں میں پھر سے جہاد کا جذبہ پیدا فرمادیں۔ اور ہمیں اس کا حق ادا کرنے کی توفیق بخشیں۔

بندہ محمد شفیع

۶ رشوال ۱۳۹۱ھ

جہاد کے معنی

لغت میں کسی کام کے لئے اپنی پوری کوشش اور توانائی خرچ کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور دشمن کی مدافعت کرنے میں جان، مال، زبان، قلم کی پوری طاقت خرچ کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ جہاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں:۔

۱......ایک کھلے دشمن کا مقابلہ

۲......دوسرے شیطان اور اس کے پیدا کئے ہوئے خیالات کا مقابلہ۔

۳......تیسرے خود اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے راستہ میں رکاوٹ ہے، اس کی مدافعت جہاد ہے اور یہ رکاوٹ عادتاً انہی تین طرفوں سے ہوتی ہے، اس لئے جہاد کی تین قسمیں ہوگئیں۔ امام راغب نے یہ تین قسمیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ارشاد قرآنی :۔

وَجَاهِدُوْ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں پورا جہاد

یہ جہاد کی تینوں قسموں کو شامل ہے۔

بعض روایات حدیث میں نفس کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ اسی لئے جہاد

قرار دیا ہے۔

قرآن کریم کی کئی آیتوں میں جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کو بھی جہاد فرمایا ہے۔

وتجاهدون فی سبیل الله باموالکم وانفسکم کا بھی یہی مطلب ہے اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی غازی کو سامان جہاد دے دیا اس نے بھی جہاد کرلیا۔

اور ایک حدیث میں زبان کے جہاد کو بھی جہاد قرار دیا ہے، اور قلم چونکہ ادائے مضمون میں زبان ہی کے حکم میں ہے اس لئے قلمی دفاع کو علماء امت نے جہاد میں شامل فرمایا ہے۔

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ لفظ جہاد اصطلاح شرع میں اللہ کی راہ میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کے مقابلہ اور مدافعت کے لیے عام معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر عرف عام میں جب لفظ جہاد بولا جاتا ہے تو عموماً اس کے معنی دشمنان دین کے مقابلہ میں جنگ ہی سمجھے جاتے ہیں، جس کے لئے قرآن کریم نے لفظ قتال یا مقاتلہ استعمال فرمایا ہے۔

جہاد کی نیّت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ تمام عبادات اسلامیہ کی صحت کا مدار نیت کے صحیح ہونے پر ہے۔ اسی لئے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج سب ہی کی ادائیگی میں نیت درست کرنا فرض اور ضروری سمجھا جاتا ہے، رسول اکرم ﷺ کا واضح ارشاد اس معاملہ میں یہ ہے:

انما الاعمال بالنیات و انما الامری ما نوی

(صحیح بخاری)

اعمال کا مدار نیت پر ہے اور ہر انسان کو اپنے عمل کے بدلہ میں وہی

چیز ملتی ہے جس کی نیت کی ہے۔

یعنی عبادات کا ثواب جب ہی کسی کو ملتا ہے جب کہ اس کی نیت خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری اور رضا جوئی کی ہو۔ دنیا کا مال ومتاع یا جاہ ومنصب مقصود نہ ہو، ورنہ اللہ کے نزدیک وہ عبادت نہیں بلکہ ریا ہے، جو بجائے ثواب کے گناہ عظیم ہے۔

علماء اسلام نے اس حدیث کو ایک چوتھائی اسلام قرار دیا ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کا بہت بڑا حصہ اس پر موقوف ہے۔

وہ عالم جو دنیا کی شہرت اور نام ونمود کے لئے بھی علمی خدمات انجام دیتا ہے یا وہ غازی جو جہاد میں شہرت وانعام کی خاطر جانبازی کرتا اور شہید ہو جاتا ہے اور وہ شخص جو نام ونمود کے لئے دینی خدمات میں بڑی فیاضی سے مال خرچ کرتا ہے۔

ان تینوں کے متعلق صحیح حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ ان کو یہ کہہ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا کہ تو نے جس مقصد کے لئے علم دین کو استعمال کیا یا جس مقصد کے لئے جان دی، یا جس مقصد کے لئے مال خرچ کیا، وہ مقصد ہم نے تجھے دنیا میں عطا کر دیا کہ لوگوں میں تیرے عالم، ماہر ہونے کی شہرت ہوئی، یا تجھے غازی اور شہید کے نام سے پکارا گیا، یا مال خرچ کرنے کی بناء پر تجھے سخی اور فیاض کہا گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟ العیاذ باللہ!

جہاد کے میدان میں اترنے والے ہمارے بھائی جو ساری دنیا کو چھوڑ کر اپنی جانوں کی بازی لگاتے ہیں، دنیا وآخرت کے اعتبار سے کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے ثواب کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اُن حضرات کے لئے نہایت اہم ضرورت اس کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مذکور کو ہر وقت سامنے رکھیں اور جہاد میں اخلاص کے ساتھ صرف یہ نیت کریں کہ اللہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی

حفاظت اور دشمنان دین کی مدافعت کرنا ہے۔ دنیا کے ثمرات ونتائج اور انعامات بھی اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائیں گے۔ مگر جہاد کے وقت ان چیزوں کو اپنے دل میں نہ آنے دیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

مومن کا جہاد وطن کے لئے نہیں اسلام کے لیے ہے

اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں نسلی، قبائلی، وطنی، لسانی وحدتوں کے بت توڑ کر ایک اسلام کی وحدت قائم کی تھی جس میں مشرق ومغرب کے بسنے والے کالے، گورے، عربی، ہندی سب یکساں شریک ہوں یہ ایک ایسی وحدت قائم ہوئی جس نے دنیا کی ساری وحدتوں کو زیروزبر کر دیا۔

چند صدیوں سے یورپ، والوں نے اس اسلامی وحدت کی بے پناہ قوت سے عاجز ہو کر بڑی چالاکی سے لوگوں میں پھر وطن پرستی، اور نسب پرستی کے جذبات بیدار کیے تاکہ اسلامی وحدت کو جغرافیائی اور نسلی تفرقوں میں بانٹ کر پارہ پارہ کر دیں، کفار کے پاس تو کوئی ایسا دین ومذہب نہیں جس کے نام پر تمام دنیا کے انسانوں کو جمع کر سکیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ یا اپنے قبیلہ اور نسب کی حفاظت کے لیے اسی کے نام پر جنگ کرتے ہیں، یا پھر اپنے وطن اور ملک کے نام پر لوگوں کو دعوت اتحاد دیکر جمع کرتے ہیں، اور لڑتے ہیں۔

مسلمان قوم کو اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں سے بالاتر رکھا ہے وہ صرف اللہ کے لئے اور اسلام کے لئے جہاد کرتا ہے، اور جو وطن یا نسب اللہ تعالیٰ اور اسلام کی راہ میں حائل ہو اس نسب وطن کو بھی اس پر قربان کر دیتا ہے۔ اسلام کی سب سے پہلی ہجرت مدینہ نے اور بدر واُحد کے میدانوں نے ہمیں یہی سبق دیے ہیں، کیونکہ ان میدانوں میں ایک ہی خاندان کے افراد کی تلواریں اسی خاندان کے

دوسرے افراد کے سروں پر اس لئے پڑی ہیں، کہ وہ اللہ ورسول ﷺ کے دشمن تھے۔ اگر وطنی اور قبائلی وحدتیں مقصد ہوتیں تو یہ سارے جہاد فضول ہوتے۔

آج کل عام لوگوں کی زبان پر وطن کا نعرہ سنتے سنتے مسلمان بھی اس کے عادی ہوگئے اور اپنے جہاد کو وطن کے لیے کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے اکثر نوجوانوں کے خیالات اس سے پاک ہیں، وہ اپنی جان اللہ کے لئے دیتے ہیں، نہ کہ وطن کے لئے لیکن رائج الوقت زبان کا ایک محاورہ بن جانے کے وجہ سے اکثر ہمارے شعراء اور خطباء غالبًا بے خیالی میں یہ الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ایسے مشرکانہ الفاظ سے بھی اجتناب کیا جائے۔

ہمارا وطن اسلام ہے

ہم وطن پرست نہیں، ہمیں اس وطن سے ہجرت کر جانے کا حکم ہے جس میں رہ کر ہم اسلام کے تقاضے پورے نہ کرسکیں۔

یہ وہ نظریہ ہے کہ جس نے پاکستان بنوایا اور کروڑوں مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر آمادہ کیا، شاعر مشرق اقبال مرحوم نے اس مضمون کو بڑی ہی لطافت سے ادا کیا ہے۔ وطنیت پر ان کے چند اشعار اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں۔

اس دور میں مئے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف وکرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے غارتگر کا شانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھادے
اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملادے

اسلامی جہاد کا ناقابل تسخیر سامان صبر اور تقویٰ ہے

دنیا اپنے حریف پر غلبہ پانے کے لیے طرح طرح کے سامان اور تدبیریں کرتی ہے، اور اس سائنس کی ترقی کے زمانہ میں تو ان سامانوں اور تدبیروں کی حد نہیں رہی۔ اسلام بھی ضروری مادّی تدبیریں اور سامانِ جنگ جمع کرنے کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ اس کا مفصل بیان آگے آتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مادی سامان وتدابیر مسلمانوں کو دوسری قوموں سے کوئی خاص امتیاز حاصل ہے نہ ہوسکتا ہے بلکہ عادتاً غیر مسلموں کی ساری ذہنی فکری توانائی اور سارازور چونکہ ان ہی مادی سامانوں میں صرف ہوتا ہے وہ اس معاملہ میں مسلمانوں سے ہمیشہ زیادہ ہی رہیں گے اور تاریخ کے ہر دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

البتہ مسلمانوں کے پاس ایک اور ایسی قوت ہے جو ناقابل تسخیر رہی ہے، اور دوسری قومیں اس سے عاجز ہیں وہ ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی امداد۔ مگر قرآن نے اس تائید ربانی کے حاصل ہونے کی کچھ شرطیں رکھی ہیں۔ جب بھی مسلمان ان شرطوں کو پوارکرلیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد آتی ہے۔ اور تھوڑی تعداد تھوڑے سامان کو بڑی سے بڑی جنگی سامانوں پر غالب کردکھاتی ہے۔

اور جب مسلمان خود ان شرطوں کو پورا کرنے میں سستی اور غفلت کریں تو پھر اس امداد ونصرت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں۔ ایسی حالت میں ہمیں اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں سمجھنا چاہئے یہ دوسری بات ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے

خاص فضل وکرم سے مسلمانوں کے ضعف پر رحم فرمائیں اور بلاشرط بھی اپنی امداد بھیج دیں، جیسا کہ ۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے حملہ کے وقت اس کا مشاہدہ ہوا کہ ہم اور ہماری قوم ان شرطوں پر کسی طرح پوری نہیں اترتی تھی۔ جن کے ذریعے امداد الٰہی آنی چاہئے۔ مگر اس نے اپنے فضل سے یک بیک ہمارے حالات میں بھی انقلاب پیدا کر کے ہمیں صبر وتقویٰ کے قریب کر دیا اور اپنی امداد کے ایسے معجزات دکھائے کہ دشمنوں کو بھی اس کا قائل ہونا پڑا۔

امداد الٰہی کے لیے وہ شرطیں کیا ہیں ؟ قرآن کریم کی آیات ذیل میں تلاش کیجئے:۔

۱۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ع ۱۹)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! مدد مانگو اللہ سے صبر اور نماز کے ذریعہ

۲۔ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ع:۲۲)

ترجمہ:۔ نیکوکار وہ لوگ ہیں جو تنگ دستی اور بیماری میں اور دشمنوں سے جہاد کے وقت صبر کرنے والے یعنی ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ یہی لوگ صادقین ہیں اور متقی ہیں۔

۳۔ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (بقرہ ع:۳۳)

ترجمہ:۔ جہاد میں نکلنے والوں نے کہا) اے ہمارے پروردگار عطا کر دے ہم کو صبر اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کی قوم کے مقابلہ پر ہماری مدد فرما۔

٤۔وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُھُمۡ شَیۡئًا (آل عمران ع:۱۳)

ترجمہ:۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی جنگی تدبیر تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

٥۔بَلٰۤی اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَیَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِھِمۡ ھٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیۡنَ

ترجمہ:۔ بے شبہ اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیا اور دشمن فوراً ہی تم پر ٹوٹ پڑے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار نشانہ کرنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

٦۔وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (آل عمران ع:۹)

ترجمہ:۔ اور اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیا تو یہی ہمت کے کام ہیں۔

٧۔یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (آل عمران ختم)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! صبر کرو یعنی ثابت قدم رہو اور دوسروں کو بھی ثابت قدم رکھو اور دل لگائے رہو عبادت میں تاکہ تم فلاح وکامیابی حاصل کرو

٨۔وَقَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهِ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ یُوۡرِثُھَا مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ (اعراف،۱۵)

ترجمہ:۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، بے شبہ زمین اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہے اس کا مالک ووارث بنادے اور انجام کار کامیابی تقویٰ شعار لوگوں کی ہی ہے۔

۹۔ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآئِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُه وَمَا كَانُوْ يَعْرِشُوْنَ۔ (اعراف ع:۱٦)

ترجمہ:۔ اور اپنے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہوگیا اور ہم نے فرعون کے اور اس کے اور اس کی قوم کے ساختہ پر داختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے، سب کو درہم برہم کردیا۔

۱۰۔ اِنَّهُ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

ترجمہ:۔ اس لئے کہ جو شخص صبر اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

قرآن کریم میں یہ دس آیتیں ہیں۔ ان کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے۔ ان میں انسان کے تمام اہم مقاصد خصوصاً جہاد اور دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی غیبی تائید اور نصرت وامداد حاصل کرنے کا نسخہ بتلایا گیا ہے۔ اس نسخہ کے دو تین اجزاء آپ کو ان سب آیات میں مشترک نظر آئیں گے۔ صبر، تقویٰ، نماز۔

ان آیات میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ ابتدائے آفرینش عالم سے اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے، کہ اس کی تائید ونصرت ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو ایمان کے ساتھ نماز اور صبر وتقویٰ کے پابند ہوں۔

نماز کا مفہوم اور اس کی اہمیت تو سب ہی مسلمان جانتے ہیں، صبر کا لفظ عربی زبان میں ہماری زبان کے عربی معنی سے عام معنی رکھتا ہے۔ عربی زبان میں صبر کے عام معنی نفس کے روکنے کے ہیں۔ اور قرآن کی اصطلاح میں نفس کو اس کی بری خواہشات سے روکنے کے ہیں اور قابو میں رکھ کر ثابت قدم رہنے کے ہیں۔

اور تقویٰ کا ترجمہ پرہیز گاری کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت وفرماں برداری کا نام تقویٰ ہے۔

اسلامی تاریخ کے قرنِ اول میں جو چیزیں مسلمانوں کا شعار اور طرۂ امتیاز تھیں وہ یہی نماز اور صبر وتقویٰ ہیں۔ اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر میدان میں فتح مبین اور کامیابی عطا فرمائی۔ آج بھی اگر ہم اس اصول پر کاربند ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد ہم سے کچھ دور نہیں حقیقت یہ ہے کہ ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

جہاد کی تیاری اور سامانِ جنگ کی فراہمی بھی فرض ہے

صبر وتقویٰ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان وتوکل تو مسلمانوں کی اصل اور ناقابل تسخیر طاقت ہے ہی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مقام کے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ بھی جمع کیا جائے، قرآن کریم کا ارشاد ہے :۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ.

اور تیار کرو تم دشمن کے لیے جتنا بھی تم کر سکو سامانِ جنگ اور سدھے ہوئے گھوڑے تاکہ دھاک پڑ جائے اللہ کے دشمنوں اور

تمہارے دشمنوں پر۔

رسول کریم ﷺ نے ہمیشہ جنگی مشقوں کا اہتمام فرمایا۔ اس زمانہ میں جو جنگ کے ہتھیار تھے ان کو جمع کرنے کی ہدایتیں فرمائیں۔ جہاد کے لیے گھوڑے، اونٹ، زرہ بکتر وغیرہ جمع فرمائے تیراندازی اور نشانہ بازی کے مشق کے لیے ہدایت فرمائی۔

صحابہ کرام نے سامانِ جنگ کی صنعت سیکھنے کے لئے دوسرے ملکوں کا سفر کیا

امامِ حدیث وتفسیر ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں غزوہ حنین کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے دو صحابی حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بن مسعود اور غیلان بن اسلم رضی اللہ عنہ اس جہاد میں آنحضرت کیساتھ اس لیے شرکت نہیں کر سکے کہ وہ بعض جنگی اسلحہ اور ساز وسامان کی صنعت سیکھنے کے لیے دمشق کے مشہور صنعتی شہر جرش میں اس لیے گئے ہوئے تھے کہ وہاں دبّابہ اور ضبّور کی وہ جنگی گاڑیاں بنائی جاتی تھیں جن سے اس وقت آج کل کے ٹینکوں جیسا کام لیا جاتا تھا۔ اسی طرح منجنیق کا وہ آلہ جس سے بھاری پتھر پھینک کر قلعہ شکن توپوں کا کام لیا جاتا تھا، اس کی صنعت بھی وہاں تھی۔ یہ صنعتیں سیکھنے کے لیے ان بزرگوں نے ملک شام کا سفر اختیار کیا تھا۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کو جنگی اسلحہ اور سامان کے لیے خود کفیل بنائیں۔ دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ جنگی گاڑیاں اور منجنیق وہاں سے خرید کر درآمد کر لی جاتی، مگر رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود اپنے یہاں ان کے تیار کرنے کی تدبیر اختیار فرمائی۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر پورا غور کریں کہ رسول کریم ﷺ کو تو وہ روحانی اور ربّانی طاقت اور نصرت حاصل تھی جس کے ہوتے ہوئے مادّی سامان کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مگر پھر بھی آپ ﷺ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا، تو ہم جیسے گنہگار ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے کہ موجودہ زمانہ جنگ کے لئے جس طرح کے اسلحہ اور آلات وسامان کی ضرورت ہے، ان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اور اس کوشش میں لگ جائیں کہ قریب سے قریب مدّت میں ان چیزوں کے لیے اپنے ملک کو خود کفیل بنا سکیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

رباط یعنی اسلامی سرحدات کی حفاظت

جہاد کی مہمات میں سے ایک کام اسلامی سرحدات کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا ہے جس کو قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ''رباط'' کہا جاتا ہے اور جہاد کی طرح اس کے بھی بڑے فضائل قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے اس کام کو دوسرے کاموں پر ترجیح دے کر اسلامی سرحدات پر قیام اختیار فرمایا تھا۔

آج کل یہ فرائض ہماری رینجرز پولیس انجام دیتی ہے، اگر نیت میں اخلاص اور اسلامی ملک کی حفاظت کا جذبہ ہو تو تنخواہ لینے کے باوجود بھی یہ ''رباط'' کے ثواب کے مستحق ہوں گے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک دن اللہ کی راہ میں رباط کی خدمت انجام دینا ایک مہینہ کے مسلسل روزے اور شب بیداری سے افضل ہے اور اگر اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا تو جو نیک عمل یہ کرتا تھا وہ مسلسل اس کے نامہ اعمال میں مرنے کے بعد بھی لکھے جاتے رہیں گے۔ اور قبر کے سوال

وجواب اور عذاب سے محفوظ رہے گا۔

اور طبرانی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ شخص قیامت کے روز شہیدوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا، اور قیامت کے ہولناک عذاب میں بھی اس کو اطمینان ہوگا۔

(فتح القدیر)

رباط کا مفہوم اسلامی سرحدات کی حفاظت ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ کام ان ہی مقامات پر ہوسکتا ہے جو اسلامی ملک کی آخری حدود پر واقع ہیں۔لیکن اس زمانہ کی فضائی جنگ نے اس معاملہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے کیونکہ چھاتہ بردار فوج ہر جگہ اتر سکتی ہے، بمبار طیاروں سے ہر جگہ بم گرائے جاسکتے ہیں، اس لیے جن مقامات پر بھی دشمن کی ایسی یورش کا خطرہ ہو، ان کے حفاظتی انتظامات بھی اسی رباط کے حکم میں داخل ہوں گے۔

قدیم فقہاء نے بھی رباط کے معاملہ میں یہ فرمایا ہے کہ جس بستی پر ایک مرتبہ دشمن حملہ کردے اس کی حفاظت چالیس سال تک رباط کے حکم میں داخل ہے۔

(فتح القدیر، ص:۲۸۷، ج:۴)

پاکستان کے سابقہ جہاد میں سرگودھا، پشاور، کراچی وغیرہ مقامات جہاں چھاتہ بردار فوجیں اترنے کے خطرات پائے گئے اور جہاں دشمن کے بمباروں نے بمباری کی، ان کی حفاظت کا ہر قدم رباط کے حکم میں ہے۔ یہ ایسا جہاد ہے جس میں ہر شہری اپنے گھر میں بیٹھا ہوا بھی رباط کا ثواب لے سکتا ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ اپنے شہر اور شہریوں کی حفاظت کا جذبہ رکھتا ہو اور مقدور بھر اس میں کوشش کرے۔

بلیک آؤٹ بھی رباط کے حکم میں ہے

ایسے خطرات کے وقت جن بستیوں میں حکومت کی طرف سے اندھیرا جاری رکھنے کی ہدایات جاری ہوں ان کی تعمیل بھی ان ہی حفاظتی انتظامات کے تحت رباط کے حکم میں داخل ہو کر انشاء اللہ اس ثواب عظیم کا موجب ہوگی مسلمان اس سے تنگ دل نہ ہوں بلکہ مفت کا ثواب رباط حاصل کرنے پر خوش ہوں اور شکر ادا کریں۔

عہدِ رسالت ﷺ میں بلیک آؤٹ کی ایک نظیر

جنگی حالات اور انکے تقاضے ہر زمانے اور ہر ملک میں جدا ہوتے ہیں۔ ملک کے مبصر اور ارباب حکومت جس چیز کو شہری دفاع کے لیے ضروری قرار دیں، اس کی تعمیل شرعی حیثیت سے بھی ضروری ہو جاتی ہے خواہ اس معین چیز کا ثبوت قرون اولیٰ کی روایات میں ہو یا نہ ہو، کیونکہ بنیادی مسئلہ مباحات میں اطاعت امیر کا ہے اس کا ثبوت قرآن وحدیث میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے، وہی ان تمام جائز کاموں میں تعمیل حکم کی اصل علت ہے لیکن کوئی خاص کام اگر سرورِ کائنات ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہو تو اس کا محبوب ومشروع ہونا ور مبارک عمل ہونا ظاہر ہے۔

دوران جنگ پاکستان میں شہری دفاع کے لئے حکومت نے رات کو روشنی کرنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اطاعت حکم کے تحت تو اس کی تعمیل ضروری تھی ہی، اتفاق سے اس کی ایک نظیر خود عہدِ رسالت ﷺ میں بھی ملتی ہے جو ناظرین کی دلچسپی اور ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

جمادی الثانی ۸ ھ میں جہاد کے لیے ایک لشکر مدینہ طیبہ سے دس منزل کے فاصلہ پر لخم وجزام کے قبائل کے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا تھا، جس کے امیر حضرت

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ اس غزوہ میں دشمن کے سپاہیوں نے پوری فوج کو حلقہ زنجیر میں جکڑ رکھا تھا تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے۔ اسی لیے یہ غزوہ ''ذات السلاسل'' کے نام سے موسوم ہے (یاد رہے کہ جنگ ذات السلاسل کے نام سے جو مشہور جنگ ہوئی وہ دورِ صحابہ میں اس کے بعد ہوئی ہے)۔

حدیث کی مشہور کتاب جمع الفوائد معجم کبیر طبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس غزوہ ذات السلاسل میں امیر لشکر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا کہ لشکر گاہ میں تین روز تک رات کے وقت کسی طرح کی روشنی نہ کریں اور نہ ہی آگ جلائیں۔

تین دن کے بعد دشمن میدان سے بھاگ کھڑا ہوا بھاگتے ہوئے دشمن کا صحابہ کرام نے جو لشکر میں موجود تھے، تعاقب کرنا چاہا، مگر امیر لشکر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے تعاقب سے بھی منع کر دیا، لشکر کے جانبازوں کو روشنی بند کرنے کے حکم ہی سے ناگواری تھی کہ تعاقب نہ کرنے کا حکم اور بھی ناگوار گزرا، مگر اطاعت امیر کی بناء پر تعمیل لازمی تھی، اس لیے ان دونوں احکامات کی بلا چون و چرا پابندی کی گئی۔ البتہ جب لشکر مدینہ طیبہ واپس پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بلا کر وجہ دریافت فرمائی۔

حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے لشکر کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں تھوڑی تھی، اس لیے میں نے رات کو روشنی کرنے سے منع کیا کہ مبادا دشمن ان کی قلت تعداد کا اندازہ لگا کر شیر نہ ہو جائے اور اس کا حوصلہ نہ بڑھ جائے۔ اور تعاقب کرنے سے بھی اسی لیے روکا کہ ان کی کم تعداد دشمن کے سامنے آجائے گی تو وہ کہیں لوٹ کر ان پر حملہ نہ کردے۔

رسول کریم ﷺ نے ان کی اس جنگی تدبیر اور عمل کو پسند فرما کر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے

فرض کفایہ اصطلاح شرع میں اس فرض کو کہا جاتا ہے جس کا تعلق ہر مسلمان کی ذات سے نہیں بلکہ پوری مسلم قوم سے ہے۔ ایسے فرض کا یہ حکم ہے کہ مسلمانوں سے چند آدمی اس فرض کو پورا کر دیں تو باقی سب مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو جن جن لوگوں کو اطلاع پہنچے اور قدرت کے باوجود ادا نہ کریں۔ وہ سب گنہگار رہوں گے۔

مثال کے طور پر مسلمان میت کی نماز جنازہ اور کفن دفن کا انتظام کرتا ہے کہ یہ فریضہ پوری مسلم قوم کے ذمہ ہے، عزیز قریب اور برادری کے لوگ اگر اس فریضے کو ادا کریں تو باقی سب مسلمان سبکدوش ہو گئے اور اگر میت کا کوئی ایسا عزیز قریب موجود نہیں یا موجود ہوتے ہوئے عاجز ہے یا جان بوجھ کر غفلت کرتا ہے تو محلے کے دوسرے لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اس کو انجام دیں، محلے والے بھی نہ کریں تو شہر کے دوسرے لوگوں پر جن کو اطلاع ملے یہ فریضہ عائد کیا جائے گا شہر والے بھی نہ کریں تو اس کے متصل دوسرے شہر والوں پر عائد ہوگا۔ اسی طرح اسلام کے جتنے بھی اجتماعی فرائض واجبات ہیں سب فرض کفایہ ہیں اور ان کا بھی یہی حکم ہے۔

احکام دین کی تعلیم و تبلیغ ضرورت کے مطابق مسجدوں کی تعمیر اور دینی تعلیم کے مدرسوں کا قیام محتاجوں، یتیموں اور غریبوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے محتاج خانے، یتیم خانے وغیرہ قائم کرنا، ناواقفوں کو احکام شرعیہ بتلانے کے لیے فتویٰ دینے کا انتظام، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا انتظام، اسلام کے خلاف اسلام

کے دشمنوں یا گمراہوں کی طرف سے شبہات وتحریفات کے جوابات کا انتظام، اسلام کا کلمہ بلند کرنے اور معاند دشمنوں کو زیر وزبر کرنے کے لئے جہاد۔

یہ سب امور وہی ہیں جن کا تعلق پوری مسلم قوم سے ہے، اور یہ اجتماعی فرائض ہیں، ایسے فرائض کو عین حکمت کے مطابق حق تعالیٰ نے ہر شخص پر فرض عین نہیں کیا بلکہ پوری قوم کے ذمہ لگا دیا ہے تاکہ وہ تقسیم کے ذریعہ ان سب فرائض کو آسانی سے ادا بھی کرسکیں اور اپنی معاشی ضروریات اور عینی فرائض کی ادائیگی کے لیے بھی ان کو فرصت ملے سکے۔

پوری قوم میں سے جس قدر آدمی ایک کام کی ضرورت کو پورا کرسکیں اور وہ اسی کام میں لگ جائیں تو باقی پوری قوم اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتی ہے بعض تعلیم دین کے لیے مدارس کا انتظام کریں، بعض فتویٰ اور تصنیف کی ضرورت پوری کریں، بعض مساجد کے قیام وانتظام میں لگیں، بعض یتیم خانے، محتاج خانے، شفا خانے وغیرہ بنانے کا کام کریں، بعض قلم اور زبان کا جہاد کر کے مخالفین اسلام کے جوابات دیں، بعض جہاد وقتال کے فرائض کو انجام دیں۔

جہاد وقتال کے بارے میں حق تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے :-

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً ط وَكُلًّا وَّعَدَاللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ط (سورہ نساء، پ:[illegible]، ص:[illegible])

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت بلند بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے اجر عظیم دیا ہے۔

اس آیت نے واضح طور بتلا دیا ہے کہ اگرچہ جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ اللہ کے نزدیک بڑا ہے مگر جو لوگ دوسرے کاموں کی وجہ سے خود کو جہاد میں شریک نہ کرسکیں ان سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جہاد اپنی اصل عام قومی فرائض کی طرح فرض کفایہ ہے۔

دوسری آیت مَاكَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً میں بھی یہ بتلایا گیا ہے کہ جب بھی مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کے لئے کافی ہو تو سب پر جہاد واجب نہیں رہتا۔

فرض کفایہ بعض اوقات فرض عین ہو جاتا ہے

اگر کوئی قومی فرض جو علی الکفایہ سب کے ذمہ فرض ہے اس کے ادا کرنے والی کوئی جماعت موجود نہیں ہے یا موجود ہوتے ہوئے سستی یا غفلت کر رہی ہے یا اس کی تعداد اور سامان اس فریضے کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہے تو ان سے قریب کے مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اس فریضے کو ادا کریں اور اگر ادا کرنے والوں کو جانی یا مالی امداد کی ضرورت ہو تو اس کو پورا کریں۔

قریب کے مسلمانوں نے بھی غفلت برتی یا وہ بھی اس فریضے کی ادائیگی کے لیے کافی نہ ہوئے تو ان سے قریب کے شہروں اور دیہات میں بسنے والے مسلمانوں پر فریضہ عائد ہو جائے گا، اسی طرح جس قدر جانی یا مالی امداد کی ضرورت پیش آتی جائے گی نزدیک سے لے کر سب مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا چلا جائے گا، صرف بچے، بوڑھے، بیمار، نادار اور اپاہج لوگ اس فرض سے مستثنٰی ہوں گے۔

(ہدایہ، بدائع)

جہاد کب فرض عین ہو جاتا ہے

جب کفار مسلمانوں کے کسی شہر پر حملہ کردیں اور اس کی مدافعت کے لیے ملک کا مسلمان حاکم و امیر حکم عام جاری کرے کہ سب مسلمان جو قابل جہاد ہیں، شریک ہوں، تو سب پر جہاد کے لیے نکلنا فرض عین ہو جاتا ہے، مدافعت کی ضرورت میں عورتوں پر بھی مقدور بھر مدافعت فرض ہو جاتی ہے۔

غزوہ تبوک میں رسول کریم ﷺ نے ایسا ہی حکم عام جاری فرمایا تھا۔ اسی لیے جو لوگ اس جہاد میں شریک نہیں ہوئے ان پر سزائیں جاری کی گئیں۔

مسائل متفرقہ

مسئلہ:۔ یہ ضروری نہیں کہ شہر کا حاکم و امیر اعلان جہاد کرے، متقی، پرہیزگار یا عالم ہی ہو، جو بھی مسلمان حاکم ہو، جب ایسے حکم عام کی ضرورت محسوس کرے، یہ حکم دے سکتا ہے اور سب مسلمانوں کو اس کا یہ حکم ماننا فرض ہے۔

(فتح القدیر۔ ص: ۲۸۰، ج: ۴)

فائدہ:۔ اس میں شبہ نہیں کہ امیر جہاد کا عالم و متقی ہونا بہت بڑی نعمت ہے اور فتح کا بہت بڑا سامان ہے، رسول کریم ﷺ جب بھی کسی کو امیر جہاد مقرر فرماتے تو اس کو وصیت فرماتے تھے کہ خود بھی تقویٰ اختیار کریں اور اپنے سپاہیوں کو بھی اس کی تلقین کریں اور یہی مسلمان کا وہ اصل جوہر ہے جو دنیا کی کسی طاقت سے مغلوب نہیں ہوتا یہ سب کچھ ہے مگر عمل جہاد کے لیے شرط نہیں۔

جہاد ہر مسلمان امیر و حاکم کے ساتھ ضروری اور اس کے جائز احکام کی تعمیل واجب ہے۔

مسئلہ:۔ جہاد جب فرض کفایہ ہو تو بیٹے کو ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں جانا جائز نہیں کیونکہ ان کی خدمت اور اطاعت فرض عین ہے۔ وہ فرض کفایہ کی وجہ سے ساقط نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح عوت کا شوہر کی اجازت کے بغیر جہاد کے کام میں لگنا جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورت میں جائز نہیں۔ البتہ اگر دشمن کے شدید حملہ کی وجہ سے مسلمان حاکم وقت سب کو جہاد میں لگنے کا حکم جاری کردے اور جہاد فرض عین ہوجائے تو پھر بیٹا ماں باپ کی اجازت کے بغیر، عورت شوہر کی اجازت کے بغیر بھی اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ (بدائع۔ص:۹۸،ج:۷)

مسئلہ:۔ میدان جہاد سے بھاگنا انتہائی سخت گناہ اور غضب الٰہی کا سبب ہے قرآن کریم میں ہے:۔

يَـاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَالَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفاً فَلَاتُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ط

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! جنگ میں کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو تم ان سے پشت نہ پھیرو۔

اور فرمایا گیا:۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ فَقَدْبَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط

ترجمہ:۔ اور جس نے اس دن کافروں سے پشت پھیری تو اللہ کا غضب لے کر لوٹا۔

مسئلہ:۔ ہاں! اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ مجاہدین کو حالات سے اس کا پورا اندازہ ہوجائے کہ اگر ہم اس وقت لڑیں گے تو ہم سب فنا ہوجائیں گے اور دشمن کو نقصان نہ پہنچاسکیں گے۔ ایسے وقت ان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے

مسلمانوں سے کمک حاصل کرنے اور تیاری کے بعد لڑنے کی نیت سے اس وقت میدان چھوڑ دیں اور پھر دوسرے مسلمانوں کی امداد اور سامان کی تیاری کے ساتھ دوبارہ مقابلہ پر جائیں۔ اس کا مدار مجاہدین کی تعداد اور سامان کی کمی یا زیادتی پر نہیں، بلکہ محاذ جنگ کے مجموعی حالات اور تجربہ پر ہے۔ تجربہ ہی سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر لڑنا مفید ہے یا پیچھے ہٹنا۔ قرآن مجید میں ایسے ہی حال کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ اِلاَّ مُتَحَرِّ فًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزاً اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْبَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط

ترجمہ:۔ اور جس نے اس دن کافروں سے پشت پھیری، بجز جنگی چال کے، یا مسلمانوں کے کسی گروہ سے ملنے کے لئے تو اللہ کا غضب لے کر لوٹا

اس سے معلوم ہوا کہ جنگی تدابیر کے لئے یا دوسرے مسلمانوں سے امداد حاصل کرنے کے لئے پیچھے ہٹنے کی خاص حالات میں اجازت دی گئی ہے جب مقصود بھاگنا نہ ہو بلکہ دوبارہ حملہ کرنا ہو۔

تنبیہ:۔ صاحب بدائع نے فرمایا کہ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم میں یہ ارشاد ہے:۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا ط

ترجمہ:۔ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم سو ہو تو ہزار پر غالب آجاؤ گے۔

یہ آیت منسوخ نہیں۔ آج بھی ایسا ہو سکتا ہے'' چنانچہ پاکستان کے سابقہ

جہاد میں خصوصاً لاہور کے محاذ پر تو ایسا مشاہدہ ہوا کہ دشمن کو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی تعداد نے دشمن کی ٹڈی دل فوج کا حملہ روکا اور اس پر فتح پائی۔

اگر اس کا امکان غالب نظر آئے کہ تھوڑی تعداد کم سامان کے باوجود مسلمان غالب آسکتے ہیں تو محض تعداد کی کمی کی وجہ سے پیٹھ پھیرنا جائز نہیں ہوگا۔

مسئلہ:۔ جو عورتیں، بوڑھے یا بچے جنگ میں جاسوسی کا کام کریں یا دوسرے طریقوں سے جنگ میں حصہ لیں، ان کو حالتِ جنگ میں قتل کیا جائے گا تاکہ ان کے شر سے مسلمان محفوظ رہیں۔

لیکن اگر بچے قید ہو جائیں تو قید ہونے کے بعد ان کا قتل کرنا جائز نہیں۔ خواہ انہوں نے جنگ میں کھلے طور پر بھی حصہ لیا ہو، کیونکہ گرفتار کرنے کے بعد ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اب اگر قتل کیا جائے گا تو ان کے پچھلے عمل کی سزا میں قتل کیا جائے گا اور بچوں پر سزا جاری کرنا شرعاً جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ جہاد میں اگر کسی مسلمان کا کافر باپ سامنے آجائے تو جب تک وہ حملہ نہ کرے بیٹے کو اس پر حملہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کی ہدایت یہ ہے کہ دنیا میں کافر ماں باپ کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو، ان کی خدمت وخبر گیری کرو۔ اس لیے جہاد کے وقت بھی ابتداً ان کا قتل کرنا جائز نہیں۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے اپنے کافر باپ کے قتل کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ البتہ اگر باپ ہی بیٹے پر حملہ کر دے اور اس حملہ سے اپنی جان بچانا بغیر اس کے ممکن نہ ہو کہ باپ کو قتل کرے تو اس کو اپنی حفاظت کرنا چاہیے خواہ اس میں باپ کا قتل ہی واقع ہو جائے مگر یہ باپ کو قتل

کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ (بدائع۔ص:۱۰۲، ج:۷)

مسئلہ:۔ جہاد میں جانے کے وقت اپنے ساتھ قرآن کریم تلاوت کے لیے ایسی صورت میں لے جانا جائز ہے جبکہ مسلمانوں کی قوت مستحکم ومضبوط ہو، شہید یا قید ہونے کا خطرہ کم ہو اور جہاں یہ خطرہ قوی ہو تو قرآن کو اپنے ساتھ نہ رکھے۔ اس میں بے ادبی کا خطرہ ہے رسول کریم ﷺ نے دشمن کی زمین پر قرآن کریم لے جانے کو جو منع فرمایا ہے وہ ایسی ہی حالت سے متعلق ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ جنگی قیدی جو مسلمان کے ہاتھ آجائیں، ان کو بھوک، پیاس وغیرہ کی تکلیف دینا جائز نہیں۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ کافر قیدیوں سے اپنے مسلمان قیدیوں کا تبادلہ کر لینا جائز ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ جہاد میں جن لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے ان کا بھی مثلہ کرنا یعنی ناک، کان، وغیرہ کاٹنا شرعاً جائز نہیں۔ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

مسئلہ:۔ ضرورت پیش آجائے تو دشمن کے درختوں، کھیتوں کو کاٹ کر یا جلا کر تباہ کر دینا بھی جائز ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ دشمن قلعہ بند ہو جائے یا کسی محفوظ مکان میں داخل ہو کر دروازے بند کر لے تو اس کو ہتھیار ڈالنے اور اطاعت قبول کر لینے کی دعوت دیجائے۔ اس کو نہ مانے تو آگ لگا کر یا پانی میں غرق کر کے یا دوسرے طریقوں سے قلعہ اور مکان کو منہدم کر دینا بھی جائز ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ دشمن اگر قلعہ بند ہو جائے اور یہ معلوم ہو کہ دشمن کے ملازموں میں کچھ مسلمان بھی ہیں تو ان کی وجہ سے دشمن کے مقابلے میں کوئی رعایت نہ کی جائیگی

البتہ اگر مسلمانوں کو بچا سکتے ہیں تو بچانے کی فکر کریں، ورنہ دشمن کو تباہ کرنے کے قصد سے گولہ باری کریں، جو مسلمان اس کی زد میں بلا اختیار آ جائیں وہ معاف ہے، کیونکہ کافروں کا کوئی شہر اور بستی اس سے خالی نہیں ہوئی کہ کوئی مسلمان قیدی یا ملازم وغیرہ ان کے پاس ہوں اگر ان کی رعایت سے دشمن کا مقابلہ چھوڑ دیا جائے تو جہاد کا دروازہ ہی بند جائے۔ (بدائع صنائع۔ص:۱۰۰،ج:۷)

مسئلہ:۔ یہی صورت اس وقت بھی کی جائے گی جب دشمن اپنے آپ کو بچانے کے لئے مسلمان قیدیوں یا بچوں کو آگے کر دے۔ اس وقت بھی اگر مسلمان کو بچانے کی کوئی صورت نہ رہے تو دشمن پر حملہ کی نیت سے مقابلہ کیا جائے اور جو مسلمان اس کی زد میں آ جائیں وہ معاف ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:۔ عین حالت جنگ وقتال میں بھی ایسے کافروں کو قتل کرنا جائز نہیں، جو جنگ میں حصہ نہیں لیتے۔ مثلاً چھوٹے بچے، عورتیں، بوڑھے، اپاہج، اندھے، دیوانے، مندروں اور عبادت خانوں میں مشغول عبادت رہنے والے بشرطیکہ وہ جنگ میں حصہ نہ لیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک میدان جنگ میں کسی کافر عورت کو مقتول پایا تو بہت افسوس کا اظہار فرما کر فرمایا کہ یہ تو جنگ کرنے والی نہ تھی۔ اس کو کیوں قتل کیا گیا؟

چہل ۴۰ حدیث

فضائل جہاد

جہاد کے فضائل و مسائل سے متعلق رسول کریم ﷺ کی قولی اور فعلی روایات حدیث اس کثرت سے منقول ہوئی ہیں کہ کہ ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔ اس جگہ ان میں سے صرف چالیس حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس عدد میں ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میری چالیس حدیثیں یاد کر کے میری امت کو پہنچادے اس کا حشر قیامت کے دن علماء مقبولین کے ساتھ ہوگا۔ اس برکت کو لکھنے والا بھی حاصل کرسکتا ہے اور اس کو چھاپ کر شائع کرنے والا بھی۔

حدیث نمبر ۱

عن معاذ ابن جبل فی حدیث طویل قال قال رسول الله ﷺ رأس الامر الاسلام و عمودهُ الصلوٰة و ذروة سنامه الجهاد۔ (رواہ احمد والترمذی از مشکوٰۃ)

ترجمہ:۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث کے ذیل میں روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اصل کام اسلام ہے، اور اسلام کا عمود جس پر اس کی تعمیر قائم ہے، نماز ہے اور اس کا اعلیٰ مقام جہاد ہے۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت وقوت جہاد پر موقوف ہے جب وہ جہاد چھوڑ دیں گے، ذلیل اور کمزور ہو جائیں گے۔

حدیث نمبر ۲

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ مثل المجاھد فی سبیل اللہ کمثل الصائم القائم القانت بآیات اللہ لا یفتر من صیام ولا صلوٰۃ حتی یرجع المجاھد فی سبیل اللہ ۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے لئے جہاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مسلسل روزے رکھتا رہے اور رات بھر تہجد کی نماز اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے نہ کسی دن روزہ میں سستی کرے اور نہ کسی رات نماز میں، اور مجاہد کو یہ فضیلت اس وقت تک برابر حاصل رہے گی جب تک وہ لوٹ کر اپنے گھر نہ آ جاوے۔

حدیث نمبر ۳

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال مرّ رجل من اصحاب رسول اللہ ﷺ بشعب فیہ عیینۃ من ماءٍ عذبۃ فاعجبتہ فقال الو اعتزلت الناس فاقمت فی ھذا الشعب فذکر ذٰلک لہ رسول اللہ ﷺ فقال لا تفعل فان مقام احدکم فی سبیل اللہ افضل من صلوتہ فی بیتہ سبعین عاماً الاتحبّون ان یغفر اللہ لکم ویدخلکم الجنۃ اغزو فی سبیل اللہ من قاتل فی سبیل اللہ فواق ناقۃ وجبت لہ الجنۃ (ترمذی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی ایک پہاڑی درّہ میں ایک چشمہ پر پہنچے، چشمہ میٹھا اور صاف دیکھ کر ان کو پسند آیا اور دل میں کہا کہ یہ جگہ عبادت کے لیے بہت اچھی ہے۔ میں لوگوں سے الگ ہوکر یہیں قیام کرلوں جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس خیال کا ذکر آپ ﷺ سے کیا آنخضرت ﷺ نے فرمایا'' ایسا نہ کرو! اس لیے کہ ایک شخص کا اللہ کے راستہ جہاد میں کھڑا ہونا اپنے گھر میں رہ کر ستر سال کی نماز سے بہتر ہے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے اور تمہیں جنت میں داخل کرے؟ جاؤ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے تھوڑی دیر بھی، اسکے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے''۔

فائدہ:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کی ضرورت کے وقت خلوت میں بیٹھ کر عبادت کرنے سے جہاد میں حصہ لینا بدرجہا بہتر ہے۔

حدیث نمبر ۴

عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ والذی نفس محمد بیدہ لغدوۃ او روحۃ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیھا ولمقام احدکم فی الصف خیر من صلوٰت ستین سنۃ۔ (رواہ احمد)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے، اللہ کے راستہ (جہاد) میں ایک مرتبہ صبح یا شام کو نکلنا ساری دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بدرجہا بہتر ہے اور ایک شخص کا جہاد کی صف میں کھڑا ہونا گھر میں رہ کر ساٹھ

برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔

حدیث نمبر ۵

عن عبدالله بن عمرؓ وان رسول الله ﷺ قال قفلة كغزوة۔ (رواه ابوداؤد)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہاد سے واپسی کے سفر میں بھی وہی ثواب ملتا ہے جو جہاد کے لیے جانے کے وقت ملتا ہے۔

حدیث نمبر ۶

وعن ابی موسیٰ قال قال رسول الله ﷺ ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف فقام رجل رث الهئية فقال يا آبا موسیٰ انت سمعت رسول الله ﷺ يقول هذا قال نعم فرجع الى اصحاب به فقال اقرأ عليكم السلام ثم كسر جفن سيفه فالقاه ثم مشى بسيفه الى العدو فضرب به حتى قتل (رواه مسلم)

ترجمہ:۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں یہ سن کر ایک خستہ حال آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابوموسیٰ! آپ نے خود رسول اللہ ﷺ سے یہ ارشاد سنا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! یہ شخص فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا، اور ان کو آخری سلام کیا اور اپنی تلوار کی میان توڑ کر پھینک دی، ننگی تلوار لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑا اور مسلسل لڑتا رہا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔

حدیث نمبر ۷

وعن ابی ہریرۃؓ ان رسول اللہ ﷺ قال عرض علی اوّل ثلثة یدخلون الجنّة شهید و عضیف متعفف وعبد احسن عبادة الله ونصح لمواليه (رواه الترمذی)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ تین آدمی پیش کئے گئے (غالباً شب معراج میں) جو سب سے پہلے جنت میں جائیں گے، اوّل شہید فی سبیل اللہ۔ دوسرے وہ متقی پرہیز گار جو کوشش کر کے ہر گناہ سے بچتا ہے، تیسرے وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی خوب کی اور اپنے آقا کی خدمت وخیر خواہی میں بھی کوتاہی نہیں کی۔

حدیث نمبر ۸

عن عبدالله بن حبشی ان النبی ﷺ سئل ای الاعمال افضل قال طول القيام قيل فای الصدقة افضل قال جهد المقل قيل فای الهجرة افضل قال من هجرة ماحرم الله عليه قيل فای الجهاد افضل قال من جاهد المشركين بماله و نفسه قيل فای القتل اشرف قال من اهريق دمه وعقرجواده (رواه ابوداؤد)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ عبادت میں سب سے افضل کون سا عمل ہے ؟ فرمایا کہ (نفل نماز میں) طویل قیام۔ پھر سوال کیا گیا صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مفلس آدمی جو اپنی مزدوری میں سے خرچ کرے پھر سوال کیا گیا

کہ ہجرت کونسی افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی ہجرت افضل ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ جہاد کون سا افضل ہے تو فرمایا جس نے اپنی جان اور مال کے ساتھ مشرکین سے جہاد کیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا کون سا افضل واشرف ہے ؟ تو فرمایا کہ جس شخص کا اپنا بھی خون بہا دیا گیا اور اس کا گھوڑا بھی مار دیا گیا۔

حدیث نمبر ۹

عن کعب بن مرة رضی اللہ عنہ فی حدیث مرفوع من بلغ العدّو بسهم رفعه الله به درجة قال ابن النجّار یا رسول الله ﷺ وما الدّرجه ؟ قال أما انها لیست بعتبة امّك ولكن بین الدرجتین مائة عام (رواه النسائی)

ترجمہ:۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دشمن کو ایک تیر مارے گا اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے درجات میں ایک درجہ کا اضافہ فرمادیں گے ابن نجار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! درجہ سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ارے! درجہ کا مطلب تمہاری ماں کی دہلیز ہونے سے تو رہا، بلکہ دو درجوں کے درمیان سو سال کی مسافت ہے۔

حدیث نمبر ۱۰

وعن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ لغدوة فی سبیل الله و روحة خیر من الدنیا وما فیها ۔ (مسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک صبح کو اللہ کی راہ میں نکلنا اور ایک شام کو اللہ کی راہ میں (جہاد) میں نکلنا ساری دنیا اور اس کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے بہتر ہے۔

حدیث نمبر ۱۱

عن ابی سعید رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ بعث بعثا الی بنی لحیان من ھذیل فقال لیبعث من کل رجلین احدھما والاجر بینھما (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کا ایک لشکر قبیلہ ہذیل کی شاخ بنی لحیان کے مقابلے کے لیے بھیجا اور جہاد کے لیے نکلنے والے صحابہ کرام کو یہ حکم دیا کہ ہر دو مردوں میں سے ایک مرد جہاد کے لیے جائے ایک گھر کی ضروریات وغیرہ کے لیے یہاں رہ جائے اور اس طرح کرنے سے جہاد کا ثواب دونوں میں مشترک ہو جائے گا۔

شہری دفاع کی خدمت بھی جہاد ہی ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاد صرف محاذ جنگ پر جا کر لڑنے ہی کا نام نہیں، جو لوگ اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے گھروں کی حفاظت کے قصد سے شہر میں رہ جائیں وہ بھی مجاہدین ہیں، کیونکہ محاذ پر لڑنے والے سپاہیوں کی وہ امداد کر رہے ہیں کہ ان کے اہل وعیال اور گھر بار کی حفاظت کر کے ان کو بے فکر کر دیا ہے۔ ہمارے ملک میں شہری دفاع کی خدمت انجام دینے والے جو بھی خدمت انجام دیتے ہیں وہ بھی اللہ کے نزدیک مجاہدین کے حکم میں ہیں۔

جہاد کی نیّت

حدیث نمبر ۱۲

عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ لا يكلم احد في سبيل الله والله يعلم من يكلم في سبيل الله الاجاء يوم القيامة وجرحه يثعب وما اللون لون الدم والريح ريح المسك (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوجائے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے، تو وہ قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، وہ صورت میں تو خون ہوگا مگر اس کی خوشبو مشک جیسی ہوگی۔

فائدہ:۔ اس حدیث میں جو یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس شخص کی نیت، نام ونمود اور شہرت کی یا کسی اور دنیوی مفاد کے لیے لڑنے کی ہو اور زخمی ہوجائے، وہ اللہ کی راہ میں زخمی نہیں ہوا۔ اس کو یہ فضیلت نہیں ملے گی۔ بلکہ یہ فضیلت خاص اس شخص کا حق ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور اسلامی ملک سے دشمنان دین کی مدافعت کی نیت سے لڑتا ہے۔

حدیث نمبر ۱۳

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال

الرجل يقاتل للمغنم والرجل يقاتل للذكر والرجل يقاتل ليرى مكانه في سبيل الله قال من قاتل لتكون كلمة الله هي العلياء فهو في سبيل الله ۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ (جہاد میں لوگ مختلف نیتوں سے شریک ہوتے ہیں، ایک شخص اس نیت سے جہاد میں شریک ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے حصہ ملے گا۔ ایک شخص اس لیے جہاد کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا چرچا ہوگا اور تاریخ میں یادگار باقی رہے گی۔ ایک شخص اس لیے جہاد کرتا ہے کہ دنیا کے لوگ یہ محسوس کرلیں کہ یہ اسلام کا بڑا خدمت گزار اور جانثار ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ان میں سے صرف وہ ہے جو اس نیت سے جہاد کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اُس کے دشمن زیر ہوں۔

رباط یعنی اسلامی سرحدوں کی حفاظت

حدیث نمبر ۱۴

وعن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ رباط يوم خير من الدنيا وما عليها ۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن کا ''رباط'' یعنی اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام ساری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، ان سب سے بہتر ہے۔

حدیث نمبر ۱۵

عن فضالة بن عبيد عن رسول الله ﷺ قال كل ميت يختم على عمله الاالذى مات مرابطاً فى سبيل الله فانه ينمى له عمله الى يوم القيامة ويأمن من فتنة القبر (ترمذى ، ابوداؤد دارمى)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مرنے والے کے عمل پر مہر لگادی جاتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کے عمل میں کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی ،بجز اس شخص کے جو اللہ کی راہ میں کسی سرحد کی نگرانی کرتے ہوئے مرگیا تو اس کا عمل قیامت تک اس کے اعمال نامے میں بڑھایا جاتا رہے گا اور قبر کے سوال وجوب سے بھی آزاد رہے گا۔

حدیث نمبر ۱۶

عن سلمان الفارسى قال سمعت رسول الله ﷺ يقول رباط يوم وليلة فى سبيل الله خير من صيام شهر وقيامه وان مات اجرى مليه عمله الذى كان يعمله واجرى عليه رزقه وامن الفتان (مسلم)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن رات کو رباط یعنی اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی خدمت انجام دینا ایک مہینے کے مسلسل روزے اور ساری رات نماز تہجد سے افضل ہے اور جو شخص اس حال میں یعنی کسی اسلامی سرحد کی حفاظت کی حالت میں مرجائے تو قیامت تک اس کے تمام نیک عمل، جو وہ روزانہ کیا کرتا تھا، برابر اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے اور اس کا

رزق اللہ کی طرف سے جاری رہے گا اور قبر کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

حدیث نمبر ۱۷

عن ابن عباس قال قال رسول اللهﷺ عنیان لا تمسها النار عین بکت من خشیة الله و عین باتت تحرس فی سبیل الله ۔

ترجمہ:۔رسول کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں کہ انہیں آگ نہیں چھوئے گی، ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی ہو۔دوسری وہ آنکھ جس نے جہاد فی سبیل اللہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو۔

رینجرز پولیس کے لیے عظیم الشان بشارت

آج کل سرحدوں کی حفاظت کرنے والی پولیس جن کو رینجرز کہتے ہیں، ان میں بہت سے آدمی اس کو محض ایک نوکری سمجھ کر انجام دیتے ہیں، اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو سامنے رکھیں اور یہ خدمت اس عظیم ثواب کی نیت سے انجام دیں تو نوکری کے ساتھ یہ عظیم الشان دولت بھی ان کو حاصل ہوگی۔ان کی اپنی اور خانگی ضرورتوں کے لیے ان کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اس ثواب سے ان کو محروم نہ کرے گی۔شرط یہی ہے کہ اس خدمت کی انجام دہی میں اصل نیت ''رباط'' یعنی اسلامی سرحد کو دشمنان دین سے محفوظ رکھنے کی ہو۔

حدیث نمبر ۱۸

عن ابن عباس رفعه لا اخبر کم بخیر الناس منزلا قلنا

بلیٰ یا رسول اللہ قال رجل اخذ برأس فرسہ فی سبیل اللہ حتیٰ یعود او یقتل الا اخبرکم بالذی یلیہ قلنا نعم یا رسول اللہ قال رجل معتزل فی شعب من الشعب یقیم الصلوٰۃ ویؤتی الزکوٰۃ و یعتزل الناس شرہ اواخبرکم بشر الناس قلنا نعم یا رسول اللہ قال الذی یسئل باللہ ولا یعطی بہ (مالک ۔ ترمذی ۔ سنائی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتلاؤں کہ سب انسانوں سے زیادہ اچھا مقام اللہ کے نزدیک کس کا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ضرور بتلایئے! آپ ﷺ نے فرمایا، وہ شخص جو اپنا گھوڑا لے کر اللہ کی راہ میں کسی اسلامی سرحد کی حفاظت میں لگ گیا اور یہیں مقیم رہا یہاں تک کہ مرجائے یا قتل کردیا جائے۔ پھر فرمایا کہ میں تمہیں بتلاؤں کہ اس شخص کے قریب کس کا درجہ ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ضرور فرمایئے۔ فرمایا جو کسی پہاڑ کی گھاٹی میں جاکر مقیم ہوگیا اور نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہا لوگوں کو اپنی ایذاؤں سے بچایا۔ پھر فرمایا کہ تمہیں سب سے بدترین آدمی کا بھی پتہ دوں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ضرور! آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جو دوسروں سے اللہ کے نام پر مانگتا ہے مگر جب کوئی اس سے اللہ کے نام پر مانگے تو اسے کچھ نہیں دیتا۔

شہید فی سبیل اللہ کا مقام اور اس کے درجات

حدیث نمبر ۱۹

عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ مامن احد یدخل الجنۃ

یحب ان یرجع الی الدنیا وله ما فی الارض من شئی الا الشهید یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامة۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص جو جنت میں داخل ہو جائے اور پھر اس کو یہ کہا جائے کہ تو لوٹ کر دنیا میں چلا جا، ساری دنیا کی حکومت ودولت تجھے دے دی جائے گی تو وہ کبھی جنت سے نکل کر دوبارہ دنیا میں آنے پر راضی نہ ہوگا، بجز شہید کے جو یہ تمنا ظاہر کرے گا کہ مجھے دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ میں پھر جہاد کر کے شہید ہوں۔ اسی طرح دس مرتبہ زندہ کر کے دنیا میں بھیجا جاؤں۔ پھر شہید ہو کر آؤں۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا بڑے اعزاز واکرام کا مشاہدہ کرے گا جو کسی اور عمل کا نہیں ہے۔

حدیث نمبر ۲۰

قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو دوت ان اقتل فی سبیل الله ثم احیٰ ثم اقتل احی ثم اقتل۔ (بخاری، ومسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری تمنّا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے۔ پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کر دیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کر دیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں۔

شہید کے تین درجے

حدیث نمبر ۲۱

عن عقبه بن عبداالسلمیٰ قال قال رسول الله ﷺ القتلی ثلثه مومن جاهد بنفسهٖ وماله فی سبيل الله فاذا القی العدو قاتل حتیٰ يقتل قال النبی ﷺ فيه فذالك الشهيد الممتحن فی خيمة الله تحت عرشه لا يفضله النبيون الا بالنبوة ومومن خالط عملا صالحاً واٰخر سيئاً جاهد بنفسه وماله فی سبيل الله اذا القی العدو قاتل حتیٰ يقتل قال النّبی ﷺ مصمصه محت ذبوبه وخطاياه ان السيف محاء للخطايا وادخل الجنة من ای باب شاء و منافق جاهد بنفسه وماله فی سبيل الله اذا لقی العدو قاتل حتیٰ يقتل فذالك فی النار ان السيف لا يمحوا النفاق

(دارمی از مشکوٰۃ)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہاد میں قتل ہونے والے تین طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ شخص جوخود مومن کامل، صالح ہے۔اس کے ساتھ اس نے اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور جب دشمن سے اس کا مقابلہ ہوا تو ڈٹ کر لڑا یہاں تک کہ قتل کردیا گیا۔اس شخص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہی وہ اصل شہید اور امتحان میں کامیاب ہے جو قیامت کے دن عرشِ رحمٰن کے نیچے خیمہ میں ہوگا اور انبیاء سے اس کا مقام صرف اتنا ہی کم ہوگا جو درجہ نبوّت کا تقاضا ہے۔

دوسرا وہ شخص ہے جو مومن مسلمان تو ہے مگر عمل میں کچھ نیک کام کیے، کچھ برے کیے، پھر اس نے اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور دشمن کے مقابلے میں لڑا، یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا، اس شخص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جہاد مصمصہ (یعنی سینگ کی طرح ہے چوس کر فاسد مادہ نکالنے والا) ہے جس نے اس کے سب گناہوں کو مٹا دیا۔ اور تلوار سب خطاؤں کو مٹا دینے والی ہے، یہ شخص جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو سکے گا۔

تیسرا وہ منافق ہے جس نے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور دشمن سے لڑ کر مقتول ہو گیا۔ (مگر نیت خالص اللہ کے لیے نہیں تھی) یہ جہنم میں جائے گا، کیونکہ تلوار کفر و نفاق کو نہیں مٹا سکتی)۔

مُجاہد اپنی موت مر جائے تو بھی شہید ہے

حدیث ۲۲

عن ابی سھل بن حنیف قال قال رسول اللہ ﷺ من سأل اللہ الشھادۃ بصدق بلغہ اللہ منازل الشھادۃ وان مات علی فراشہ (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہید ہونے کی دعا مانگے تو اس کو اللہ تعالیٰ شہیدوں ہی کے مرتبے پر پہنچا دے گا، اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے۔

حدیث ۲۳

عن ابی مالک الاشعری قال سمعت رسول اللہ ﷺ

یقول من فصل فی سبیل الله فمات او قتل او وقصه فرسه او بعیره اولد غته هامة او مات علی فراشه بای حتف شاء الله فانه شهیدو ان له الجنة ۔ (ابو داؤد)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جہاد کے لیے نکلا، پھر اس کو موت آ گئی یا کسی نے قتل کر دیا، یا سواری سے گر کر مر گیا، یا کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا یا اپنے بستر پر کسی مرض میں مر گیا تو وہ بھی شہید ہے اور اس کے لیے جنت ہے۔

مال اور زبان سے بھی جہاد ہوتا ہے

حدیث نمبر ۲۴

عن انس عن النبی ﷺ قال جاهدو المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم

(رواہ ابوداؤد، النسائی والدارمی)

ترجمہ:۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مشرکین کے خلاف جہاد کرو اپنے مالوں سے، اپنی جانوں سے، اور اپنی زبانوں سے۔

مال کا جہاد تو یہ ہے کہ جہاد کے کاموں میں مال صرف کیا جائے، اور زبان کا جہاد یہ ہے کہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے کر اس پر آمادہ کریں اور جہاد کے احکام بتلائیں اور یہ بھی کہ اپنی گفتگو اور تقریر سے دشمن کو مرعوب کرے۔ ایسی نظمیں جن سے مسلمانوں میں جذبہ جہاد قوی ہو، یا ان سے دشمنوں کی تذلیل ہو وہ بھی اسی جہاد میں شامل ہیں، جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو شعرائے صحابہ میں سے ہیں، ان کی نظمیں جو مشرکین مکہ کے مقابلہ میں کہی گئی ہیں، ان کو جہاد قرار دیا گیا ہے۔

اور قلم سے لکھنا بھی زبان سے بولنے کے قائم مقام ہونے کے سبب اسی حکم میں ہے۔

جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کا ثواب عظیم

حدیث نمبر ۲۵

عن حذیم بن فاتك قال قال رسول اللهﷺ من انفق نفقةً فی سبیل الله کتبله بسبع مائة ضعف ۔

(الترمذی والنسائی)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں یعنی جہاد میں کچھ مال خرچ کرتا ہے تو سات سو گنا لکھا جاتا ہے۔یعنی ایک روپیہ خرچ کرے تو سات سو روپیہ خرچ کرنے کا ثواب ملتا ہے۔

حدیث نمبر ۲۶

وعن ابی الدرداءؓ وابی هریرةؓ وابی امامة وعبداللہ بن عمرؓ وجابرؓ بن عبداللہؓ وعمرانؓ بن حصینؓ کلهم بحدث عن الرسول الله ﷺ انه قال من ارسل نفقة فی سبیل الله واقام فی بیته فله بکل درهم سبع مائة درهم ومن غزا بنفسه فی سبیل الله وانفق فی وجهه ذٰلك فله بکل درهم سبع مائة الف درهم (ابن ماجه)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے جہاد کے لیے

کچھ مال خرچ کیا مگر خود جہاد میں نہیں گیا اس کو ایک درہم پر سات سو درہم کے برابر ثواب ملے گا اور جس نے خود جہاد بھی کیا اور اس میں اپنا مال بھی خرچ کیا تو اس کے ایک درہم کا ثواب سات لاکھ درہم کے برابر ہوگا۔

حدیث نمبر ۲۷

عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سئل النبی ﷺ ای الصدقة افضل قال اخدام عبد فی سبیل الله او اظلال فسطاط فی سبیل الله۔ (ترمذی)

ترجمہ:۔ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہاد کے لیے کوئی غلام دے دینا یا مجاہدین پر سایہ کرنے کے لیے کوئی خیمہ بطور عاریت کے دے دے۔

ہندوستان پر جہاد کی خاص اہمیت اور فضائل

حدیث نمبر ۲۸

عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال وعدنا النبی ﷺ غزوة الهند فان ادركتها انفق فيها نفسی ومالی فان قتلت كنت افضل الشهدا وان رجعت فانا ابوهريرة المحرر (نسائی)

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم سے ہندوستان کے جہاد کا وعدہ فرمایا ہے، اگر میں نے اپنی زندگی میں اس کو پالیا تو اپنا سارا زور اور اپنی جان اس میں خرچ کرونگا،

پھر اگر میں قتل کر دیا گیا تو افضل الشہداء ہو جاؤں گا اور اگر زندہ لوٹا
تو میں جہنم سے آزاد ابو ہریرہ ہوں گا۔

فائدہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہندوستان کے جہاد میں شریک ہونے والے کے لیے یہ عظیم خوشخبری دی ہے کہ جو شخص اس جہاد میں شریک ہو جائے گا وہ افضل الشہداء ہوگا اور جو زندہ واپس آ جائے گا، وہ عذاب الٰہی سے آزاد قرار دیا جائے گا۔

ہندوستان کے جہاد کی خاص فضیلت کا بیان جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں ہے اس طرح ایک دوسری حدیث حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس کا متن یہ ہے:۔

حدیث نمبر ۲۹

وعن ثوبان رفعه عصابتان من امتی اجارهما الله من النار عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم (اوسط، طبرانی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو جماعتیں میری امت میں ایسی ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنم سے نجات لکھ دی ہے، ایک وہ جماعت جو ہندوستان پر جہاد کرے گی۔ دوسری وہ جماعت جو آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے بعد ان کے ساتھ ہوگی۔

ہندوستان کے جہاد سے کونسا جہاد مراد ہے؟

ان دونوں حدیثوں میں جو فضائل غزوہ ہند کے ارشاد فرمائے گئے ہیں اس

میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان پر جہاد تو پہلی صدی ہجری سے لیکر آج تک مختلف زمانوں میں ہوتے رہے ہیں، اور سب سے پہلا سندھ کی طرف سے محمد بن قاسم کا جہاد ہے جس میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہ اور اکثر تابعین کی شرکت نقل کی جاتی ہے، تو کیا اس سے مراد صرف پہلا جہاد ہے یا جتنے جہاد ہو چکے ہیں یا آئندہ ہوں گے وہ سب اس میں شامل ہیں ؟

الفاظ حدیث میں غور کرنے سے حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ حدیث کے عام ہیں، اس کو کسی خاص جہاد کیساتھ مخصوص ومقید کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے جتنے جہاد ہندوستان میں مختلف زمانوں میں ہوتے رہے ہیں وہ بھی اور پاکستان کا حالیہ جہاد بھی اور آئندہ جو بھی جہاد ہندوستان کے کفار کے خلاف ہوگا وہ سب اس عظیم الشان بشارت میں شامل ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ترک جہاد کی وعید اور دنیا میں اُس کا وبال

حدیث نمبر ۳۰

عن ابی هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات علىٰ شعبة من النفاق

(رواه مسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نہ کبھی جہاد کیا اور نہ اپنے دل ہی میں جہاد کا ارادہ کیا وہ ایک قسم کے نفاق پر مرے گا۔

حدیث نمبر ۳۱

وعن ابی امامة عن النبی ﷺ قال من لم يغز او يجهز

غاز یا او یخلف غازیانی اهله بخیر اصابه الله بقارعة قبل یوم القیامة (رواه ابو داؤد)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے نہ کبھی جہاد کیا، نہ کسی مجاہد کو سامانِ جہاد دیا اور نہ کبھی کسی مجاہد فی سبیل اللہ کی یہ خدمت انجام دی کہ اس کے اہل وعیال کی نگرانی بلا کسی غرض دنیوی کے پوری طرح کی تو قیامت سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ اس پر عذاب نازل فرمائیں گے۔

ترکِ جہاد مصائب کو دعوت دینا ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جہاد میں کسی نہ کسی طرح حصہ ضرور لے۔ اگر محاذ پر جا کر لڑنے کی قوت وقدرت نہیں تو مجاہدین کو سامان فراہم کرنے میں حصہ لے، اور یہ بھی نہ ہو سکے تو مجاہدین کے اہل وعیال کی خدمت خالص اللہ کے لیے دنیوی اغراض سے پاک ہو کر کرے اور جو لوگ جہاد کے کسی کام میں حصہ نہ لیں وہ خدا کے عذاب اور مصائب کو دعوت دیتے ہیں۔

کچھ عجب نہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں کو جو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں حصہ لینے کا یہ موقع عطا فرمایا ہے، اگر ہم اسکی اہمیت کو محسوس کر کے آگے بھی جہاد کی تیاری کو نہ چھوڑ دیں تو ہم پر جو آفات ومصائب طوفانوں اور دوسری صورتوں سے آئے دن مسلط رہتے ہیں اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پورے پاکستان کو ان سے نجات عطا فرمائیں۔

حدیث نمبر ۳۲

وعن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من لقی الله

بغیر اثر من جهاد لقی الله وفیه ثلمة

(رواہ الترمذی، وابن ماجہ)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قیامت کے روز اللہ کے سامنے اسطرح حاضر ہوگا کہ اسکے بدن پر کوئی نشان جہاد کا نہ ہوتو وہ ایک عیب کے ساتھ اللہ سے ملے گا۔

جہاد کے لیے اسلحہ اور جنگی سامان بنانا اور مہیا کرنا بھی جہاد ہے

حدیث نمبر ۳۳

عن عقبة بن عامر رضی الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ وهو علی المنبر یقول واعدوا لهم ما استطعتم من قوة الا ان القوة الر می الا ان القوة الرمی الا ان القوة الرمی۔

(رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو برسر منبر یہ فرماتے ہوئے پایا کہ قرآن کریم کی آیت میں جو مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلے کے لیے قوت بہم پہنچانے کا حکم ہے، یہ قوت تیر اندازی ہے، یہ بات آپ نے تین مرتبہ مکرر کر کے فرمایا۔

فائدہ:۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں چونکہ جنگ ہی تیر اور تلوار کی تھی اس لیے تیر اندازی اور نشانہ کی مشق واستعداد ہی کو قوت فرمایا، مگر اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جب جنگ توپوں اور بموں کی ہوتو ان کے استعمال کے طریقے ہی جنگی قوت قرار دیئے جائیں گے اور حکم قرآنی کی تعمیل انہی طاقتوں کی فراہمی سے ہوگی۔

حدیث نمبر ۳۴

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول اللهﷺ من احتبس فرساً فی سبیل الله ایمانا بالله و تصدیقا بوعده فان شبعه وریه وروثه وبوليه فی المیزان یوم القیامة۔

(رواه البخاری)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں کوئی گھوڑا جہاد کے لئے وقف کر دیا اللہ پر ایمان اور اس سے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے، تو اس گھوڑے کا کھانا پینا، لید اور پیشاب کرنا سب کا ثواب قیامت کے دن اس کے میزان عمل میں رکھا جائے گا۔

حدیث نمبر ۳۵

عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ان الله یدخل بالسهم الواحد ثلث نفر فی الجنة صانعه یحتسب فی صنعة الخیر والرامی به ومنبله فارموا وارکبوا وان ترموا احب الی من ان ترکبوا

(ترمذی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کی خاطر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ اول اس کا بہ نیت ثواب وجہاد بنانے والا، دوسرا اس کو جہاد میں استعمال کرنے والا، تیسرا اس کی نوک اور بھال کو درست کرنے والا۔ اس لیے تیر اندازی کیا کرو، اور گھوڑے کی سواری کی مشق کرو، اور میرے نزدیک تیر

اندازی کی مشق گھوڑے کی سواری کی مشق سے زیادہ بہتر ہے۔

کسی غازی کو جہاد کے لیے سامان دینا یا اس کے گھر کی خبر گیری کرنا بھی جہاد ہے

حدیث نمبر ۳۶

عن عبداللہ بن عمرؓ وقال رسول اللہ ﷺ للغازی اجرہ وللجاعل اجرہ واجر الغازی۔ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غازی کو تو اس کے غزوہ اور جہاد کا ثواب ملتا ہے اور جس شخص نے اس کو مال دیکر جہاد کے لیے بھیجا ہے اس کو اپنے مال کا ثواب بھی ملے گا اور اس غازی کے عمل کا بھی۔

دفاعی فنڈ میں چندہ کا ثواب عظیم

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کرنے والے فوجیوں کی تنخواہ یا دوسرے سامان کے لیے مال خرچ کرنے والے بھی ان مجاہدین کے جہاد کا ثواب پاویں گے۔

حدیث نمبر ۳۷

وعن زید بن خالدؓ ان رسول اللہ ﷺ قال من جھز غازیا فی سبیل اللہ فقد غزی ومن خلف غازیا فی اھلہ فقد غزی۔ (بخاری، ومسلم)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی غازی کو

جہاد کا سامان دے دیا، اس نے بھی جہاد کیا اور جو شخص کسی غازی کے گھر والوں کی نگرانی اور خبر گیری میں لگا رہا اس نے بھی جہاد کر لیا

جہاد سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے مگر قرض اور امانت میں خیانت معاف نہیں ہوتی

حدیث نمبر ۳۸

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ القتل فی سبیل اللہ یکفر الذنوب کلھا الا الا مانة والامانة فی الصلوٰة والصوم والامانة فی الحدیث واشد ذٰلک الوداع (کبیر طبرانی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا سب گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے مگر امانت میں خیانت معاف نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ صرف مال ہی میں نہیں بلکہ نماز، روزے اور کلام میں بھی ہے۔ البتہ ان سب میں زیادہ سخت وہ امانت اموال ہے جو کسی کے سپرد کی گئی ہو۔

حدیث نمبر ۳۹

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بن العاص النبی ﷺ قال القتل فی سبیل اللہ یکفر کل شئی الا الدین۔

ترجمہ:۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر جو کسی کا قرض اس کے ذمہ ہے وہ معاف نہیں ہوتا (اس کو یا خود ادا کرے، یا وصیت ادا کرنے کی کسی معتمد کو کر دے)

بحری فوج کے لیے عظیم سعادت

حدیث نمبر ۴۰

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ من حرس ليلة على ساحل البحر كان افضل من عبادة فى اهله الف سنة (رواه الموصلى بلين)

ترجمہ:۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک رات سمندر کے کنارے پر پہرہ دے تو اس کا یہ عمل اپنے گھر میں ایک ہزار سال کی عبادت سے افضل ہے۔

جہاد کی دُعائیں

زمانہ جنگ کی

چند مختصر دعائیں لکھی جاتی ہیں جن کا زبانی یاد کر لینا بھی مشکل نہیں۔ یہ سب دعائیں رسول اللہ ﷺ کی تعلیم فرمائی ہوئی ہیں۔ اور دین و دنیا کی فلاح کے لیے بہترین اور مجرب نسخہ ہیں۔

دشمن کے بالمقابل موثر ترین ہتھیار

ایک موقع پر کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے سچے انسان سید الرسل محمد ﷺ نے فرمایا:

الا ادلكم ما ينجيكم من عدوكم ويدر كم ارزاقكم تدعون الله فى ليلكم ونهاركم فان الدعاء سلاح

المومن ۔ (الحاکم فی المستدرک وابویعلی)۔

ترجمہ:۔ کیا میں تمہیں ایسے راز سے آگاہ نہ کروں جو تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دلائے اور تمہاری معیشت میں اضافہ کا سبب ہو؟ وہ راز یہ ہے کہ تم رات دن اللہ سے دعا کرو۔ دعا مومن کا اسلحہ ہے۔

یہ اسلحہ ہر گھر میں، ہر فرد، بغیر کسی مادّی ذرائع کے ہر وقت تیار کر سکتا ہے اور اس اسلحہ کی اثر انگیزی کی شہادت خدا کے رسول ﷺ اپنے ارشاد گرامی سے بھی دے رہے ہیں اور آپ نے ہر شدید ترین مرحلہ پر اس ہتھیار سے کام لیا ہے اور خدائے ذوالجلال نے اس ہتھیار سے آپ کی امت کے لاکھوں سپہ سالاروں اور کروڑوں فوجیوں کو کامیابی بھی عطا فرمائی ہے۔

اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:۔

الدعاء اسلاح المومن وعمادالدین و نورالسموات والارض۔ (مستدرک)

ترجمہ:۔ دعا مومن کا اسلحہ ہے، دین کا ستون ہے اور آسمان وزمین کا نور ہے۔

اور تاریخ شاہد ہے کہ اہل ایمان نے جب بھی دین کے اس ستون کا سہارا لیا اور جب دعا کی شمع جلا کر یہ میدان جنگ میں کودے ہیں، آسمان وزمین کی ساری قوتیں ان کی حمایت میں کفّار سے لڑنے لگیں اور بالآخر انہیں کامیابی وفتح حاصل ہوئی۔

یقین بھرے دل سے دعائیں کرو

سید الانبیاء ﷺ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے اس کیفیت میں باتیں کرو کہ کہ تم

ان کی قبولیت پر یقین رکھتے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ لا پرواہ، متوجہ نہ ہونے والے اور دعا کی قبولیت پر یقین نہ رکھنے والے دل کی دعا کو قبول نہیں فرماتے۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

ضعف قلب اور بزدلی کا علاج

۱۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْیَاوَعَذَابِ الْقَبْرِ۔

ترجمہ:۔ میرے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں بزدلی اور بخل سے اور میں پناہ طلب کرتا ہوں ناکارہ عمر سے اور دنیا کے فتنوں اور آزمائشوں سے اور پناہ مانگتا ہوں عذاب قبر سے۔

۲۔ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

ترجمہ:۔ کافی ہے مجھے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی ہے عرش عظیم کا رب۔

۳۔ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ۔

ترجمہ:۔ کافی ہے مجھے اللہ بہت اچھا وکیل، بہت بہتر سرپرست اور سب سے بہتر مددگار۔

٤۔ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ۔

ترجمہ:۔ اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اے سدا قائم و دائم۔ میں تیری رحمت کے سہارے تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔

۵۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

ترجمہ:۔ حالات کو بدلنے کی اور ہر قسم کی قوت صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو بہت ہی بلند شان اور عظمتوں کا مالک ہے۔

۶۔ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا رَادَّ لِمَا قَضَيْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔

ترجمہ:۔ اے اللہ! جسے آپ کچھ عطا فرمانا چاہیں اسے کوئی محروم نہیں سکتا، جسے آپ محروم کر دیں اسے دینے والا کوئی نہیں جس بات کا آپ فیصلہ صادر کر دیں اُسے ردّ کرنے کی قوت کسی میں نہیں اور کوئی بڑی سے بڑی عظمت و دولت والا ایسا نہیں جسے یہ دولت و عظمت آپ کے عذاب سے محفوظ رکھ سکے۔

جب اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کریں

اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَاَصْلِحْ شَانِيْ كُلَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔

ترجمہ:۔ میرے اللہ! میں آپ ہی کی رحمت کا امیدوار ہوں۔ آپ مجھے ایک لمحہ کے لیے میرے نفس کے سپرد نہ کیجو اور میرے احوال وظروف کی اصلاح فرمائیو۔ آپ تنہا رب و معبود ہیں۔

خدا کی پناہ کا قلعہ

حضرت عبداللہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم ایک عمرہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ باد و باراں کا طوفان شروع ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے راستہ سے ہٹ کر ایک ٹیلے کے نیچے قیام فرمایا اور رات بھر نماز میں مشغول رہے۔ صبح کو عبداللہ

اسلمی رضی اللہ عنہ آپ کے قریب پہنچے تو آپ نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر قل ھو اللہ احد ، قل اعوذ برب الفلق،قل اعوذ برب الناس پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ جو شخص ان سورتوں کو پڑھ کر اللہ کی پناہ لے گا اس کو کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے ۔(رواہ البزازو رجالہ رجال الصحیح از مجمع الزوائد)

سورۂ اخلاص

قُلْ هُوَاللهُ اَحَدٌ اللهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ.

ترجمہ:۔کہو اللہ تنہا ہے، وہ بے نیاز ہے، نہ اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مثیل ہے ۔وہ بے مثال اور اکیلا ہے۔

سورۂ فلق

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَاحَسَدَ۔

ترجمہ:۔کہو میں پناہ طلب کرتا ہوں، اس ربّ کی جو پو پھٹنے کا ربّ ہے(کھجور کی گٹھلی اور گندم کے دانے ،ایٹم کے پھٹنے کا رب یعنی کائنات کی ہر چھوٹی اور بڑی قوت حتیٰ کہ ایٹم بم بھی اس کے قبضہ و تصرف میں ہے اسی کے اِذن سے وہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔اگر اذِن نہ ہو تو وہ محض بیکار اور قطعی بے ضرر ہو سکتا ہے)ہر اس چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی رات کی تاریکی میں آنے والے

(حوادث، ہوائی حملوں اور دشمن کے مکر وفریب سے جب کہ رات پوری طرح چھا جائے۔ ان کے شر سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو بندھی ہوئی اشیاء اور دھاگے کی گرہوں سے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کر رہا ہوں۔

سورۃ النّاس

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔

ترجمہ:۔ کہیے، میں پناہ طلب کرتا ہوں سارے انسانوں کے ربّ کی جو سب کا معبود و حاکم بھی ہے (کوئی بھی خواہ کتنا بڑا سرکش، زور آور اور کافر ہی کیوں نہ ہو اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں) ان سب کے شر سے جو وسوسہ اندازی کرنے والے ہیں جو دلوں میں توہمات اور وساوس پیدا کرتے ہیں (کہ تم شکست کھاؤ گے اور تمہارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا) یہ شر انگیز) انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں میں سے بھی''

جب خطرات منڈلا رہے ہوں

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ۔

ترجمہ:۔اے اللہ! میں پناہ طلب کرتا ہوں آپ کی نعمت کے زوال سے اور آپ کی عطا فرمودہ عافیت کے (مصیبت سے) بدل جانے سے، اور آپ کے ناگہانی عتاب سے اور ہر قسم کی ناراضگی سے۔

جب دشمن کی قوت سے گھبراہٹ ہو

غزوہ خندق کے دن صحابہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اب تو دل منہ کو آنے لگے (سخت گھبراہٹ طاری ہے) کوئی دعا اس وقت کے لیے بھی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! یہ دعا مانگو:۔

اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَعَاتِنَا۔

ترجمہ:۔ اے اللہ! ہمارے کمزور پہلوؤں پر پردہ ڈالیے اور خطرات سے محفوظ رکھئے۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ایسی ہوا بھیجی جس نے کفّار کا منہ موڑ دیا۔

میدانِ جنگ میں مُجاہدین کی دعائیں

اسلام دین کامل ہے اور اس کے کمال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں انسان کی توجہ اس کے خدا کی جانب مبذول کرتا ہے۔ ان ہی مراحل میں سے ایک مرحلہ میدانِ جنگ میں کودنے کا بھی ہے۔ چونکہ مسلمان کی جنگ خدا کے لئے ہوتی ہے، اس لیے یہ جنگ بہت بڑا ذریعہ ہے قلب مومن کے خدا کی جانب متوجہ ہونے کا۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو تلقین فرمائی ہے کہ:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! جب تم دشمن کے بالمقابل میدان میں آؤ تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔

عین معرکہ قتال میں اللہ کو بکثرت یاد کرنا کامیابی کا ضامن ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ اس امّت نے ہر معرکہ قتال میں کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اوّلین اور فیصلہ کن معرکہ بدر سے اب تک مسلمانوں نے جتنے مواقع جہاد میں کامیابی حاصل کی ہے، وہ شجاعت، ایثار، فدویت اور راہِ حق میں قربان ہونے کے حیرت انگیز جذبہ کی معجزہ نمائیوں کی مرہونِ منّت تو کسی نہ کسی درجہ میں ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ دخل اس کامیابی میں اس حقیقت کو ہے کہ مسلمانوں نے عین معرکہ قتال میں خدائے قدوس کو اس کثرت سے یاد کیا کہ خدا تعالیٰ کی رحمت انکی جانب منعطف ہوئی اور انہیں تعداد کی قلّت اور اسلحہ کی کمی کے باوجود ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا کیا گیا۔

مجاہدین کے مصروفِ جہاد و قتال ہونے کے ارادہ سے لے کر فتح و کامرانی تک ہر لمحہ کے لئے حضور اکرم ﷺ سے دعائیں منقول ہیں۔ یہ دعائیں مجاہدینِ کرام کی رہنمائی کے لیے درج ذیل ہیں:۔

شرِ دشمن سے حفاظت کے لیے

۱ ......اعوُذ بوُجهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِى لَيْسَ شَىٌ اَعْظَمَ مِنْهَ وَ بَكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِىْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بِرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ وَّ بِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمُ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرأً وَبَرَأً۔

ترجمہ:۔ میں عظمتوں کے مالک اللہ کی ذات اقدس سے پناہ طلب کرتا ہوں جس سے کوئی بھی چیز بڑی نہیں اور اللہ کے کامل ترین کلمات کی پناہ چاہتا ہوں جن سے کوئی بھی نیک و بد متجاوز نہیں

ہو سکتا اور میں اللہ کے اسماء حسنیٰ کے توسط سے پناہ مانگتا ہوں ان تمام فتنوں، حوادث اور مصیبتوں سے جو میرے علم میں ہیں اور جو میں نہیں جانتا ہوں، ان تمام قوتوں کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول خدا ﷺ نے جہاد کرنے والی جماعت میں بھیجا اور حکم دیا کہ ہم حسبِ ذیل آیات پڑھا کریں ہم یہ آیات پڑھتے رہے دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ بھی رہے اور ہمیں مالِ غنیمت بھی ملا۔ آیات یہ ہیں:۔

۲...... اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرجَعُوْنَ فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلاَّ هُوَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَابُرْهَانَ لَهُ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْوَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ۔

ترجمہ:۔ کیا تم اس خیال میں مگن ہو کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا؟ اور یہ کہ تم ہماری جانب نہیں لوٹائے جاؤ گے۔ تو (واضح رہے) اللہ کی شان سب سے بلند ہے وہ (تمام کائنات) کا برحق بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں اور نہ کوئی جس سے مشکلات کے وقت پناہ طلب کی جائے وہی عرش عظیم کا رب ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے جس کے معبود ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں تو اس کا حساب اس کے رب

کے ہاں ہوگا اور سچ یہ ہے کہ کافر کبھی فلاح نہیں پائیں گے اور تم کہو کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے اور رحم فرما آپ سب سے بہتر رحم فرمانے والے ہیں۔ (اخرجہ ابن السنی وابونعیم وابن مندہ)۔

میدان جنگ میں قدم رکھنے پر

جب خدا کی راہ میں قدم رکھنے والا میدان جنگ میں قدم رکھے تو خشوع سے اپنے رب سے عرض کرے :۔

۱ ...... اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابَ سَرِيْعَ الْحِسَابِ اَللّٰهُمَّ اهْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ۔

ترجمہ:۔اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے! جلد حساب لینے والے! اے اللہ (دشمن کے) لشکر کو شکست فاش کردے۔ اے الہ حق! انہیں شکست دے اور ان کے قدم اکھاڑ دے۔

۲ ...... اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِىْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ۔

ترجمہ:۔اے اللہ! ہم آپ کو دشمنوں کے بالمقابل لاتے ہیں اور انکے شر و فساد سے آپ کی پناہ مانگتے ہیں۔

قنوت نازلہ

احادیث صحیحہ میں ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی شدید حادثہ پیش آتا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور دشمنوں پر فتح کے لئے دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ شرح منیہ میں ہے کہ یہ قنوت نازلہ اب بھی مسنون ہے، درمختار و شامی میں ہے۔ ''قنوت نازلہ'' ہر مصیبت عامہ اور جنگ و جہاد کے لئے اب بھی مستحب ہے۔ مسلمان ایسے مواقع پر دعائے قنوت پڑھا کریں، صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد امام بآواز بلند یہ دعا پڑھے، اور مقتدی آمین (۱) کہتے رہیں۔ اس دعا کے لئے نہ تکبیر کہی جائے، نہ ہاتھ اٹھائے جائیں، دعا کے بعد تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ سجدے میں جائیں۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَ عَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَ تَوَلَّنَا فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَ بَارِكْ لَنَا فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَ قِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَ لَايُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَايَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ وَ لَايَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَ تَعَالَيْتَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ وَ اَصْلِحْهُمْ وَ اَصْلِحْ

---

(۱) مقتدی آمین جہراً کہیں یا سرّاً، اس کی کوئی تصریح فقہاء کے کلام میں نہیں ملی، البتہ کبیری شرح منیہ قنوت وتر کے بارے میں لکھا ہے کہ وان قنت المقتدی اوامن لا یرفع صوتہ بالاتفاق لئلا یشوش غیرہ ولان الاصل فی الدعاء الاخفاء ص: ۴۰۳ اس سے رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ

ذَاتَ بَیْنِھِمْ وَ اَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَ اجْعَلْ فِی قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ ثَبِّتْھُمْ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِکَ وَ اَوْزِعْھُمْ اَنْ یَّشْکُرُوا نِعْمَتَکَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ وَ اَنْ یُّوْفُوا بِعَھْدِکَ الَّذِی عَاھَدْتَّھُمْ عَلَیْہِ وَ انْصُرْھُمْ عَلٰی عَدُوِّکَ وَ عَدُوِّھِمْ اِلٰہَ الْحَقِّ سُبْحَانَکَ لَا اِلٰہَ غَیْرُکَ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ عَسَاکِرَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْعَنِ الْکَفَرَۃَ وَ الْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ رُسُلَکَ وَ یُقَاتِلُوْنَ اَوْلِیَائَکَ اَللّٰھُمَّ خَالِفْ بَیْنَ کَلِمَتِھِمْ وَ فَرِّقْ جَمْعَھُمْ وَ شَتِّتْ شَمْلَھُمْ وَ زَلْزِلْ اَقْدَامَھُمْ وَ اَلْقِ فِی قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ وَ خُذْھُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ وَ اَنْزِلْ بِھِمْ بَأْسَکَ الَّذِی لَا تَرُدُّہٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ۔

یا اللہ! راہ دکھا ہم کو ان لوگوں میں جن کو تو نے راہ دکھائی، اور عافیت دے ہم کو ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت بخشی اور کارسازی کر ہماری ان لوگوں میں جن کے آپ کارساز ہیں اور برکت دے اس چیز میں جو آپ نے ہم کو عطا فرمائی اور بچا ہم کو اس چیز کے شر سے جس کو آپ نے مقدر فرمایا کیونکہ فیصلہ کرنے والے آپ ہی ہیں آپ کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بے شک آپ کا دشمن عزت نہیں پا سکتا اور آپ کا دوست ذلیل نہیں ہو سکتا، برکت والے ہیں آپ اے ہمارے پروردگار اور بلند و بالا ہیں

یا اللہ! مغفرت فرما مومن مردوں اور عورتوں کی اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کے گناہ معاف فرما اور ان کے حالات کی اصلاح فرما اور ان کے باہمی تعلقات کو درست فرما دے اور ان کے دلوں میں الفت باہمی اور محبت پیدا کر دے اور ان کے دلوں میں ایمان وحکمت کو قائم فرما دے اور ان کو اپنے رسول کے دین پر ثابت قدم فرما اور توفیق دے انہیں کہ شکر کریں تیری اس نعمت کا جو تو نے انہیں دی ہے اور یہ کہ وہ پورا کریں تیرا وہ عہد جو تو نے ان سے لیا ہے اور غلبہ عطا کر ان کو اپنے دشمن پر اور ان کے دشمن پر اے معبود برحق! تیری ذات پاک ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں یا اللہ! مسلم افواج کی مدد فرما اور کفار ومشرکین پر اپنی لعنت فرما جو آپ کے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں، اور آپ کے دوستوں سے مقاتلہ کرتے ہیں، یا اللہ! ان کے آپس میں اختلاف ڈال دے اور ان کی جماعت کو متفرق کر دے اور ان کی طاقت کو پارہ پارہ کر دے اور ان کے قدم اکھاڑ دے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دے اور ان کو ایسے عذاب میں پکڑ لے جس میں قوت وقدرت والا پکڑا کرتا ہے اور ان پر وہ عذاب نازل فرما جس کو آپ مجرم قوموں سے اٹھایا نہیں کرتے۔

بندہ محمد شفیع

خادم دار العلوم کراچی

۶ شوال ۱۳۹۱ھ

عملی جہاد

افادات

مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

مرتب

جناب محمد راشد صاحب

مسلمانوں کی تباہی کا سبب

قرآن مجید وسنت کی نصوص نیز پوری تاریخ اسلام کا تجربہ شاہد ہے کہ جب بھی مسلمان جہاد چھوڑ دیتے ہیں تو دوسری قومیں ان پر غالب آ جاتی ہیں۔ ان کے دل ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کی (مسلمانوں) کی آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ وہ جذبہ شجاعت وحمیت جو کفار کے مقابلہ میں صرف ہونا چاہئے تھا۔ وہ آپس میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اور یہی ان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ (جہاد، ص:۶)

جہاد وغزوات کی حکمت

کسی قابل ناحق کو قصاصاً قتل کرنا یا کسی چور کو سزا دینا یا کسی بدمعاش کو مار پیٹ کرنا ڈاکوؤں کے منظّم گروہ سے جنگ کر کے ان کو جرم سے روکنا یا ختم کرنا اگر چہ بظاہر کچھ انسانوں کو تکلیف میں ڈالنا یا ضائع کر دینا ہے۔ مگر یہ کسی سمجھدار انسان کے نزدیک عام دنیا کے امن وسلامتی کے منافی نہیں بلکہ عام انسانوں کے امن وسلامتی اور سلامت اطمینان کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر چند جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دے کر تکلیف میں نہ ڈالا جائے تو پوری انسانیت کا امن وسکون برباد ہو جاتا ہے۔ اور پوری دینا بدامنی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ کے جہاد وغزوات اور آپ کے قائم کردہ حدود وتعزیرات سب اسی حقیقت پر مبنی ہیں۔ جو اصلاح حال کی ساری تدبیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد آخری علاج کے طور پر عمل میں لائی گئی ہے۔

وہ ڈاکٹر اپنے فن کا ماہر نہیں ہو سکتا جو صرف مرہم لگانا جانتا ہے۔ مگر سڑے ہوئے فاسد شدہ اعضاء کا آپریشن کرنا نہیں جانتا۔

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

سمجھو اور خوب سمجھو کہ جب عالم کے جسم میں شرک کے زہریلے جراثیم پیدا ہو گئے اور وہ ایک مریض جسم کی طرح ہو گیا تو رحمت خداوندی نے اس کے لئے ایک مصلح اور مشفق طبیب (آنحضرت ﷺ) کو بھیجا جس نے ترپن سال تک متواتر اس کے ہر عضو اور ہر رگ وریشہ کی اصلاح کی فکر کی۔ جس سے قابل اصلاح اعضاء تندرست ہو گئے۔ مگر بعض اعضاء جو بالکل سڑ چکے تھے کہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی بلکہ خطرہ ہو گیا کہ ان کی سمیت تمام بدن میں سرایت کر جائے۔ اس لئے حکیمانہ اصول کے موافق عین رحمت وحکمت کا مقتضا یہی تھا کہ آپریشن کر کے ان اعضاء کو کاٹ دیا جائے۔ یہی جہاد کی حقیقت ہے۔ اور یہی تمام جارحانہ (یعنی اقدامی) اور مدافعانہ غزوات کا مقصد ہے۔

کچھ متعصب کہنے لگے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ اور یہ ایسا جھوٹ ہے کہ شاید اس آسمان کے سائے میں ایسا بڑا جھوٹ کوئی نہ بولا گیا ہو۔ یہ بھی تو سوچئے کہ تلوار تو جبھی چلی ہوگی۔ جب تلوار چلانے والوں کا کوئی جتھہ کوئی قوت پیدا ہوئی ہوگی۔ تو کوئی پوچھے کہ ان تلوار چلانے والوں کو کس تلوار نے اسلام کا ایسا فدائی بنا دیا تھا کہ سر پر کفن باندھ کر ہر میدان میں سر بکف کھڑے نظر آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفید جھوٹ کی تردید کرنا بھی سچ کی توہین ہے۔ (رسول اکرم ص: ۲۲)

حکم جہاد

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار کے مظالم کا یہ حال تھا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی مسلمان ان کے دست ستم سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو۔ قیام مکہ کے آخر دور میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہوچکی تھی وہ کفار کے ظلم و جبر کی شکایت اور ان کے مقابلے میں قتل وقتال کی اجازت مانگتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ جواب میں فرماتے کہ صبر کرو۔ مجھے ابھی تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ سلسلہ دس سال تک اسی طرح جاری رہا۔

جس وقت رسول کریم ﷺ وطن مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کردیئے گئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ کے رفیق تھے تو مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت آپ کی زبان سے نکلا۔ اخرجوا نبیھم لیھلکن یعنی ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا اب ان کی ہلاکت کا وقت آ گیا ہے۔ اس پر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد یہ آیت ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾ (۳۹:۲۲) نازل ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کو کفار سے قتال کی اجازت دے دی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کفار کے معاملہ میں نازل ہوئی جبکہ اس سے پہلے ستر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ (معارف القرآن۔ ج:٦، ص:۲۷۰)

اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا۔ اس وقت کی تمام آیات قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگذر کی ہی تلقین تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا الخ

(۲:۱۹۰) میں قتال کفار کا حکم آیا۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ قتال کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے:۔ ﴿ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ﴾ مگر اکثر حضرات صحابہ اور تابعین کے نزدیک پہلی آیت سورۂ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہے۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی کہی جا سکتی ہے۔ (معارف القرآن۔ ج:۱،ص:۴۶۹)

مکہ معظمہ میں جہاد وقتال کے احکام نہیں تھے۔ یہ سب سے پہلی آیت ہے:۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ ﴾ جو مکہ مکرمہ میں ہی قتال کے متعلق نازل ہوئی۔ اور اس کا عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا اس کے بعد دوسری آیت {اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ﴾ نازل ہوئی۔

حکم جہاد کی شرعی حیثیت

﴿ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ ﴾ یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیاتِ قرآنی اور رسول کریم ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرض عین کے طور پر ہر مسلم پر عائد نہیں۔ بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے تو باقی مسلمان سبکدوش سمجھے جائیں گے۔ ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضۂ جہاد ادا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گناہ گار ہو جائیں گے۔ حدیث میں رسول کریم ﷺ کے ارشاد اَلْجِھَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی رہے۔

نیز صحیح بخاری ومسلم کی حدیث ہے کہ ''ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے جہاد

میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر جاؤ ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو"۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں۔ ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر نفیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے سورہ توبہ میں ارشاد فرمایا:۔

يَـاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ

اے مسلمانوں! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو۔

اس آیت میں اسی تفسیر عام کا حکم مذکور ہے اسی طرح خدانخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں۔ اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت پر پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو۔ تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے جمہور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴،ص:۵۱۸)

جب امیر المومنین کی طرف سے جہاد کی دعوت مسلمانوں کو دے دی جائے۔

اور اسلامی شعائر کی حفاظت اس پر موقوف ہو کیونکہ اس وقت ترک جہاد کا وبال صرف تارکین جہاد پر نہیں بلکہ پورے مسلمانوں پر پڑتا ہے۔ کفار کے غلبہ کے سبب عورتیں، بچے بوڑھے اور بہت سے بے گناہ مسلمان قتل و غارت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے جان و مال خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۴،ص:۲۱۳)

جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہوگا۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں رسول کریم ﷺ کی چار نمازیں قضا ہو جانے کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴،ص:۳۳۵)

مقصدِ جہاد

مؤمن کی جدوجہد کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج ہو اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے۔ اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا۔ دنیا کے امن کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے۔ لہٰذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے یہی مقصد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو۔

آیت:۔ ﴿ وَاِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ﴾ ۔(۹:۱۲) میں مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی قوم سے اپنا غصہ اتارنے کے لئے نہ لڑیں بلکہ ان کی اصلاح و ہدایت کو مقصد بنائیں اس آیت میں یہ بتلایا کہ جب وہ اپنی نیت کو اللہ کے لئے صاف کرلیں اور محض اللہ کیلئے لڑیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسی صورتیں بھی پیدا فرما دیں گے کہ ان کے غم و غصہ کا انتقام بھی خود بخود

ختم ہو جائے۔ (معارف القرآن، ج: ۴، ص: ۲۲۵)

چنانچہ ہر مسلمان جہاد میں جتنی عملی شرکت یا مالی معاونت کرسکتا ہو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

مدت جہاد

وَقَاتِلُوْ هُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنَ کُلُّهُ لِلّٰهِ

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اسلئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔ (جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔ **الجهاد ماض الی یوم القیامة**۔

(معارف القرآن، ج: ۴، ص: ۲۳۳)

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ (۹: ۲۹)......الخ

میں ان لوگوں سے جہاد و قتال کرتے رہنے کی ایک حد اور انتہاء بھی بتلائی ہے یعنی یہ حکم قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ ماتحت ہو کر رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کرلیں۔ (معارف القرآن، ج: ۴، ص: ۳۶۰)

جزیہ کی حقیقت اور رفع اشکال

اصطلاح شرع میں جزیہ سے مراد وہ رقم ہے جو کفر کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔ کفر و شرک اللہ اور رسول کی بغاوت ہے۔ اس کی اصل سزا قتل ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی

رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اور اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جان و مال آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی۔ ان کی مذہبی رسومات میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ اسی رقم کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

جزیہ کفار سے سزائے قتل رفع کرنے کا معاوضہ ہے۔ اسلام کا بدلہ نہیں۔ اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام سے اعراض اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیسے دے دی گئی۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، اپاہج، معذور۔ اگر جزیہ اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

(معارف القرآن، ج:۴،ص:۳۶۵)

طریق غلبہ اور جہاد کی تیاری

غلبہ اور بلندی حاصل کے لئے صرف ایک ہی چیز اصل ہے یعنی ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا۔ ایمان کے تقاضے میں وہ تیاریاں بھی داخل ہیں جو جنگ کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ یعنی اپنی فوجی قوت کا استحکام سامان جنگ کی بہم رسانی اور ظاہری اسباب سے بقدر وسعت آراستہ و مسلح ہونا غزوہ احد کے واقعات اوّل سے آخر تک ان تمام امور کے شاہد ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۱۹۴)

قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ......الی آخر (۸:۶۰)

یعنی سامان جنگ کی تیاری کرو کفار کیلئے جس قدر تم سے ہوسکے اس

میں سامان جنگ کی تیاری کیساتھ "مَّا اسْتَطَعْتُمْ" کی قید لگا کر یہ ارشاد فرمادیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا بھی سامان ہے تم بھی اتنا ہی حاصل کرلو بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہوسکے وہ جمع کرلو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد تمہارے ساتھ ہوگی۔

صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے سامان جنگ فراہم کرنے اور اس کے استعمال کی مشق کو بڑی عبادت اور موجب ثواب قرار دیا ہے۔

"مِنْ قُوَّةٍ" عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ یہ قوت ہر زمانہ اور ملک وقوم کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے۔ اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدر استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک، لڑاکا طیارے، آبدوز، اور کشتیاں جمع کرنا چاہئے، کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں اور اس کے لئے جس علم وفن کی سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کا اور کفار کے مقابلہ کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۲۷۲)

سامانِ جنگ اکٹھا کرنے کی مصلحت

آیت مذکور ﴿ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ﴾ میں سامان جنگ کی تیاری کا حکم دینے کے بعد اس سامان کے جمع کرنے کی مصلحت اور اصل مقصد بھی ان الفاظ میں بیان فرمایا یعنی سامان جنگ ودفاع جمع کرنے کا اصل مقصد قتل وقتال نہیں بلکہ کفر وشرک کو زیر کرنا اور مرعوب ومغلوب کردینا ہے۔ وہ کبھی صرف زبان یا قلم سے بھی ہوسکتا ہے اور بعض اوقات اس کے لئے قتل وقتال ضروری ہوتا ہے۔ جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق دفاع کرنا فرض ہے۔ (ص:۲۷۳، ج:۴)

سامانِ جنگ کے ساتھ نظر اللہ تعالیٰ پر ہو

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ......الخ

اس آیت کے پہلے حصہ میں جہاد کرنے کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا گیا اور دوسرے حصہ میں اقدام جہاد کا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی جس کو متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ ظاہری اسباب کو اختیار کرنا تو اس کے منافی نہیں ہے

دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں اسلحہ کی فراہمی کا حکم تو دے دیا گیا لیکن یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اس کی وجہ سے تم یقیناً ضرور محفوظ ہی رہو گے۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا گیا کہ اسباب کا اختیار کرنا صرف اطمینان قلب کے لئے ہوتا ہے۔ ورنہ ان میں فی نفسہ نفع ونقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ (ص: ۴۷۴، ج: ۲)

حصول کامیابی کے لئے قرآنی ہدایات

سورۂ انفال کی آیت ۴۵، ۴۶ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی میدان جنگ اور مقابلہ دشمن کے لئے ایک خاص ہدایت نامہ دیا ہے جو ان کے لئے دنیا میں کامیابی اور فتح مندی کا اور آخرت کی نجات وفلاح کا نسخہ اکسیر ہے۔ اور قرون اولیٰ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں کی فوق العادت کامیابیوں اور فتوحات کا راز اسی میں مضمر ہے اور وہ چند چیزیں ہیں۔

اول ثبات

یعنی ثابت رہنا اور جمنا جس میں ثبات قلب اور ثبات قدم دونوں داخل ہیں۔ کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے، (یہ بات) اہل تجربہ سے مخفی نہیں کہ میدان جنگ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثبات قلب اور قدم ہی ہے۔ دوسرے

سارے ہتھیار اس کے بغیر بیکار ہیں۔

دوسرے ذکر اللہ

یہ وہ مخصوص اور معنوی ہتھیار ہے جس سے مومن کے سوا عام دنیا غافل ہے۔ پوری دنیا کی حکومتیں جنگ کے لئے بہترین اسلحہ اور نئے سے نئے سامان مہیا کرتی ہیں اور فوج کے ثابت قدم رکھنے کی پوری تدبیریں کرتی ہیں مگر مسلمانوں کے اس معنوی اور روحانی ہتھیار سے بے خبر اور نا آشنا ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ثبات قدم کا اس سے بہتر کوئی نسخہ بھی نہیں۔ کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ کی یاد سب کو ہوا میں اڑا دیتی ہے اور انسان کے قلب کو مضبوط اور قدم کو ثابت رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بعض غزوات میں انہیں ہدایات کو مستحضر کرانے کے لئے عین میدان جنگ میں یہ خطبہ دیا "اے لوگو! دشمن کے مقابلہ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ اور جب ناگزیر طور پر مقابلہ ہو ہی جائے تو صبر و ثبات کو لازم پکڑو اور یہ سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔ (ص: ۲۵۴، ج: ۴)

آخری آیت (۸: ۲۲) میں عام قانون کی صورت سے بتلا دیا۔

اَنَّ اللّٰهِ مَعَ الصَّابِرِيْنَ

یعنی اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا ساتھی ہے۔

اس میں میدان جنگ میں ثابتِ قدم رہنے والے بھی شامل ہیں اور عام احکام شرعیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنے والے حضرات ان سب کے لئے معیت الہیہ کا وعدہ ہے۔ اور معیت ہی ان کی فتح و ظفر کا اصلی راز ہے کیونکہ جس کو قادر مطلق کی معیت نصیب ہوگئی اس کو ساری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔

(ص: ۶۸۵، ج: ۴)

سفر جہاد کا ایک اہم ادب

قرآن پاک میں ارشاد ہے :۔

فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا

یعنی اگر جہاد کے لئے نکلو تو اکیلے اور تنہا نہ نکلو بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں نکلو یا ایک کثیر (جمیعا) لشکر کی صورت میں جاؤ۔ کیونکہ اکیلے لڑنے کے لئے جانے میں نقصان کا قوی احتمال ہے اور دشمن ایسے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھالیتا ہے۔ یہ تعلیم تو جہاد کے موقع کے لئے مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ لیکن عام حالات میں بھی شریعت کی یہی تعلیم ہے کہ اکیلے سفر نہ کیا جائے۔ (ص:۴۷۴، ج:۲)

انجام کار کامیابی اہل ایمان کی ہوتی ہے

قرآن پاک میں ارشاد ہے :۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

اس آیت میں ایک اہم ضابطہ اور اصول کی طرف رہنمائی فرمائی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اس عالم میں یہی ہے کہ وہ سختی، نرمی، دکھ، سکھ تکلیف و راحت کے دنوں کو لوگوں میں ادل بدل کرتے ہیں، اگر کسی وجہ سے کسی باطل قوت کو عارضی فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو جماعت حقہ کو اس سے بد دل نہیں ہونا چاہئے۔ اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم کو اب ہمیشہ شکست ہی ہوا کرے گی۔ بلکہ اس شکست کے اسباب کا پتہ لگا کر ان اسباب کا تدارک کرنا چاہئے۔ انجام کار فتح جماعت حقہ ہی کو نصیب ہوگی۔ (ص:۱۹۵، ج:۲)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰: ۴۷)

اور ہمارے ذمہ تھا کہ ہم مؤمنین کی مدد کرتے۔ اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں کبھی شکست نہ ہو۔ حالانکہ بہت سے واقعات اس کے خلاف ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے کہ مؤمنین سے مراد وہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے کفار سے جنگ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ہی انتقام اللہ تعالیٰ مجرمین سے لیتے ہیں۔ اور ان کو غالب کرتے ہیں۔ جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی صورت پیش آتی ہے وہاں عموماً مجاہدین کی کوئی لغزش ان کی شکست کا سبب بنتی ہے جیسا غزوہ اُحد میں ہوا۔

کامیابی کے لئے گناہوں سے بچنا لازمی ہے

جو لوگ محض نام، مؤمن مسلمان رکھ لیں۔ احکام خداوندی سے غفلت و سرکشی کے عادی ہوں، اور غلبہ کیوقت بھی اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں وہ اس وعدہ میں شامل نہیں وہ نصرت الٰہیہ کے مستحق نہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بغیر کسی استحقاق کے بھی نصرت و غلبہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کی امید رکھنا اور اس سے دعا مانگنا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے۔ (ص: ۶:۷۶۱)

ظاہری شکست کبھی امتحان کے لئے ہوتی ہے

سورۂ عنکبوت کی آیت (۲۹: ۳۷۲) میں ﴿ وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴾ فتنہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی آزمائش کے ہیں۔ اہل ایمان خصوصاً انبیاء صلحاء کو دنیا میں مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذرنا ہوتا ہے۔ پھر انجام کار فتح اور کامیابی ان کی ہوتی ہے۔ ان امتحانات اور شدائد کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص اور نیک و بد میں ضرور امتیاز کریں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس

کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے۔ امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو دوسروں پر بھی ظاہر فرمادیں۔ (ص: ۶۷۴، ج:۶)

ضرورت جہاد اور ترک کے نقصانات

سورۂ محمد کی آیت ۲۲ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے احکام شرعیہ الٰہیہ سے رُو گردانی کی جن میں حکم جہاد بھی شامل ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ تم جاہلیت کے قدیم طریقوں پر پڑ جاؤ گے جس کا لازمی نتیجہ زمین میں فساد اور قطع ارحام ہے جیسا کہ جاہلیت کے ہر کام میں اس کا مشاہدہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چڑھائی اور قتل وغارت کرتا تھا۔ اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور کردیتے تھے اسلام نے ان تمام رسومات جاہلیت کو مٹایا اور اس کے مٹانے کے لئے حکم جہاد جاری فرمایا جو اگرچہ ظاہر میں خونریزی ہے مگر درحقیقت اس کا حال سڑے ہوئے عضو کو جسم سے الگ کردینا ہے تاکہ جسم سالم رہے۔ جہاد کے ذریعہ عدل وانصاف اور قرابتوں اور رشتوں کا احترام قائم ہوتا ہے۔ (۴۱: ج:۸)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَوُ لاَ دَفُعُ اللّٰهِ النَّاسِ......الی آخرالایۃ (۲۲:۴۰)

اس میں جہاد وقتال کی حکمت کا اور اس کا بیان ہے کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں پچھلے انبیاء اور ان کی امتوں کو بھی قتال کفار کے احکام دیئے گئے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی۔ سارے ہی دین ومذہب اور ان کی عبادت گاہیں ڈھال دی جاتیں۔

حالت عذر میں ترک جہاد کی گنجائش

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَّ كُلًّا وَّ عَدَاللّٰهُ الْحُسْنٰى

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تارکین جہاد پر فضیلت دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔

اس میں ایسے لوگوں سے جو عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں، تو ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے۔ ورنہ اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ حسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:۔

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ

اور کیوں نہ نکل کھڑی ہوئی تمہاری ہر بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت اس کام کے لئے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرے۔

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم عمل پیش فرمائی۔ کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں۔ (ص:۵۱۷، ج:۱)

حالتِ عذر کی حقیقت

سورۂ توبہ کی آیت ۴۶ وَلَوْ اَرَادُوْا الْخُرُوْجَ لَاَ عَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً............

یعنی اگر واقعی یہ لوگ جہاد کیلئے نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ تیاری بھی تو کرتے۔ لیکن انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ عذر کا بہانہ غلط تھا۔ درحقیقت ان کا ارادہ ہی جہاد کے لئے نکلنے کا نہیں تھا۔

اس آیت سے ایک اہم اصول مستفاد ہوا کہ جو تعمیل حکم کیلئے تیار ہوں پھر کسی

اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہو گئے۔ جس کی وجہ سے نہ جا سکے تو ان کا عذر معقول ہے۔ (ص:۳۸۵، ج:۴)

بغیر عذر شرکت جہاد سے محرومی کا وبال

غزوہ تبوک میں حکم کے باوجود بعض منافقین شریک نہیں ہوئے اور صرف خود ہی نہیں بیٹھے رہے بلکہ دوسروں کو بھی تلقین کی کہ:۔

لَاتَنفِرُوْا فِي الْحَرِّ۔ یعنی گرمی کے زمانہ میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔ غزوہ تبوک کا حکم اس وقت ہوا تھا جب بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی حق تعالیٰ نے ان کا جواب دیا کہ:۔

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا

یعنی یہ بدنصیب اس وقت کی گرمی کو دیکھ رہے ہیں اور اس سے بچنے کی فکر کر رہے ہیں اس کے نتیجہ میں حکم خدا اور رسول کی نافرمانی پر جو جہنم کی آگ سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ اس کی فکر نہیں کرتے کیا یہ موسم کی گرمی جہنم کی گرمی سے زیادہ ہے۔ (ص:۴۳۲، ج:۴)

جہاد و قتال میں احکام کی پابندی

قرآن پاک کی آیت:۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ (۸: ۷۲)

اس میں مذہبی تعصب اور عصبیت جاہلیت کی روک تھام کرنے کے لئے یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ مذہبی رشتہ اگرچہ اتنا قوی اور مضبوط ہے مگر معاہدہ کی پابندی اس سے بھی زیادہ مقدم اور قابل ترجیح ہے مذہبی تعصب کے جوش میں معاہدہ کی

خلاف ورزی جائز نہیں۔ یہی شریعت اسلام کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے ان کو دنیا میں فتح وعزت اور آخرت کی فلاح کا مالک بنایا ہے ورنہ عام طور پر دنیا کی حکومتیں معاہدات کا ایک کھیل کھیلتی ہیں جس کے ذریعہ کمزور کو دبانا اور قوت والے کو فریب دینا مقصد ہوتا ہے۔ جس وقت اپنی ذرا سی مصلحت سامنے ہوتی ہے تو سو طرح کی تاویلیں کر کے معاہدہ کو ختم کر ڈالتے ہیں اور الزام دوسروں کے سر لگانے کی فکر کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے وقت ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس وقت رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ سے صلح کر لی اور شرائط صلح میں یہ بھی داخل تھا کہ مکہ سے جو شخص اب مدینہ جائے اس کو رسول اللہ ﷺ واپس کر دیں عین اس معاملہ صلح کے وقت ابو جندل جن کو کفار مکہ نے قید کر کے طرح طرح کی تکلیفوں میں ڈالا ہوا تھا۔ کسی طرح حاضر خدمت ہو گئے اور اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے رسول اللہ ﷺ سے مدد کے طالب ہوئے۔ آنحضرت ﷺ جو رحمت عالم بن کر آئے تھے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سے کتنے متاثر ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں مگر اس تاثر کے باوجود آیت مذکورہ کے حکم کے مطابق ان کی امداد کرنے سے عذر فرما کر واپس کر دیا (آپ ﷺ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ جلد مکہ فتح ہونے والا ہے اور یہ سب قصے ختم ہونے والے ہیں۔)

(معارف القرآن ص:۲۹۸، ج:۴)

(اسی طرح) غزوہ بدر میں جب کہ تین سو تیرہ بے سر وسامان کا مقابلہ ایک ہزار باشوکت کافروں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص بھی اس وقت ان کی امداد کو پہنچ جائے تو وہ کس قدر غنیمت معلوم ہوگا۔ لیکن اسلام کی پابندی عہد ان سب باتوں سے مقدم ہے عین میدان کارزار میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابو حسل رضی اللہ عنہ

دو صحابی شرکت جہاد کے لئے پہنچتے ہیں۔ مگر آ کر اپنے راستے کا حال بیان کرتے ہیں کہ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمد ﷺ کی امداد کو جا رہے ہو۔ ہم نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کرلیا جب آپ ﷺ کو اس وعدہ کا علم ہوا تو دونوں کو شرکت جہاد سے روک دیا اور فرمایا کہ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہمیں اللہ تعالیٰ کی امداد کافی ہے اور بس۔

حقیقت میں اللہ کے احکام کی پاسداری ہر چیز سے مقدم ہے اللہ کی نافرمانی اتنی خطرناک ہے کہ جہاد جیسا مبارک عمل بھی جنت میں لے جانے کا اس وقت ذریعہ بنے گا جب اللہ کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہوں گے اور اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلہ سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔ (معارف القرآن، ص: ۵۶۸، ج: ۳)

خدا سے تعلق تمام رشتوں سے مقدم ہے

مسلمان صرف اللہ کے لئے اور اسلام کے لئے جہاد کرتا ہے اور جب وطن یا نسب اللہ تعالیٰ اور اسلام کی راہ میں حائل ہو، اس نسب وطن کو بھی اس پر قربان کر دیتا ہے۔ اسلام کی سب سے پہلی ہجرت نے اور غزوہ بدر و اُحد کے میدانوں نے ہمیں یہی سبق دیئے ہیں۔ کیونکہ ان میدانوں میں ایک ہی خاندان کے افراد کی تلواریں اسی خاندان کے دوسرے افراد کے سروں پر اس لئے پڑی ہیں کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کے دشمن تھے اگر وطن اور قبائلی وحدتیں مقصود ہوتیں تو یہ سارے جہاد

فضول ہوتے۔ (جہاد۔ص:۱۳)

غزوہ بدر میں اس وقت جب دونوں لشکر ملے تو دیکھا گیا کہ بہت سے اپنے ہی لخت جگر تلواروں کی زد میں ہیں۔ مگر اس حزب اللہ کا عقیدہ تھا۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

چنانچہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بیٹے (جواب تک کافر تھے میدان میں آئے) تو خود صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تلوار ان کی طرف بڑھی عتبہ سامنے آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر باہر نکلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ماموں میدان میں بڑھا تو فاروقی تلوار نے خود اس کا فیصلہ کیا۔

(پیغمبر امن عالم کی حیثیت سے۔ص:۱۰۵)

رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا تعلق مقدم ہے جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے۔ صحابہ کرامؓ کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے، یہی چیز تھی کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ پر اپنی جان و مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کر کے زبان حال سے کہا۔

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن
ہمہ زخویش بریدند وباتو پیوستند

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور قریش مکہ انصار مدینہ تو سب آپس میں بھائی بھائی ہوگئے اور بدر و اُحد کے میدانوں میں باپ بیٹے بھائی بھائی کی تلواروں نے آپس میں ٹکرا کر اس کی شہادت دی کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(معارف القرآن، ص:۳۳۸، ج:۴)

جہاد کا ایک عمل صدقہ جاریہ سے بھی بڑھا ہوا

اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں قیام کرنے کو رباط یا مرابطہ کہا جاتا ہے رباط کے فضائل بے شمار ہیں صحیح مسلم میں بروایت سلمان رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن کا رباط ایک مہینہ مسلسل روزے اور تمام شب عبادت میں گذارنے سے بہتر ہے۔ اور اگر وہ اسی حال میں مرگیا تو اس کے عمل رباط کا روزانہ ثواب ہمیشہ کیلئے جاری رہیگا۔ اور اللہ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا۔ اور وہ شیطان سے مامون ومحفوظ رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر ایک مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، بجز مرابط کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے اور قبر میں حساب وکتاب لینے والوں سے مامون ومحفوظ رہتا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عمل رباط ہر صدقہ جاریہ سے بھی زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ صدقہ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان زمین یا تصانیف کتب یا وقف کی ہوئی کتابوں وغیرہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہو جائے تو ثواب بھی بند ہو جاتا ہے۔ مگر مرابط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک منقطع ہونے والا نہیں۔ اور وہ جتنے نیک کام دنیا میں کیا کرتا تھا۔ ان کا ثواب بھی بغیر عمل کے ہمیشہ جاری رہے گا۔

(معارف القرآن ص:۲۷۵، ج:۲)

مشروعیت جہاد کی حکمت ومصالح

اس آیت ﴿ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ﴾ (سورہ محمد: آیت ۴) میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس امت میں کفار سے جہاد وقتال کی مشروعیت درحقیقت ایک رحمت ہے۔ کیونکہ وہ آسمانی عذابوں کے قائم مقام ہے کیونکہ کفر وشرک اور اللہ سے بغاوت کی سزا پچھلی قوموں کو آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ دی گئی ہے۔ امت محمدیہ میں ایسا ہوسکتا تھا مگر رحمت للعالمین ﷺ کی برکت سے اس امت کو ایسے عذابوں سے بچالیا گیا اور اس کے قائم مقام جہاد شرعی کو کردیا گیا جس میں بہ نسبت عذاب عام کے بڑی سہولتیں اور مصلحتیں ہیں اول تو یہ کہ عذاب عام میں پوری قوم میں مرد، عورت بچے سبھی تباہ ہوتے ہیں۔ اور جہاد میں عورتیں بچے تو مامون ہیں ہی مگر مرد بھی صرف وہی اس کی زد میں آتے ہیں جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والوں کے مقابلہ پر قتال کے لئے آ کھڑے ہوں۔ پھر اس میں بھی سب مقتول نہیں ہوتے۔ ان میں بہت سے لوگوں کو اسلام وایمان کی توفیق نصیب ہوجاتی ہے۔ نیز جہاد کی مشروعیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ جہاد وقتال کے دونوں فریق مسلمان اور کافر کا امتحان ہوجاتا ہے کہ کون اللہ کے حکم پر اپنی جان ومال نثار کرنے کو تیار ہوجاتا ہے اور کون سرکشی اور کفر پر جما رہتا ہے یا اسلام کے روشن دلائل کو دیکھ کر اسلام قبول کرلیتا ہے۔ (معارف القرآن ص: ۳۰، ج: ۸)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ قہر وغضب اور مدافعت کا مادہ جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جب جہاد کے ذریعہ اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات ہوجاتی ہے۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں

بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پرنالوں کے ذریعہ نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت توڑ کر اندر آتا ہے۔

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ شیطان اور شیطانی تعلیم، کفر و الحاد، خدا اور رسول سے بغاوت، فحاشی وعیاشی سے طبیعتیں مانوس ہو رہی ہیں، ان کی نفرت دل سے نکل چکی ہے اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا۔ انسانی رواداری، اخلاقی اور مروت کا سارا زور کفر و الحاد اور ظلم کی حمایت میں صرف ہوتا ہے۔ نفرت، بغاوت، عداوت، کا میدان خود اپنے اعضاء جوارح کی طرف ہے۔ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہے۔ چھوٹا سا نقطہ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنا دیا جاتا ہے اخبارات و رسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہو رہا ہے۔ دو مخالف طاقتیں لڑ رہی ہیں۔ اور کوئی خدا کا بندہ اپنی طرف نظر کر کے نہیں دیکھتا کہ ؎

ظالم جو بہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو

(وحدت امت ص:۵۳)

خلاف جہاد اُمور

ذیل میں ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جو مقصد جہاد کے خلاف یا نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔

(۱) کفار سے دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا..........الخ

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور مشیر نہ بنائیں۔ کیونکہ یہودی ہوں یا نصاریٰ ،منافقین ہوں یا مشرکین کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیر خواہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ تمہیں بیوقوف بنا کر نقصان پہنچائیں اور دینی اور دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں۔ ان کی آرزو یہ ہے کہ تم تکلیف میں رہو۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلمانوں کا حقیقی دوست اور خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ یعنی ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آجائے تو یہ ان لوگوں کو دکھ پہنچاتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

منافقین کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد اور مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا آسان اور سہل الاصول نسخہ پر بیان کیا گیا کہ:۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ۔

اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچاسکیں گی۔ (معاف القرآن ص: ۲)

اسلام کی کفار کے بارے میں تعلیم اخلاق

کفار اگرچہ مسلمانوں کے درپے آزاد رہتے ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم اخلاق یہ ہے امام قرطبیؒ نے قرآنی حکم وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ کے متعلق فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی

رعایت اور نرمی نہ برتی جائے۔ زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں کیونکہ وہ سنت انبیاء کے خلاف ہے وہ کسی سے سخت کلامی اور سب وشتم نہیں کرتے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اگر تمہاری کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا حد شرعی اس پر جاری کردو مگر زبان ملامت اور طعن و تشنیع نہ کرو"۔

معاف القرآن ص: ۴۲۲، ج: ۴

کفار سے قتال خیر خواہی کے تحت ہوتا ہے

اور جہاں تک کفار سے قتال کی بات ہے تو وہ حکم خداوندی ہے کہ :۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوْا (۹:۱۲۳)

میں یہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کفار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے جہاد و قتال میں ترتیب کیا ہونی چاہئے۔ اس آیت میں ارشاد ہے کہ کفار میں سے جو لوگ تم سے قریب ہوں پہلے ان سے جہاد کیا جائے۔ قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے اور رشتہ نسب اور تعلقات کے اعتبار سے بھی جو قریب ہوں وہ دوسروں سے مقدم کئے جائیں کیونکہ اسلامی جہاد درحقیقت ان کی خیر خواہی کے تقاضہ سے ہے۔ اور خیر خواہی وہمدردی میں رشتہ دار تعلقات والے مقدم ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی اپنے قریبی عزیزوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعمیل فرمائی اور سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو کلمہ حق پہنچایا۔

معارف القرآن ص: ۴۹۷، ج: ۴)

موت سے گھبراہٹ

قرآن پاک میں ہے اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ الخ۔ اللہ تعالیٰ

نے اس آیت میں جہاد سے رکنے والوں کے اس شبہ کا ازالہ کر دیا ہے کہ شاید جہاد سے جان بچا کر موت سے بھی بچ سکتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ موت ایک دن آ کر رہے گی، خواہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں موت آ ئیگی۔ جب یہ بات ہے تو تمہارا جہاد سے منہ پھیرنا بے کار ہے وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَة۔ اس آیت میں کہا گیا کہ موت تم کو بہر کیف پہنچ کر رہے گی اگر چہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ (معارف القرآن ص: ۴۸۴، ج: ۲)

جنگ میں بھاگنا یا پشت پھیرنا

جنگ چھڑ جانے کے بعد پشت پھیرنا اور میدان سے بھاگنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں البتہ دو حالتیں مستثنیٰ ہیں اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ۔ یعنی جنگ کے وقت پشت پھیرنا دو حالتوں میں جائز ہے ایک تو یہ کہ میدان سے پشت پھیرنا محض ایک جنگی چال کے طور پر دشمن کو دکھانے کے لئے ہو، حقیقتاً میدان سے ہٹنا مقصد نہ ہو بلکہ مخالف کو ایک غفلت میں ڈال کر یکبارگی حملہ پیش نظر ہو، دوسری استثنائی حالت میں جس میں میدان سے پشت پھیرنے کی اجازت ہے یہ ہے کہ اپنے موجودہ لشکر کمزوری کا احساس کر کے اسلئے پیچھے ہٹیں کہ مجاہدین کی مزید کمک حاصل کر کے پھر حملہ آور ہوں۔ سورۂ انفال آیت ۶۶ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ الایۃ۔ یعنی اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دوسو کفار پر غالب رہنے کی توقع ہے۔ اس لئے پشت پھیرنا جائز نہیں۔ ہاں فریق مخالف کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگا نہیں۔ ہاں جو دو آدمیوں کے مقابلہ میں بھاگا وہ بھاگنے

والا ہے۔یعنی گناہ کبیر کا مرتکب ہے۔اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے۔

جمہور امت اور ائمہ کے نزدیک حکم شرعی یہی ہے کہ جب تک فریق کی تعداد دوگنی سے زائد ہو اس وقت تک میدان جنگ سے بھاگنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

(معارف القرآن ص: ۲۰۰، ج: ۴)

نزاع اور اختلاف

سورۂ انفال کی آیت ۴۶ میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے ان سے بچنے کی ہدایت ہے اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتا ہے باہمی نزاع اور اختلاف ہے (نتیجتاً) تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔وَاصْبِرُوْا میں نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا ہے اسی صفت کا نام صبر ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے قرآن کریم نے اس جگہ لَا تَنَازَعُوا فرمایا ہے۔یعنی باہمی کشاکش کو روکا ہے۔ اختلاف یا اس کے اظہار سے منع نہیں کیا، اختلاف رائے جو دیانت اور اخلاص کے ساتھ ہو وہ کبھی نزاع کی صورت اختیار نہیں کرتا۔نزاع، وجدال وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف رائے کے ساتھ اپنی بات ماننے کا جذبہ کام کر رہا ہو۔(معارف القرآن ص: ۲۵۳، ج: ۴)

مال غنیمت میں خیانت

لفظ غلول خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خاص کر مال غنیمت کی خیانت کیلئے بھی ۔ اور مال غنیمت چوری اور خیانت اور جرم عام چوریوں اور خیانتوں سے زیادہ اشد ہے، کیونکہ مال غنیمت میں پورے لشکر اسلام کا حق ہوتا ہے، تو جس نے اس میں چوری کی اس نے سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کی چوری

کی، اگر کسی وقت تلافی کا خیال بھی آوے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے۔ یا معاف کرائے۔ بخلاف دوسری چوریوں کے کہ مال کا مالک معلوم ومتعین ہے کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے معاف کرا کر بری ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ غزوہ میں ایک شخص نے اون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ مال غنیمت کا مال تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور ﷺ کی خدمت میں لیکر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ باوجود رحمۃ للعالمین ہونے اور امت پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب میں کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہو گے۔

اس لئے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادہ اشد ہے۔ کہ میدان حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی۔ سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا کیا جائے کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لدا ہوگا۔ صحیحین میں روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت والے روز میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر اونٹ لدا ہوا ہو۔ (اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مال غنیمت کا اونٹ چرایا تھا) وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکم الٰہی پہنچا دیا اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اللہ بچائے یہ میدان حشر کی رسوائی ایسی ہوگی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کیساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رسوائی سے بچ جائیں۔ (معارف القرآن ص: ۲۳۳، ج: ۲)

فخر و عجب

قرآن پاک کی آیت :۔

فَلَم تَقتُلُو هُم وَلَكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُم (۸:۱۷)

میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اپنی سعی وعمل پر ناز نہ کرو یہ جو کچھ ہوا وہ تمہاری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خالص حق تعالیٰ کی نصرت وامداد کا ثمرہ تھا۔ جو دشمن تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے ان کو درحقیقت تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے۔اس ہدایت کے ذریعہ اس فخر وعجب کی خرابی سے بچالیا جس کے نشے میں عموماً فاتح اقوام مبتلا ہو جایا کرتی ہیں۔ (معارف القرآن ص:۲۰۲، ج:۴)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو جذبہ جہاد اور اخلاص نصیب فرمائے اور شرعی اُصولوں کے تحت جہاد کرنے اور شہادت فی سبیل اللہ کی دولت سے مشرف فرمائیں۔

آمین بحرمت سید المرسلین ﷺ۔

۸۴

حالیہ جنگ نے ہمیں کیا سبق دیئے؟

تاریخ تالیف ______ ۱۳۸۵ھ (مطابق ۱۹۶۵ء)

مقامِ تالیف ______

یہ رسالہ غالباً ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد تحریر کیا گیا اور قوم کو توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ اب کیا طریق عمل اختیار کرے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الَّذین اصطفیٰ

دنیا میں اچھے اور برے واقعات پیش آتے ہیں اور بظاہر گذر جاتے ہیں لیکن اہل بصیرت اور خوش نصیب لوگوں کے لئے وہ کچھ عبرت کے سبق چھوڑ جاتے ہیں، جو ہر نشیب و فراز اور سرد و گرم حالات میں انسان کے لئے رہنما ہوتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ دنیا بہترین کتاب ہے اور زمانہ بہترین معلّم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے فرمایا ہے:

انقلاباتِ جہاں واعظ رب ہیں دیکھو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو قدرت کے دیئے ہوئے ان سباق کو یاد رکھتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی بنا لیتے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

پاکستان پر بھارت کے اچانک اور بھر پور حملے اور اس کی بے مثال مدافعت میں تھوڑی تعداد اور بہت تھوڑے سے سامان کا اپنے سے پانچ گنا تعداد اور سامان پر غلبہ اور فتح مبین دنیا کا آنکھوں دیکھا حال ہے جس کو آل انڈیا ریڈیو اپنے جھوٹ کی ڈھول اڑا کر دنیا کی نظروں سے نہیں چھپا سکتا۔

مگر یہاں سوچنے سمجھنے کی بات ہے کہ اس کثرت وقلت اور سامان و بے سامانی

کی جنگ میں قلیل بے سامان کی فتح مبین کے اسباب کیا ہیں تا کہ آئندہ اسباب فتح کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جا سکے اور شکست کے اسباب سے مکمل پرہیز کیا جا سکے۔

بھارت اپنی ذاتی وسعت اور رقبہ کے اعتبار سے بھی پاکستان سے پانچ گنا ہے اور اس نے چین کا ہوادِکھلا کر جو بے پناہ سامان جنگ درحقیقت پاکستان پر حملے کے لئے فراہم کیا تھا اس کے اعتبار سے تو شاید اس میں اور پاکستان میں ایک اور دس کی نسبت ہو جائے۔

اگر افواج کی تعداد اور سامان جنگ کی بہتات جنگ میں فتح کی ضامن ہوتی تو اس وقت پاکستان کی فتح کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ فتح کا اصلی سبب ان چیزوں سے الگ کچھ اور ہے جس کو قرآن کریم ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْ وَ اَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ

(یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا کارساز و مددگار ہے اور کافروں کا کوئی کارساز گار نہیں) (سورۂ محمد: ۱۱)

اسلام کی پوری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جس وقت بھی مسلمان اللہ کے لئے اور حق کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد آئی اور فتح کے اسباب جمع ہوتے چلے گئے، اس جہاد میں بھی اس کا مشاہدہ ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ پاکستان کو اسلام ہی نے بنایا تھا اور اسلام ہی نے اس کو دشمن سے بچایا اور وہی پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے ہر فلاح کا ضامن ہے۔

ہماری فتح کے اصلی اسباب

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سب اسباب بھی جمع فرما دیتا ہے غور کیا جائے تو اس جہاد میں ہماری فتح کے اسباب جو حق تعالیٰ کی امداد سے جمع ہو گئے وہ یہ ہیں:

(۱) سب سے پہلا سبب صدر پاکستان کا پاکستانی مسلمانوں کو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر جہاد کے لئے دعوت دینا ہے جس نے ان کی روح ایمانی کو بیدار کر دیا۔

(۲) دوسرا سبب تمام پاکستان کے باشندوں کا اس جہاد کے لئے وہ بینظیر اتحاد و اتفاق ہے جس کا بظاہر حالات کوئی تصور نہیں ہوسکتا تھا اور بالکل ظاہر ہے کہ یہ ہماری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں خالص حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ سیکڑوں پارٹیوں اور فرقوں کی دلدل میں پھنسی ہوئی دس کروڑ انسانوں کی قوم اپنے سارے سیاسی، طبقاتی، مذہبی، جماعتی اور انفرادی جھگڑے آن کی آن میں فراموش کر کے ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر ہر قربانی کے لئے تیار ہوگئی ہر فرقہ کے علماء نے متفقہ طور پر جہاد کا فتویٰ دیا پاکستان کی پوری آبادی ہر وقت حکومت کے اعلانات پر گوش بر آواز ہوگئی، ادھر ریڈیو پر کسی کام کے لئے اعلان ہوا ادھر پورے ملک میں اس کی پوری پوری تعمیل ہوگئی، نوجوان محاذ جنگ پر جانے کے لئے بے چین، ہر طبقہ کا آدمی اس تلاش میں کہ اس جہاد میں میرا کیا حصہ ہوسکتا ہے۔ دفتروں کا نظم ونسق، بازاروں کا نرخ، صنعتی اور تعمیری اداروں کے کام اپنی اپنی جگہ بلکہ پہلے سے بہتر انداز میں چلتے رہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ ہر طبقہ کے مسلمانوں نے بجا طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ داخلی جنگ کے یہی مورچے ہیں ان کو سنبھالے رکھنا ہی ان کا جہاد ہے۔ دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح جوڑ دینا صرف حق تعالیٰ کی نصرت کا کھلا ہوا معجزہ تھا جیسا کہ قرآن کریم نے قرن اوّل کے مسلمانوں کے دلوں کو ایک کرنے کے متعلق فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان کے دل جوڑ دیئے ورنہ اگر ساری زمین کے خزانے بھی خرچ

کر دیئے جاتے تو ان کے دل متحد نہ ہوتے۔

(۳) تیسرا سبب اللہ تعالیٰ کی فضل ورحمت سے یہ ہوا کہ طرح طرح کی غفلتوں اور گناہوں میں کھوئی ہوئی ہماری قوم کا رخ یک بیک اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگیا، ہر شخص کی زبان پر اللہ کا نام اور دل سے دعائیں اور اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان واعتماد کی وہ کیفیت سب میں پیدا ہوگئی جو ہزاروں وعظ ونصیحت اور تدبیروں سے ممکن نہ تھی، ہمارا ریڈیو فلمی گانوں کی بجائے ہر وقت اللہ کا نام لیتا ہے، اور مجاہدین کے کارنامے سناتا ہے اور پوری قوم اس کو فلمی گانوں سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ سنتی ہے۔ درحقیقت ہمارے ریڈیو نے اس جہاد میں بڑی قابل قدر خدمت انجام دی خدا کرے کہ آئندہ بھی وہ قوم کو لوری دے کر سلانے والے نغموں اور فلمی گانوں کے بجائے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق پروگراموں کا نظام بنائے۔ حالیہ عمل سے واضح ہوگیا کہ قوم میں پوری صلاحیت موجود ہے، وہ رقص وسرود ہی کے لئے ریڈیو نہیں سنتی اس کو مفید معلومات اور اصلاحی مضامین، قرآن وحدیث کے درس سنائے جائیں تو بہت جلد اس میں ایک عمدہ انقلاب آسکتا ہے۔

ہمارے بوڑھے، بچے اور عورتیں ہر مسجد، ہر گھر میں وظائف ختم کرتے اور دشمن کی بربادی اور اپنی فتح کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

یہ ہیں وہ اصلی اسباب جن کی وجہ سے اس جہاد میں پاکستان کو اپنے سے پانچ گناہ زیادہ طاقت پر فتح مبین حاصل ہوئی۔

ہماری ایک کمزوری

اسباب فتح کے اس جائزہ کے ساتھ اس جہاد میں ہمیں اپنی ایک خطرناک

کمزوری کا بھی احساس ہوا کہ ہم نے پاکستان کی انیس سال عمر میں جن بڑی طاقتوں کی دوستی پر اعتماد کیا تھا انہیں نے ہمارے دشمن کو مضبوط کیا کچھ کام آئے تو وہی ممالک جن سے ہمارا رابطہ اسلام و دین کا ہے، ہمیں اس وقت محسوس ہوا کہ مومن کا اعتماد صرف اللہ پر اور اللہ والوں پر ہی ہوسکتا ہے، غیروں پر اعتماد ایک مہلک غلطی ہے۔

ہمارا ملک کافی صنعتی ترقی کے باوجود جنگی سامان کے لئے خود کفیل نہیں، عیش و عشرت کے دوسرے سامان چھوڑے جاسکتے ہیں، ملک میں سادہ معاشرت اختیار کر کے باہر کی احتیاج سے خلاصی حاصل کی جاسکتی ہے ہمارے ملک میں فولاد کے کارخانے نہیں، ہوائی جہاز اور ٹینک تیار کرنے والے کارخانے نہیں۔ ان چیزوں میں ہم دوسروں کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور ہیں ہمارے دشمن کے پاس یہ سب چیزیں موجود ہیں اور وہ اب ایٹم بم بنانے کی فکر میں ہے۔ یہ تو ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ جنگوں کی فتح اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی امداد ہی سے ہوسکتی ہے اور حالیہ جہاد میں ہر شخص نے اس کا مشاہدہ بھی کر لیا ہے لیکن ایمان ہی کا ایک تقاضہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ بھی ہے کہ دشمن کی مدافعت کے لئے ہم مناسب سامان اور قوت بھی جمع کریں۔ ارشاد باری ہے کہ:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

(یعنی اور تیار کرو تم دشمن کے لئے جتنا بھی تم کرسکو سامان جنگ اور سدھے ہوئے گھوڑے تا کہ دھاک پڑ جائے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر)

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے مناسب سامان جنگ فراہم کرنے کا اور فوجی مشقوں کا پورا اہتمام فرمایا اور جو سامان اپنے یہاں نہیں ملتا تھا اس کو باہر سے خرید کر منگا لیتے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی صنعت سیکھنے کے لئے دوسرے ملکوں کا سفر بھی کیا۔

۵

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلحہ کی صنعت سیکھی

امام حدیث ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں غزوہ حنین کے تحت لکھا ہے کہ دو صحابی حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور غیلان ابن اسلمہ رضی اللہ عنہ غزوہ حنین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس لئے شریک نہیں ہو سکے کہ وہ دمشق کے مشہور صنعتی شہر جرش میں اس لئے گئے ہوئے تھے کہ آلات جنگ دبّابہ، ضبّور اور منجنیق کی صنعت سیکھ کر آئیں۔ دبّابہ اور ضبّور ایک قسم کی جنگی گاڑیاں ہیں جن کو قلعہ فتح کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا جن کی جگہ اب ٹینک استعمال ہوتے ہیں اور منجنیق ایک آلہ ہے جس کو اس زمانے کی توپ کہنا چاہئے۔

آئندہ وسیع تر جنگ کا قومی خطرہ

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ جس طرح جہاد میں قوت ایمانی اور اللہ پر توکل و اعتماد اور اس سے دعائیں ضروری ہیں اسی طرح ہر زمانے کے مناسب سامان جنگ جمع کرنا بھی اسلامی فرض ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو غدار دشمن سے سابقہ ہے جس نے پہلے بھی کسی عہد کی پابندی نہیں کی اور اس وقت بھی فائر بندی کو تصفیہ معاملات کے پہلے قدم کی حیثیت سے قبول کر لینے کے بعد اس سے منحرف ہو گیا اور ایک دن فائر بندی کی پابندی نہیں کی ہماری سرحدوں پر اپنی فوجی طاقت بڑھاتا جا رہا ہے ایٹمی ہتھیار بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اپنے مغربی آقاؤں سے مدد کی بھیک، مانگ رہا ہے، بھارت کے صدر سے لے کر وزیروں تک اس بھیک کے لئے ملک سے نکل کھڑے ہوئے ہیں بھارتی حکمران اپنی بھوکی قوم کا پیٹ کاٹ کر ملک کی ساری دولت کو آگ میں جھونکنے

پر تلے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اپنی فتح پر مطمئن ہوکر بیٹھے رہنے سے بڑھ کر کوئی بے وقوفی نہیں ہوسکتی حقیقت ہے کہ یہ جنگ بندی بھی اللہ کی طرف سے آپ کو اپنی قوتوں کو مستحکم کرنے کا ایک زرّین موقع ملا ہے۔

ہمارے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے بجا فرمایا کہ ہم فائر بندی قبول کر کے سلامتی کونسل کو ایک اور موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کا احترام کرے اور ان کی تکمیل کے لئے جدو جہد کرے۔

اس کا ایک دوسرا رخ یہ بھی قابل نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ سترہ روزہ جہاد میں ہم جیسے گناہ گاروں کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنی نصرت و امداد کے جو معجزے دکھائے اور پھر جنگ بندی کا ایک وقفہ دیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں ایک موقع دینا ہے کہ ہم اپنی اصلاح کرلیں اسی لحاظ سے یہ جنگ ہمارے لئے ایک نعمتِ عظمیٰ اور حق تعالیٰ کی خاص رحمت ثابت ہوئی کہ جس نے پوری قوم کے اخلاق و اعمال کو یک بیک ایسا بدل دیا کہ اس کو پاکستان کی نشاۃ ثانیہ کہا جائے تو بے جا نہیں، ایسے حالات ہر وقت نہیں آتے اس وقت ضرورت ہے کہ ہمارا ہر طبقہ اپنی اصلاح کے لئے عزم راسخ کے ساتھ کمر بستہ ہوجائے اور مندرجہ ذیل امور میں اپنی پوری پوری توانائی صرف کردے۔

آئندہ جہاد کی تیاری کے لئے چند ضروری کام

(۱) سچے اور پکے مسلمان بنیں، شراب فسق و فجور، رقص و سرود اور بے حیائی کی تمام صورتوں سے، نیز رشوت اور حرام آمدنی کے تمام طریقوں سے خالص توبہ کریں، نماز با جماعت کی پابندی کریں، قرآن کی تلاوت اور ضروریات دین کی تعلیم سے کوئی مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، خالی نہ رہے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ

کی رحمت ونصرت پہلے سے زیادہ ہمارے ساتھ ہو۔

(ب) حکومت اور عوام کے باہمی ربط واتحاد کو ہمیشہ قائم رکھنے اور بڑھانے میں کوشاں رہیں۔ باہمی تفرقے خواہ عوام کی مختلف پارٹیوں اور فرقوں کے ہوں یا عوام اور حکومت کے، ان کو کسی قیمت پر برداشت نہ کریں۔ جن اختلافی مسائل سے فرقوں اور پارٹیوں کے جذبات مشتعل ہوں۔ ان کو کم از کم دس سال کیلئے ملتوی کردیں۔ ہر فرقہ اپنے مسلک کے لوگوں کی تلقین وتعلیم صرف اپنے تعلیمی حلقوں اور فتووں تک محدود کردے۔ عوامی جلسوں، اخباروں اشتہاروں میں اس کا نام نہ آئے۔ اسلامی ریسرچ اور اسلامی ثقافت کے نام پر جو سرکاری یا نیم سرکاری ادارے قائم ہیں۔ خدا کے لئے وہ مسلمانوں کے اس اتحاد کو اپنی تحقیقات کا نشانہ نہ بنائیں تیرہ سو برس سے مسلمان علماء جس طرح عمل کرتے آئے ہیں اور جمہور اہل اسلام اس پر متفق ہیں ان مسائل کو نہ چھیڑیں۔ جمہور امت کے خلاف ان کی رائے اور تحقیق کتنی ہی گراں مایہ اور خوبصورت نظر آئے مگر اکبر بادشاہ کے دین الٰہی سے لے کر آج تک کی ایسی تحریکوں کے انجام پر نظر ڈالیں تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ اسلام کی فطرت ایسی جدتوں کو کبھی قبول نہیں کرتی جس سے اسلام کے بنیادی اصول مجروح ہوتے ہوں۔ اور اس قسم کی تحقیقات کا نتیجہ مسلمانوں میں تفرقے اور باہمی منافرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح کے موجودہ ادارے اگر اخلاص وانصاف کے ساتھ اپنی سالہا سال کی کوشش اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد اس کا جائزہ لیں کہ اس سے اسلام اور ملّت اسلام کو کیا فائدہ پہنچا تو مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی محسوس کریں گے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے سوا اس کا کوئی مفاد ملک وملت کو نہیں ملا۔

(ج) سب ملکوں سے معاہد اور مصالحانہ تعلقات رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں لیکن غیروں پر اعتماد سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلیں۔ بھروسہ صرف اللہ اور اللہ والوں پر کریں اور قرآنی احکام کے مطابق اپنے ملک کو مستحکم اور خود کفیل بنا کر دوسروں کی محتاجی سے آزاد ہونے کی دھن میں لگ جائیں۔ جس کی واحد صورت یہ ہے کہ ملک کے عوام اور حکام سب عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ دیں، سادگی اور محنت و جفاکشی کے خوگر بنیں۔ یورپ سے درآمد کی ہوئی مہنگی اور گندی معاشرت کو انہیں کے سر پر ماردیں جنھوں نے ہم پر مسلط کر کے ہمیں کسی کام کیا نہیں چھوڑا ہمارے ملک کا غریب سے غریب آدمی زمانہ کے بدلتے ہوئے فیشنوں اور معاشرت میں ضروریات کی جگہ لینے والی فضولیات میں ایسا الجھ کر رہ گیا ہے کہ حلال کمائی اس کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی تو وہ رشوت، چوری، دھوکہ، فریب یا چور بازاری وغیرہ کے حرام ذرائع اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے ورنہ معاشرہ میں اس کو ذلیل وحقیر سمجھا جاتا ہے۔ کاش کہ ہماری قوم کے بڑے لوگ خواہ وہ مال ودولت کی وجہ سے بڑے مانے جاتے ہیں یا حکومت وجاہ کے سبب اس حقیقت کو محسوس کرلیں تو درمیانی اور نچلے طبقے خود بخود درست ہوجائیں گے اور صرف ایک عمل کے نتیجہ میں سینکڑوں جرائم اور اخلاقی خرابیوں سے قوم کو نجات حاصل ہوجائے گی۔

پچھلی جنگ عظیم میں مسٹر گاندھی جی نے کھدر کی تحریک چلائی تو کامیابی اسی وقت ہوئی جبکہ دولت مند وزراء امراء کھدر میں ملبوس ہوگئے موجودہ زمانہ میں چین کی ترقی کا راز بھی یہی سادہ معاشرت اور محنت و جفاکشی کی عادت ہے کہ صدر مملک اور حکام وعوام سبھی اس کے عادی ہوگئے۔

اسلام اور ملّتِ اسلام کی تو پوری تاریخ اس سادگی اور محنت و جفاکشی کا سبق دیتی ہے۔ عام حالات میں اگر ہم کچھ تکلف و تنعّم کے عادی ہو جاتے تو اتنا بُرا نہ تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ جنگ کے بادل ہم پر منڈلا رہے ہوں پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا ہے اور اگر اس کو اسلام کا وطن کہا جائے تو بے جا نہیں اس کو اور اس کے ہر مسلم باشندے کو جنگ کے خطرات نے گھیر رکھا ہے اگر ہم اب بھی اپنے عیش و عشرت اور اپنے طاؤس ورباب کی دھن میں لگے رہے تو ہندوستان کے آخری بادشاہوں اور ان کی حکومت کی تاریخ ہم سے دور نہیں جس نے بتلا دیا کہ اللہ ایسے بدمست لوگوں کی مدد نہیں کرتے اگر چہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں ایسے جنگی خطرات کے وقت عرب قوموں کی غیرت کا تو یہ حال تھا کہ بہت سی ضروریاتِ زندگی کو اس وقت تک چھوڑ دینے کا عہد کر لیتے تھے جب تک جنگ میں وہ اپنے دشمن پر فتح نہ پالیں۔ غزوہ بدر میں شکست کھانے کے بعد قریش عرب نے عہد کر لیا تھا کہ ہم اپنے مُردوں اور مقتول عزیزوں پر اس وقت تک روئیں گے نہیں جب تک مسلمانوں سے اس کا بدلہ نہ لے لیں اسی کے نتیجہ میں غزوہ احد پھر غزوہ احزاب میں عربوں کی پوری قوتیں جھونک دی گئیں، مگر دوسری طرف صرف قومی غیرت نہیں بلکہ اسلامی غیرت صرف اللہ کے لئے تھی اس پر کوئی طاقت نہ غالب آسکتی تھی نہ آئی۔

ہم اگر آج سادہ معاشرت اختیار کر لیں، غیروں سے لئے ہوئے فیشنوں اور تکلفات کا جوڑا اتار پھینکیں تو ہماری قوم کا کروڑوں روپیہ بچ سکتا ہے جس کو وہ اپنے ملک وقوم کے مفاد پر لگا کر اپنے سارے ترقیاتی منصوبوں کو خود بروئے کار لا سکتے ہیں اور ملک کو خود کفیل بنا سکتے ہیں اور جو شخص اس کام کو ملک وملت کے استحکام اور حفاظت کی نیت سے کرے گا اس کا یہ عمل بلاشبہ جہاد کے حکم میں ہوگا اور اس کا ثواب عظیم اس کے لئے لکھا جائے گا۔ مالی بچت اور اس کے منافع مفت میں رہیں گے اس لئے ہونا یہ

چاہئے کہ خالی عیش وعشرت اور زیب وزینت کی اشیاء کے غیر ملکوں سے درآمد کے سب دروازے بند کر کے غیر ملکی زرمبادلہ بچایا جاوے اور خود اپنے ملک کی صنعتیں بھی کھیل کھلونے اور لگژری زیب وزینت اور عیش وعشرت کے بجائے سادہ ضروریات زندگی کا سامان تیار کریں۔ اور ہر طرح کا سامان جنگ بنانے کے کارخانے قائم کئے جائیں۔

حکومت اور عوام کا تعاون ہی اس مشکل کو حل کرسکتا ہے

جنگ ہو یا صلح مذکورہ امور ہماری قومی اور اجتماعی زندگی اور ملکی استحکام کے بنیادی اصول ہیں۔ ان سے غفلت ہلاکت کے مترادف ہے۔

مگر سابقہ غفلتوں نے ہم سب کو بشمول عوام، علماء، حکام اور حکمران طبقے کو ایمانی کمزوری اور اخلاقی بیماریوں کا شکار بنایا ہوا ہے۔ ان کا موثر علاج جبھی ہوسکتا ہے کہ عوام اور حکومت دونوں اپنے اپنے وسائل کے مطابق اس کام کیلئے کمر بستہ ہوجائیں ایک دوسرے پر الزام ڈالنا کافروں کا طریقہ ہے [فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ] یعنی جب کوئی خرابی پیش آتی ہے تو ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری اور الزام ڈالنے لگتے ہیں، اس طریقہ کو چھوڑ کر عوام اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور حکومت اپنی ذمہ داری کو، اس طرح پوری قوم کو گھن کی طرح لگے ہوئے معاصی اور منکرات سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ چونکہ حکومت کے وسائل وسیع بھی ہیں، قوی بھی، اس کی ذراسی توجہ ہوجائے اور عوام تعاون کریں تو بہت جلد منکرات اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ ضعیف آواز حکومت کے ذمہ داروں تک بھی پہنچ جائے اور اللہ تعالیٰ اس میں اثر پیدا فرمادیں۔

واللہ الموفق والمعین

قنوت نازلہ

اس کے پڑھنے کا طریقہ اور متعلقہ مسائل!

مسئلہ نمبر ۱:۔ یہ دعا دائمی سنت نہیں بلکہ جب کوئی حادثہ شدیدہ عامہ پیش آئے پڑھی جائے جب زائل ہو جائے چھوڑ دیں۔ (زادالمعاد و شامی)

مسئلہ نمبر ۲:۔ دعاء مذکورہ دراصل چار دعاؤں پر مشتمل ہے۔ اگر وقت میں تنگی اور نمازیوں پر بار نہ ہو تو چاروں پڑھ لے ورنہ صرف پہلی یا دوسری یا دونوں پر بھی کفایت ہو سکتی ہے۔

مسئلہ نمبر ۳:۔ قنوت نازلہ بوقتِ حوادث نماز فجر میں پڑھنا جمہور حنفیہ کے نزدیک مستحب ہے، اور نماز مغرب و عشاء میں بعض حنفیہ مستحب قرار دیتے ہیں بعض منع کرتے ہیں۔ (درمختار، شامی شرح منیہ، بحر، اشباہ) اور ظہر و عصر میں پڑھنا بالاتفاق حنفیہ و جمہور ائمہ اب مشروع نہیں۔

مسئلہ نمبر ۴:۔ نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد امام دعا مذکور جہراً پڑھے اور مقتدی آہستہ آمین کہتے رہیں۔ یہ آمین ہر جملہ دعاء کے ختم پر کہیں۔ (شامی، مراقی الفلاح) نیز صحیح بخاری کی حدیث میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس دعا کا بعد رکوع ہونا نیز جہراً پڑھنا دونوں کی تصریح ہے۔

مسئلہ نمبر ۵:۔ قنوت نازلہ میں نہ قنوت وتر کی طرح ہاتھ اٹھائے نہ تکبیر کہے۔

هذا هو مقتضى الاثار ولم ارمن تعرض له من فقها ئنا)

مسئلہ نمبر۶:۔ دعا[1] پڑھنے کے وقت ہاتھ چھوڑ دیئے جاتے ہیں

بندہ محمد شفیع عفااللہ عنہ،

دارالعلوم کراچی

دعائے قنوت کے مختلف صیغے احادیث میں منقول ہیں ان میں سے مناسب حال دعا یہ ہے:

(۱) اَللّٰھُمَّ اھدِنَافِیمَنْ ھَدَیْتَ، وَعَافِنَافِیمَن عَافَیتَ، وَتَوَلَّنَافِیمَن تَوَلَّیتَ وَبَارِكْ لَنَا فِیمَآ اَعطَیتَ، وَقِنَاشَرَّمَاقَضَیتَ، فَاِنَّكَ تَقضِی وَلَایُقضٰی عَلَیكَ، وَاِنَّهٗ لَایَعِزُّمَن عَادَیتَ، وَلَا یَذِلُّ مَن وَّالَیتَ، تَبَارَكتَ رَبَّنَا وَ تَعَالَیتَ، نَستَغفِرُكَ وَنَتُوبُ اِلَیكَ۔

(۲) اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ، وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِھِمْ، وَاَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ، وَانْصُرْھُمْ عَلٰی عَدُوِّكَ وَعَدُوِّھِمْ، اَللّٰھُمَّ الْعَنْ كَفَرَةَ

[1]...... دعا قنوت میں ہاتھ باندھے یا چھوڑے یا دعا مانگنے کی صورت سے اٹھائے اس میں تیسری صورت تو بالتفاق ائمہ حنفیہ مشروع نہیں (الافی روایة شاذة عن ابی یوسف) اور پہلی اور دوسری صورت میں ائمہ حنفیہ کا اختلاف ہے امام اعظم اور ابو یوسف ہاتھ باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں اور امام محمد ہاتھ چھوڑنے کو (اعلاء السنن ۷۷ ج ۶) احقر نے اتنے بزرگوں کا عمل امام محمد کے قول پر پایا ہے کہ ہاتھ چھوڑے رکھتے ہیں، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔ بندہ محمد شفیع عفااللہ عنہ

الهِندِ الَّذِينَ يُقَاتِلُون اَو لِيائَكَ وَيَصُدُّ ونَ عَن سَبِيلِكَ وَيُكَذِّبُونَ رُسُلَكَ، اَللّٰهُمَّ خَالِف بَينَ كَلِمَتِهِم، وَفَرِّق جَمعَهُم، وَشَتِّت شَملَهُم، وَزَلزِل اَقدَامَهُم، وَاهزِم جُندَهُم، وَاَلقِ فِي قُلُوبِهِم الرُّعبَ۔

(۳) اَللّٰهُمَّ عَلَيكَ بِاَشِدَّآئِهِم، وَخُذهُم اَخذَ عَزِيزٍ مُّقتَدِرٍ، اَللّٰهُمَّ انصُر عَسَاكِرَ المُسلِمِينَ فِي كَشمِيرَ وَسَائِرِ بَاكِستَان، وَاشدُد وَطَاءَتَكَ عَلٰى مَن قَاتَلَهُم، وَاَنزِل بِهِم بَأسَكَ الَّذِى لَاتَرُدُّهُ عَنِ القَومِ المُجرِمِين،

(٤) اَللّٰهُمَّ مُنزِلَ الكِتَابِ، وَمُجرِيَ السَّحَابِ، هَازِمَ الاَحزَابِ اِهزِمهُم وَانصُرنَا عَلَيهِم

تنبیہ:۔ یہ دعا اس وقت تک نماز صبح میں جاری رہنی چاہئے جب تک جنگ کے خطرات باقی ہیں۔

محمد شفیع دارالعلوم کراچی

۸۵

طریق السداد فی عقوبة الارتداد

مرتد کی سزا اِسلام میں

تاریخ تالیف ______ ربیع الاول ١٣٤٠ھ (مطابق ١٩٢١ء)

مقامِ تالیف ______ دیوبند

اشاعت اول دارالاشاعت دیوبند

قادیانیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ مرتد کی سزا اسلام میں قتل نہیں ہے، اس سلسلہ میں ان کا آرگن ''پیغام صلح'' بار بار قتل مرتد کے اجماعی حکم کے خلاف مضامین شائع کر رہا تھا۔ یہ مقالہ اس کی تردید میں سپرد قلم کیا گیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

قادیانی مذہب اور اس کی تحریفات نے جن ضروریات اسلامیہ کو تختۂ مشق بنایا ہے، وہ غالباً ہمارے ناظرین سے مخفی نہیں۔ ختم نبوت کا انکار، نزول مسیح کا انکار اور فرشتوں کا زمین پر آنے سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ تھا مگر ہم سمجھتے تھے، کہ یہ سب الوالعزمیاں مرزا صاحب کے دم تک ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کا نبی کہتے تھے، اور اس کا مستحق سمجھتے تھے کہ حدیثِ نبوی کے ذخیرہ میں سے جس حصہ کو چاہیں لیں، اور جس کو چاہیں (نعوذ باللہ) ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں، جس کا خود مرزا صاحب نے اپنی تصانیف شہادت القرآن اور اربعین ص:۱۵ وغیرہ میں کھلے بندوں اعلان کیا ہے، لیکن آج نعمت اللہ خان (۱) مرزائی کے قتل نے یہ بات دکھلا دی

---

(۱)...... یہ شخص کابل میں مرزائی دجل کی اشاعت کرنے کے لئے گیا تھا، والی کابل نے علماء سے فتویٰ لے کر اس کو قتل کرا دیا اس پر مرزائی امت بجائے اس کے کہ اپنے مرتد نہ ہونے کا ثبوت پیش کرتی، اس قدر چراغ پا ہوئی کہ اسی کا انکار کر دیا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ارتداد کی وجوہ میں ایک اور وجہ کا اضافہ کر دیا کہ اسلام کا ایسا قطعی حکم جو قرآن و حدیث کی نصوص اور اجماع سے ثابت ہے، اس کی تحریف کر ڈالی۔ اس زمانہ میں اخبارات میں یہ بحث چلی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں؟ احقر نے یہ مضمون اسی زمانہ میں لکھ کر اخبارات کو دیا تھا، پھر بعض اخبارات کے تقاضا سے مناسب معلوم ہوا کہ مستقل شائع کر دیا جائے۔ ۱۲ منہ

کہ ع:

"ایں خانہ تمام آفتاب است"

مرزا صاحب کے مرنے سے بھی نصوص شرعیہ کی تحریف اور بدیہی الثبوت مسائل اسلامیہ کے انکار کا دروازہ بند نہیں ہوا بلکہ ان کا روحانی فیض آج تک اپنے لوگوں میں کام کر رہا ہے، جس کی نظیر یہ ہے کہ شریعت اسلام کا کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہونے کی سزا قتل ہے، آیاتِ قرآنیہ کے بعد احادیث نبویہ کا ایک بڑا دفتر اس حکم کا صاف طور سے اعلان کر رہا ہے جن میں سے تقریباً تیس حدیثیں ہمارے زیرِ نظر ہیں، جن کو اگر ضرورت سمجھی گئی تو کسی وقت پیش کیا جائے گا، اسکے بعد اگر خلافتِ اسلامیہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے اور چاروں خلفائے راشدین سے لے کر بعد کے تمام خلفاء کا متواتر عمل بتلا رہا ہے کہ مسئلہ ان بدیہیاتِ اسلامیہ سے ہے کہ جس کا انکار کسی مسلمان سے متصور نہیں۔

بایں ہمہ آج جب کہ دولتِ افغانستان (زاد ہا اللہ شرفاً و اجلالاً) نے اس شرعی اور قطعی فیصلہ کے ماتحت نعمت اللہ خاں مرزائی کو قتل کر دیا، تو فرقہ مرزائیہ کی دونوں پارٹیاں قادیانی اور لاہوری اور بالخصوص اس کا آرگن پیغامِ صلح سرے سے اس حکم کے انکار پر تل گئے، اور دولتِ افغانستان پر طرح طرح کے بیہودہ عیب لگانے اور ان کے عین شرعی فیصلہ کو وحشیانہ حکم ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔

ہمیں اس دیدہ دلیر معاصر سے سخت تعجب ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کو چیلنج دیتا ہے کہ از روئے شریعتِ اسلامیہ مرتد کی سزا قتل ہونا ثابت کریں، حالانکہ یہ مسئلہ اسلام میں اس قدر بدیہی الثبوت ہے کہ ہم کسی مسلمان پر بلکہ خود ایڈیٹر پیغام صلح پر

بدگمانی نہیں کر سکتے کہ وہ اس قدر ناواقف اور احکام شرعیہ سے غافل ہوں گے کہ ان کو قتل مرتد کی کوئی دلیل ادلۂ شرعیہ میں نہیں ملی۔ میں تسلیم کر سکتا ہوں، کہ قرآن کریم کے دلائل اور اس کے محیر العقول لطائف ان کی پرواز سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان کی نظر سے اوجھل رہے ہوں، لیکن یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے، کہ احادیث کا اتنا بڑا دفتر ایک شخص پر بالکل مخفی رہے جو منہ بھر بھر کہ علم کی ڈینگ مارتا ہے، اور علمائے اسلام کے منہ آتا ہے۔

ہاں میں ان کو اس میں بھی معذور سمجھتا کہ یہ سب حدیثیں غیر درسی کتابوں میں ہوتیں لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ان میں سے دس بارہ حدیثیں وہ ہیں، جو حدیث کی درسی کتابوں (صحاح) پر ایک سرسری نظر ڈالنے والے کے بلا تکلف سامنے آجاتی ہیں۔ جن سے معمولی درجہ کے طالب علم بھی ناواقف نہیں رہ سکتے۔ مگر ایڈیٹر پیغام صلح ہیں کہ نہایت دلیری کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ (سنت نبوی میں قتلِ مرتد کا کوئی اُسوہ نہیں ملتا)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کلام غیظ وغضب کی بدحواسی میں ان کے قلم سے نکل گیا ہے (جس پر وہ افاقہ کے بعد قرآن وحدیث کو دیکھ کر پشیمان ہوئے ہوں گے) یا واقع میں ان کی تحصیل اور مبلغ علم یہی ہے کہ جس حکم سے قرآن وحدیث اور تعامل سلف کے دفتر بھرے ہوئے ہوں، ان کا دماغ اس کے علم سے ایسا کورا ہے کہ علمائے اسلام کو اس کے اثبات کا اس بیہودہ خیال پر چیلنج دے رہے ہیں کہ وہ ثابت نہ کر سکیں گے، اور اگر ایسا ہے تو ہم ایڈیٹر صاحب کو اس معاملہ میں بھی معذور سمجھیں گے کیونکہ ان کو مرزا صاحب ایک ایسے کام میں لگا گئے ہیں جس سے وہ کسی وقت فارغ نہیں ہو سکتے۔ مرزا صاحب کے متہافت اور متعارض اقوال کی گتھیوں کا سلجھانا ہی عمر گنوا دینے کے لئے کافی ہے۔ ان کو کہاں فرصت کہ ہو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

کے دین کی طرف متوجہ ہوں اور آپ کی احادیث کو پڑھیں اور سمجھیں۔

اگرچہ مرزائی فرقہ کے حالات کا تجربہ رکھنے والے حضرات یہاں بھی یہی کہیں گے کہ یہ سب شقیں غلط ہیں، دراصل یہ سب احکام قرآن وحدیث ان کے ضرور سامنے ہیں، مگر وہ جان بوجھ کر دیکھتے آنکھوں ان کا انکار کررہے ہیں۔ اور وہ اس میں بھی معذور ہیں کیونکہ انکے آقا مرزا صاحب کی یہی تعلیم ہے جس پر ان کی زندگی کے بہت سے کارنامے شاہد ہیں۔

بہرحال صورت کچھ ہو، آج پیغام صلح دنیائے اسلام کو پیغام جنگ دے کر یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلہ کو اخباری گھوڑ دوڑ کا میدان بنائے اگر اس کے نزدیک اسی کی ضرورت ہے کہ اس بدیہی الثبوت مسئلہ پر بحث کر کے اخبار کے کالموں کو پر کیا جائے، تو ہمیں بھی کچھ ضرورت نہیں کہ اس کو غیر ضروری ثابت کریں۔

لہٰذا ہم مختصر طور پر یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ مرتد کے لئے کیا سزا تجویز کرتی ہے۔ اور خلفائے راشدین اور بعد کے تمام خلفاء نے مرتدین کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔

قرآنِ عزیز اور قتلِ مرتد

اس بحث کو چونکہ مجھ سے پہلے اور افاضل بھی مفصل لکھ چکے ہیں اس لئے صرف ایک آیت کو مختصراً پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، قال اللّٰہ تعالیٰ انما جزاء الذین یحاربون اللّٰہ و رسولہ (الآیہ) یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتد ہو گئے تھے، جس کا طویل واقعہ اکثر کتب حدیث وتفسیر میں موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان لوگوں کو قتل کیا جیسا کہ صحیح بخاری اور فتح

الباری وغیرہ تمام معتبر کتب حدیث وتفسیر میں موجود ہے، اور امام بخاریؒ نے قتلِ مرتد کے بارہ میں اسی آیت سے استدلال کرنے کے لئے احکام مرتد کے ابواب کو اسی آیت سے شروع فرمایا ہے، نیز سورۂ مائدہ کی تفسیر میں حضرت سعید ابن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ آیت میں محاربۃ اللہ سے مراد کافر ہونا ہے اور فتح الباری میں بحوالہ ابن بطال اسی کی تائید کی گئی ہے۔

الغرض آیۃ مذکورہ مرتد کے لئے سزائے قتل تجویز کرتی ہے پھر قتل کے معنی مطلقاً جان لینے کے ہیں، خواہ تلوار سے یا سنگساری سے یا کسی اور طریق سے جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور صاحب اقرب الموارد نے اقرب میں نقل کیا ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور قتل مرتد

ہم نے نقل کیا ہے کہ کثیر التعداد احادیث اس مسئلہ کے ثبوت میں وارد ہوئی ہیں، جن میں سے تقریباً تیس حدیثیں ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہمارے سامنے ہیں، لیکن اخبار کے کالم اس کام کے لئے زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتے کہ ان میں اس قدر احادیث کا سلسلہ نقل کیا جائے۔ اس لئے صرف ان گیارہ احادیث پر اکتفاء کیا جاتا ہے، جو کتب صحاح یعنی احادیث کی درسی کتابوں میں موجود ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اخباری دنیا کے لئے بہت زائد ہے:

۱:...... من بدل دینه فاقتلوه

(رواہ البخاری وابوداؤد والدارقطنی عن ابن عباسؓ)

جو شخص اپنے دین اسلام کو بدلے اُس کو قتل کر ڈالو۔

۲:...... حضرت ابو موسیٰؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے والیٔ یمن تھے،

ایک مرتبہ حضرت معاذؓ یمن پہنچے تو دیکھا کہ ان کے پاس ایک مرتد قید کر کے لایا گیا، حضرت معاذؓ نے فرمایا:

لا اجلس حتی یقتل قضاء اللّٰہ و رسولہ ثلاث مرات فامر بہ فقتل (بخاری و مسلم ونسائی وابوداؤد واحمد)

میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اس کو قتل نہ کیا جائے یہی ہے اللہ اور رسول کا حکم تین مرتبہ یہی کہا، چنانچہ اس کو قتل کیا گیا۔ (روایت کیا اس کو بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، وغیرہ نے)

۳:...... حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی ایک جماعت کے متعلق حکم فرمایا:

أینما لقیتموھم فاقتلوھم فان فی قتلھم اجرا لمن قتلھم یوم القیامۃ (بخاری، مسلم وغیرہما)

ان کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اس لئے کہ ان کے قتل کرنے میں ثواب ہے (بخاری، مسلم)

۴:...... اسی مضمون کی ایک حدیث ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے نقل کی ہے۔

۵:...... جب قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ مرتد ہو گئے، تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قتل کیا جس کا طویل واقعہ اکثر کتب حدیث بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔

۶:...... حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا قتل ہرگز حلال نہیں مگر تین شخصوں کو قتل کیا جائے گا:

النفس بالنفس و الثیب الزانی و المارق لدینه التارک للجماعة (بخاری، مسلم)

جان کے بدلے میں جان لی جائے، اور بیاہا ہونے کے بعد زنا کرنے والا اور اپنے دین اسلام اور جماعت مسلمین کو چھوڑنے والا۔

(بخاری، مسلم)

۷:......اور جب حضرت عثمان غنیؓ گھر کے اندر محصور تھے، تو ایک روز گھر کی دیوار پر چڑھے اور لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مسلم کا قتل اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس سے تین کاموں میں سے کوئی کام سرزد نہ ہو، اور وہ تینوں یہ ہیں:

زنی بعد احصان و کفر بعد اسلام و قتل نفس بغیر حق

(نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

بیاہا ہونے کے بعد زنا کرنا اور اسلام کے بعد کافر ہونا اور کسی شخص کو بغیر حق کے قتل کرنا۔ (نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

۸:......اور حضرت صدیقہ عائشہؓ سے بھی اسی مضمون کی کئی حدیثیں مروی ہیں دیکھو مسلم اور مستدرک حاکم وغیرہ۔

۹:......من غیر دینه فاضربوا عنقه (بخاری و مسلم عن زید بن ارقم)

جو شخص اپنے دین اسلام کو بدلے اُسے کو قتل کر دو۔ (بخاری و مسلم)

۱۰:......اذا ابق العبد الی الشرک فقد حل دمه (رواه ابوداؤد عن جریرؓ)

جو کوئی اسلام چھوڑ کر کفر کی طرف بھاگے، تو اس کا خون حلال ہے۔

۱۱:......**من جحد آية من القرآن فقد حل ضرب عنقه**

(ابن ماجۃ عن ابن عباسؓ)

جو شخص قرآن کی کسی آیت کا انکار کرے اس کی گردن مار دینا حلال ہو گیا۔ (ابن ماجہ)

یہ سب حدیثیں وہ ہیں جو صحاح کی کتابوں میں موجود ہیں، اور اکثر صحیحین بخاری و مسلم میں مذکور ہیں، ان تمام فرامین نبویہ کے ہوتے ہوئے ایڈیٹر پیغام صلح کا یہ کہنا کس قدر ان کے علم کی داد دیتا ہے کہ (سنت نبویہ میں قتلِ مرتد کا کوئی اسوہ نہیں ملتا) اس کے جواب میں ہم بجز اسکے کیا کہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور آپ کی احادیث میں دخل دینا ہی ان کی اصولی غلطی اور خواہ مخواہ دخل در معقولات ہے ان کو چاہئے کہ وہ اپنے مہدی، مسیح نبی، میکائیل، عیسیٰ، موسیٰ، ابراہیم، آدم، مرد، عورت، حاملہ، حائضہ غرض ہر رنگی مقتدا کی عبارات اور اس کے اُدھیڑ بن میں لگے رہیں، اور احکام اسلامیہ کو ان لوگوں کے سپرد کریں جو اس کے اہل ہیں۔

خلفاء راشدین اور قتلِ مرتد

اس بحث میں سب سے پہلے افضل الناس بعد الانبیاء خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل ملاحظہ فرمایئے:

۱:......شیخ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں حضرت عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور مدینہ کے اردگرد میں بعض عرب مرتد ہو گئے، تو خلیفہ وقت صدیق اکبرؓ شرعی حکم کے مطابق ان کے قتل کے لئے کھڑے ہو گئے، اور عجب یہ کہ فاروق اعظمؓ جیسا اسلامی سپہ سالار اس وقت ان

کے قتل میں بوجہ نزاکتِ وقت تأمل کرتا ہے، لیکن یہ خدا کی حدود تھیں، جن میں مساہلت سے کام لینا صدیق کی نظر میں مناسب نہ تھا، اس لئے فاروق اعظمؓ کے جواب میں بھی یہی فرمایا:

هيهات هيهات مضى النبي صلى الله عليه و سلم و انقطع الوحي و الله لاجاهدهم ما استمسك السيف في يدي۔

ہیہات ہیہات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور وحی منقطع ہوگئی خدا کی قسم میں ضرور ان سے اس وقت تک جہاد کرتا رہوں گا، جب تک میرا ہاتھ تلوار پکڑ سکے گا۔

یہاں تک کہ فاروقِ اعظمؓ کو بھی بحث کے بعد حق واضح ہوگیا، اور اجتماعی قوتوں سے مرتدین پر جہاد کیا گیا، اور ان میں سے بہت سے تہ تیغ کردیئے گئے۔

(تاریخ الخلفاء، ص:۵۶)

۲:......حوالیٔ مدینہ سے فارغ ہوکر صدیق اکبرؓ مسیلمہ کذّاب کی طرف متوجہ ہوئے جو نبوت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے باجماع صحابہ مرتد قرار دیا گیا تھا، چنانچہ ایک لشکر حضرت خالدؓ کی سرکردگی میں اس کی طرف روانہ کیا، جس نے مسیلمہ کذّاب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (فتح الباری وتاریخ الخلفاء ص:۵۶)

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر مدعی نبوت مرتد ہے، اگرچہ وہ کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرے، یا کوئی تاویل کرے، کیونکہ مسیلمہ کذّاب جس کو صدیق اکبر نے قتل کرایا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کو منکر نہیں تھا، بلکہ اپنی اذان میں اشهد ان محمدا رسول الله کا اعلان کرتا تھا، (تاریخ طبری ج:۱) پھر جس جرم میں اس کو مرتد واجب القتل سمجھا گیا، وہ صرف

یہ تھا کہ آپ کی نبوت کو ماننے کے باوجود اپنی نبوت کا بھی دعویٰ کرتا تھا جیسا کہ مرزا صاحب کا بعینہٖ یہی حال ہے۔

۳:......پھر ۱۲ھ ہجری میں بحرین میں کچھ لوگ مرتد ہو گئے تو ان کے قتل کے لئے علاء ابن الحضرمی کو روانہ کیا۔ (تاریخ الخلفاء ص:۵۶)

۴:......اسی طرح عمان میں بعض لوگ مرتد ہو گئے تو آپ نے ان کے قتل کے لئے عکرمہ ابن ابی جہل کو حکم فرمایا۔ (تاریخ الخلفاء:۵۶)

۵:......اہلِ نجیر میں سے چند لوگ اسلام سے پھرے، تو صدیق اکبرؓ نے بعض مہاجرین کو ان کے قتل کے لئے بھیجا۔ (تاریخ الخلفاء ص:۵۶)

۶:......اسی طرح زیاد بن لبید انصاری کو ایک مرتد جماعت کے قتل کے لئے حکم فرمایا۔ (تاریخ الخلفاء ص:۵۶)

یہ تمام واقعات وہ ہیں جو اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ اور افضل الناس بعد الانبیاء کے حکم سے ہوئے اور صحابۂ کرام کے ہاتھوں ان کا ظہور ہوا، صحابہ کی جماعت تھی، جو کسی خلافِ شرع حکم کو دیکھنا موت سے زیادہ ناگوار سمجھتے تھے، کیسے ہو سکتا تھا کہ اگر معاذ اللہ صدیق اکبرؓ بھی کسی خلافِ شریعت حکم کا ارادہ کرتے تو تمام صحابہ ان کی اطاعت کر لیتے اور خونِ ناحق میں اپنے ہاتھ رنگتے، لہٰذا یہ واقعات اور اسی طرح باقی تمام خلفائے راشدین کے واقعات تنہا صدیق اکبرؓ وغیرہ کا عمل نہیں بلکہ تمام صحابۂ کرام کا اجماعی فتویٰ ہے کہ شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔

خلیفۂ ثانی فاروق اعظمؓ اور قتلِ مرتد

۱:......آپ معلوم کر چکے ہیں کہ مذکور الصدر تمام واقعات میں فاروق اعظمؓ

بھی صدیقِ اکبرؓ کے ساتھ اور شریک مشورہ تھے۔

۲:...... فاروق اعظمؓ نے چند مرتدین کے متعلق اپنے لوگوں سے کہا کہ ان کو تین روز تک اسلام کی طرف بلانا چاہئے اور روزانہ ان کو ایک ایک روٹی دی جائے اگر تین روز تک نصیحت کے بعد بھی ارتداد سے توبہ نہ کریں، تو قتل کر دیا جائے۔

(شفاء قاضی عیاض)

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور قتلِ مرتد

۱:...... جو احادیث ہم اوپر نقل کر کے آئے ہیں ان میں گزر چکا ہے کہ حضرت عثمانؓ قتلِ مرتد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سمجھتے تھے، اور لوگوں سے اس کی تصدیق کراتے تھے۔

۲:...... کنز العمال میں بحوالہ بیہقی نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں:

من كفر بعد ايمانه طائعا فانه يقتل (کنز ص:۷۹، ج:۱)

جو شخص ایمان کے بعد اپنی خوشی سے کافر ہو جاوے اس کو قتل کیا جاوے۔

۳:...... سلیمان ابن موسیٰ نے حضرت عثمانؓ کا دائمی طرز عمل یہی نقل کیا ہے کہ مرتد کو تین مرتبہ توبہ کرنے کے لئے فرماتے تھے اگر قبول نہ کرتا تو قتل کر دیتے تھے،

(کنز العمال ص:۷۹، ج:۱)

۴:...... امام الحدیث عبد الرزاق نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتد حضرت ذی النورین کی خدمت میں لایا گیا آپ نے اس کو تین مرتبہ توبہ کی طرف بلایا اس نے قبول نہ کیا، تو قتل کر دیا۔ (کنز العمال، ص:۷۹، ج:۱)

۵:...... حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ اہل عراق میں سے ایک مرتد

جماعت کو گرفتار کیا اور ان کی سزا کے بارے میں مشورہ کے لئے حضرت عثمان کی خدمت میں خط لکھا آپ نے جواب میں تحریر فرمایا:

اعرض عليهم دين الحق فان قبلوا فخل سبيلهم و ان لم يقبلوا فاقتلهم (من الكنز)

ان پر دین حق پیش کرو اگر قبول کر لیں تو ان کو چھوڑ دو ورنہ قتل کر دو۔

(کنز)

خلیفۂ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور قتل مرتد

۱:......امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بعض مرتدین کو قتل کیا۔ (بخاری)

۲:......حضرت ابو الطفیلؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بنی ناجیہ کے قتال کے لئے لشکر بھیجا تو اس میں میں بھی شریک تھا، ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں میں تین فرقے ہیں، بعض پہلے نصاریٰ تھے، پھر مسلمان ہوئے، اور اسی پر ثابت قدم رہے۔ اور بعض نصاریٰ تھے، اور ہمیشہ اسی مذہب پر رہے، اور بعض لوگ وہ تھے، کہ پہلے نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے، اور پھر نصرانیت کی طرف لوٹ گئے، ہمارے امیر نے اس تیسرے فرقے سے کہا کہ اپنے خیال سے توبہ کرو، اور پھر مسلمان ہو جاؤ۔ انھوں نے انکار کیا تو امیر نے ہمیں حکم دیا، ہم سب ان پر ٹوٹ پڑے، اور مردوں کو قتل اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔

۳:......عبد الملک بن عمیرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مستورد ابن قبیصہ گرفتار کر کے لایا گیا، جو اسلام سے مرتد ہو کر نصرانی ہو گیا تھا، آپ نے حکم دیا، کہ ٹھوکروں میں مسل کر مار ڈالا جاوے۔ یہ ان

خلفائے راشدین کا عمل ہے جن کی اقتداء کے لئے تمام امت اسلامیہ مامور ہے اور جن کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین (مشکوٰۃ) تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کی اقتداء کرو۔

کیا قتل مرتد کے لئے محاربہ اور سلطنت کا مقابلہ شرط ہے؟

ہماری مذکورہ بالا تحریر میں اس کا کافی جواب آچکا ہے کیونکہ اول تو جو احادیث سزائے مرتد کے بارے میں نقل کی گئی ہیں، ان میں کوئی محاربہ اور مقابلہ کی شرط نہیں، بلکہ عموماً مرتد کے قتل کا اعلان ہے، اس کے بعد جن لوگوں کو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے سزائے ارتداد میں قتل کیا ہے، ان میں دونوں قسم کے آدمی ہیں وہ بھی جو مرتد ہونے کے بعد محاربہ کے لئے کمر بستہ ہوئے، اور وہ بھی جن سے کسی قسم کا ارادہ فساد یا محاربہ کا ظاہر نہیں ہوا۔

وہ لوگ جو قتل مرتد کو یہ کہہ کر اڑا دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں صرف انھیں مرتدین کے قتل کا حکم ہے جو محاربہ اور سلطنت کے مقابلہ پر آمادہ ہوں، وہ آنکھیں کھولیں، اور احادیث اور عمل سلف پر نظر ڈالیں کہ وہ کیا بتلا رہے ہیں۔

کیا سزائے ارتداد میں سنگسار بھی کیا جا سکتا ہے؟

مذکورہ الصدر احادیث اور واقعات سلف نے اس سوال کو بھی طے کر دیا ہے کیونکہ ان سے واضح ہو چکا ہے کہ اصل سزائے ارتداد قتل ہے، اور ہم بحوالۂ امام راغب اصفہانی اور دیگر اہل لغت یہ نقل کر چکے ہیں، کہ قتل کے معنی جان لینا ہے خواہ تلوار سے یا سنگساری سے یا کسی اور ذریعہ سے لہٰذا جب سزائے قتل مرتد کے لئے ثابت ہو گئی، تو امامِ وقت کو اختیار ہے کہ مصالح وقت کو دیکھ کر جس صورت سے

چاہے قتل کرے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا واقعہ ابھی نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایک مرتد کو زیادہ سرکش سمجھ کر پاؤں میں مسل کر مارنے کا حکم کر دیا۔

خلفاء راشدین کے بعد
باقی خلفاء اسلام اور قتلِ مرتد

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

نے اپنے زمانہ خلافت میں مختار ابن ابی عبید کو اسی جرم میں قتل کیا تھا، جو آج مرزا صاحب کے لئے معراج ترقی ہے، یعنی اس کے دعوے نبوت کو ارتداد قرار دے کر قتل کیا گیا ہے۔ (فتح الباری، ص:۴۵۵ ج:۶ تاریخ الخلفاء ص:۱۵۰)

خالد قسری

نے اپنے زمانۂ حکومت میں جعد ابن درہم کو ارتداد ہی کی سزا میں قتل کیا۔ (فتح الباری ص:۲۳۹، ج:۱۲) عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ خلافت میں حارث نامی ایک شخص کو اسی جرم میں قتل کیا جو آج مرزا صاحب کا دعویٰ اور ان کی امت کا مذہب ہے (یعنی دعویٰ نبوت) (شفاء قاضی عیاض ص:۲۸۱)

خلیفۂ منصور

نے اپنے عہد خلافت میں فرقہ باطنیہ کے مرتدین کو قتل کیا۔

(فتح الباری، ص:۲۳۹، ج:۱۲)

یہ بھی یاد رہے کہ فرقہ باطنیہ کا بانی بھی ابتداء میں ایک صوفی مزاج آدمی تھا،

مسلمانوں کی عموماً اور اہل بیت کی خصوصاً بہت ہمدردی کا دعویٰ کرتا تھا، شروع میں مرزا صاحب کی طرح لوگوں پر تصوف کا رنگ ظاہر کیا، اور کچھ لوگ معتقد ہو گئے، تو نبوت کا دعوے دار بن گیا، اور اسی جرم میں واجب القتل سمجھا گیا۔

خلیفۂ مہدی

منصور کے بعد مہدی تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے، تو باقی ماندہ باطنیہ کے استیصال کی فکر کی، اور ان میں سے بہت سے آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔

(فتح الباری)

خلیفۂ معتصم باللہ

نے اپنے عہدِ خلافت میں ابن ابی الغراقیر کو اس لئے قتل کیا کہ وہ اسلام سے مرتد ہوا تھا۔ (شفاء ص:۲۸۲)

قاضی عیاضؒ نے شفاء میں بہت سے مرتدین کے قتل کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: **و فعل ذالک غیر واحد من الخلفاء و الملوک باشباههم و اجمع علماء وقتهم علی صواب فعلهم**۔ (شفاء مصری ص:۲۸۲) اور بہت سے خلفاء اور بادشاہوں نے مرتدین کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا ہے اور ان کے زمانہ کے علماء نے ان کے فعل کے موافق شرع ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ (شفاء مصری)

ہمیں اس مختصر گزارش میں تمام خلفاء کی تاریخ اور ان کے قتلِ مرتد کے واقعات کا استیعاب کرنا نہیں ہے، بلکہ چند خلفاء اسلام کے طرز عمل کا نمونہ پیش کر کے ایڈیٹر پیغام صلح کو یہ دکھلا دینا ہے کہ آج نعمت اللہ مرزائی کے قتل پر کسی وجہ سے جو طرح طرح کے الزام دولتِ کابل پر لگائے جا رہے ہیں وہ درحقیقت نہ صرف تمام خلفائے اسلام اور اسلامی سیاست پر عیب لگانا ہے، بلکہ خلفائے راشدین کی سنت پر

بیہودہ اعتراض اور احکامِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ پر الزام ہے۔ (نعوذ باللہ منہ)

ائمہ اربعہ اور قتلِ مرتد

ایڈیٹر پیغامِ صلح نے جہاں تمام احکامِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ اور تعامل سلف کو پس پشت ڈال کر قتل مرتد کا انکار کر دیا، تو کیا عجب ہے کہ اس نے فقہ حنفی کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا اور نہایت وقاحت کے ساتھ کہہ دیا کہ فقہ حنفیہ میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی، ہم یہ دکھلا دینا چاہتے ہیں کہ مرتد کے لئے سزائے قتل نہ فقط فقہ حنفی کا متفق علیہ مسئلہ ہے بلکہ کل فقہائے امت اور بالخصوص ائمہ اربعہ کا اجماعی حکم ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ

دیکھو جامع صغیر مصنفہ امام محمد ص: ۸۷

و یعرض علی المرتد حرا کان او عبدا الاسلام فان ابی قتل۔

مرتد پر اسلام پیش کیا جائے، خواہ وہ غلام ہو یا آزاد پس اگر انکار کرے تو قتل کر دیا جائے۔

اور ملاحظہ ہو مؤطا امام محمد ص: ۲۸۲:

قال محمد ان شاء الامام اخر المرتد ثلاثا ان طمع فی توبته او ساله عن ذالک المرتد و ان لم یطمع فی ذالک و لم یساله المرتد فقتله فلابأس به (مؤطا امام محمد)

امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر امام کو یہ توقع ہو کہ یہ مرتد توبہ کر لے گا، یا خود مرتد مہلت طلب کرے، تو امام کو اختیار ہے، کہ تین روز تک اس کے قتل

کو مؤخر کر دے، اور اگر نہ اس کو توبہ کی توقع ہو اور نہ خود مہلت طلب کرے تو ایسی صورت میں اگر امام اس کو بلا مہلت دیئے قتل کر دے تو مضائقہ نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک مرتد کے معاملہ میں وہی قول قابل عمل ہے جو فاروق اعظمؓ نے فرمایا یعنی مرتد کو تین روز مہلت دے کر توبہ کی طرف بلایا جاوے، اگر توبہ نہ کرے، تو قتل کر دیا جاوے۔ (شفاء وغیرہ)

امام شافعیؒ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں اول یہ کہ مرتد کو کوئی مہلت نہ دی جائے بلکہ اگر وہ وہیں توبہ نہ کرے، تو فوراً قتل کر دیا جائے، اور دوسری یہ کہ تین دن کی مہلت دینے کے بعد توبہ نہ کرنے کی صورت میں قتل کر دیا جاوے۔

(شفاء ص: ۲۲۸)

امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا جاتا ہے۔

اس قدر گزارش کے بعد ہمارے خیال میں کسی مسلمان کو جس طرح اس مسئلہ کے حکم میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اسی طرح اس میں بھی شبہ نہیں رہتا کہ مرزائی حضرات قطعیات اسلامیہ سے انکار کر دینے اور بے حیائی کے ساتھ نصوص شرعیہ کو ٹھکرانے کو کوئی بڑی بات نہیں سمجھتے۔ **و یحسبونہ ھینا و ھو عند اللہ عظیم۔**

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مدرس دار العلوم دیوبند

ربیع الاول ۱۳۴۰ھ

٨٦

رجم کی سزا
قرآن وسنت کی روشنی میں

تاریخ تالیف ________

مقامِ تالیف ________ جامعہ دارالعلوم کراچی

اشاعت اول ۱۴۰۱ھ مکتبہ دارالعلوم کراچی

یہ مقالہ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' جامعہ پنجاب کے لئے لکھا گیا تھا جو بعد میں علیحدہ بھی شائع ہوا۔

پیش لفظ

شادی شدہ زانی کے لئے سنگساری کا حکم اسلام کے اُن احکام میں سے ہے جنہیں تقریباً ہر مسلمان ایک اسلامی حکم کی حیثیت سے جانتا ہے، چودہ سو سال سے امت اسے ایک اجماعی مسلے کے طور پر مانتی آئی ہے، لیکن ہمارے زمانے میں بعض لوگ مغربی نظریات سے مرعوب ہو کر اسلام میں کتر بیونت کی کوشش میں رہتے ہیں، اس طبقے کے بعض افراد نے اس غرض کے لئے حدیث وسنت کی حجیت سے انکار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، سنگساری کی سزا پر مغربی اعتراضات کا خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے کے بجائے اس شکست خوردہ ذہنیت نے مغرب کے سامنے یہ معذرت شروع کر دی کہ سنگساری کا حکم اسلام میں نہیں ہے۔ یہ مسئلہ منکرین حدیث نے اٹھایا تھا، اور اب پھر بعض حلقوں میں بحث ومباحثہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔

اس موضوع پر والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک علمی وتحقیقی مقالہ تحریر فرمایا تھا جو ''دائرۂ معارف اسلامیہ جامعہ پنجاب'' میں شائع ہو چکا ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے یہ مقالہ علیحدہ شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس میں طالبانِ حق کی تسکین کا وافر سامان ہوگا۔ اللہ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائیں، اور اس مقالے کو نافع ومفید بنائیں۔ آمین

احقر

محمد تقی عثمانی

دار العلوم کراچی ۱۴

۶ رجمادی الثانیہ ۱۴۰۱ھ

باسمہٖ تعالیٰ

رجم کی سزا
قرآن وسنّت کی روشنی میں

قرآن کریم میں یہ لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے:

پتھر مارنے:

وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱:۹۱)

لَاَرْجُمَنَّكَ (۱۹:۴۶)

يَرْجُمُوْكُمْ (۱۸:۲۰)

مزید دیکھئے ۳۶:۱۸و۴۴:۲۰و ۶۷:۵ و ۲۶:۱۱۶) اور لعنت کرنا، دھتکارنا (دیکھئے ۱۵:۳۴و۳۸:۷۷و۸۱:۲۵و۳:۳۶) انکل پچوں تخمینہ لگانا (۱۸:۲۲) اور تہمت لگانا (۱۹:۴۶)۔

فقہی اصطلاح میں ''رجم'' اس حدّ (شرعی سزا) کو کہا جاتا ہے جو مُحْصَن (تشریح آگے آئے گی) زانی کے لئے مقرر کی گئی ہے اور جس میں مجرم کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے، ذیل میں اسی سزا کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائے گی۔

شرعی سزا کے طور پر ''رجم'' کا تذکرہ سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ملتا ہے؛ موجودہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ موسوی شریعت میں ''رجم''، یعنی سنگسار کرکے ہلاک کر دینا متعدد جرائم کی سزا تھی:

(۱)......زنا کی (احبار،۲۰:۱۰واستثنا،۲۲:۲۱تا۲۷)۔

(۲)......شرک اور بت پرستی کی دعوت دینے کی (استثنا،۱۳:۱۰و۱۷:۶)

(۳)...... بتوں کے نام پر نذر کرنے کی (احبار،۲:۲۰)

(۴)...... ماں باپ کی نافرمانی کرنے کی (استثنا،۲۱:۲۱)

(۵)...... خدا کے نام پر لعنت کرنے کی (احبار،۲۴:۱۶ ا۔سلاطین،باب۲۱)

(۶)...... حضرت یوشع علیہ السلام، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے، کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو مال غنیمت میں خیانت کرنے کی بنا پر بھی سنگسار کیا تھا (یشوع،۷:۱۶تا۲۶)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں ''رجم'' کی سزا صرف اس زناکار کے لئے مخصوص کر دی گئی جو شادی شدہ ہو اور جس میں ''محصن'' کی وہ شرائط پائی جاتی ہوں جن کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور اس سزا کا اصل ثبوت ان احادیث سے ہوا ہے جو معنیً متواتر ہیں۔

(آلوسی: روح المعانی،۱۸: ۹،۷،ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ،مصر)۔

قرآن مجید میں صراحۃً اس سزا کا ذکر نہیں ہے، البتہ سورۃ المائدہ کی آیات

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ (تا) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵:۴۱تا۴۴)

میں اس سزا کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ ان آیات کے مستند شان نزول کے مطابق ان آیات میں ''حُكْمُ اللّٰهِ'' اور ''مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' مراد زانی کو رجم کی سزا دینے کا حکم ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات ایک ایسے یہودی کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جس نے زنا کر لیا تھا اور یہودی اس کا فیصلہ اس خیال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے تھے کہ اگر آپ نے رجم کے

علاوہ کوئی اور فیصلہ کیا تو اس کو مان لیں گے اور اگر رجم کا فیصلہ کیا تو اس سے انکار کر دیں گے۔ آیات مذکورہ میں ﴿ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ﴾ سے یہی مراد ہے۔ پھر آپ نے رجم کا فیصلہ فرمایا اور ان پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ خود تورات میں بھی رجم ہی کا حکم مذکور ہے۔ اس موقع پر علمائے یہود نے یہ اعتراف بھی کیا کہ تورات میں زنا کی اصل سزا رجم ہی تھی، پھر جب یہودی شرفا میں زنا کا رواج عام ہوا تو ہم نے شرفا کو اس سزا سے مستثنیٰ کرنا شروع کر دیا؛ بعد میں اس تفریق کو ختم کرنے کے لئے ہم نے رجم کی سزا کو بالکل ہی موقوف کر دیا اور اس کی جگہ منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کی سزا مقرر کر دی (دیکھئے مسلم: الصحیح، کتاب الحدود ،۲: ۷۰، مطبوعہ کراچی، وابن کثیر: تفسیر، ۲: ۵۷ تا ۶۰ مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر ۱۳۵۶ھ)

لہٰذا صاف بات یہ ہے کہ رجم کا ثبوت ان احادیث سے ہوا ہے جو معنیً متواتر ہیں اور قرآن مجید میں اس حکم کا مذکور نہ ہونا اس کے عدم ثبوت کی دلیل نہیں، جس طرح نمازوں کے اوقات اور ان کی رکعات کی تعداد قرآن مجید میں موجود نہیں، لیکن متواتر احادیث اور مسلسل تعامل کی وجہ سے ان کا ثبوت ناقابل انکار ہے، اسی طرح رجم کا ثبوت بھی متواتر احادیث اور اجماعی تعامل کی بنا پر ہوا ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر زمانہ دراز گزر جائے تو کوئی کہنے والا یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے؛ پھر کہیں لوگ ایسے فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ نہ ہو جائیں جو اللہ نے نازل کیا تھا؛ خوب سن لو کہ رجم کا حکم اس شخص کے لئے حق ہے جو محصن ہونے کی حالت میں زنا کرے جب کہ اس پر گواہیاں قائم ہو جائیں، یا حمل ثابت ہو جائے یا ملزم خود اعتراف کرے۔

(صحیح البخاری: ۲: ۱۰۰۷، اصح المطابع دہلی ۱۳۵۷ھ)

حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو رجم کرنے کے بعد فرمایا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق رجم کیا۔" (البخاری الصحیح ۱: ۲، ۶: ۱۰۰، باب رجم المحصن)۔

جن صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم یا عمل روایت کیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

- ......حضرت عمرؓ بن الخطاب
- ......حضرت علیؓ بن ابی طالب
- ......حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ
- ......حضرت جابرؓ بن عبداللہ
- ......حضرت ابو ہریرہؓ
- ......حضرت عائشہؓ
- ......حضرت عبداللہ بن عمرؓ
- ......حضرت عبداللہ بن عباسؓ
- ......حضرت زید بن خالدؓ

ان سب کی روایات البخاری: الصحیح ۱: ۲، ۶: ۱۰۰ تا ۱۰۱۱ میں موجود ہیں)۔

- ......عبادہؓ بن صامت
- ......سلمہؓ بن المحبق
- ......ابو برزہؓ
- ......ہزالؓ،
- ......جابرؓ بن سمرہ،
- ......لجلاجؓ،
- ......ابوبکر صدیقؓ،
- ......بریدہؓ،

- ......ابوذر غفاریؓ،
- ......نصرؓ بن دھر اسلمی،
- ......عمرانؓ بن حصین،
- ......ابوبکرہؓ،
- ......ابوسعید خدریؓ،
- ......نعمانؓ بن بشیر،
- ......براءؓ بن عازب

(ان کی روایات مسند احمد میں مروی ہیں، دیکھئے الفتح الربانی، ۱۶:۸۱تا۱۰۵، مصر ۱۳۷۱ھ) ابیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن مسعود (البیہقی: السنن الکبریٰ، ۸:۲۱۱ و ۲۱۳ دائرۃ المعارف، دکن، ۱۳۵۴ھ) قبیصہؓ بن حریث، انسؓ بن مالک، عجماءؓ، سہلؓ بن سعد، عبداللہؓ بن الحارث بن الجزء (الہیثمی: مجمع الزوائد، ۶:۲۶۴ و ۲۶۵ و ۲۶۸ و ۲۷۱، دار الکتاب بیروت ۱۹۶۷ء) وائلؓ بن حجر محمدؓ بن محمد (جمع الفوائد، ۱:۲۵۷، المدینۃ المنورہ ۱۳۸۱ھ) عثمانؓ بن عفان اور ابوامامہؓ بن سہل بن حنیف (مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۰۱، اصح المطابع کراچی) رضی اللہ عنہم اجمعین۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں شادی شدہ زنا کرنے والوں پر رجم کی سزا عائد کرنے کے متعدد واقعات پیش آئے جن میں زیادہ مشہور واقعات چار ہیں: ایک حضرت ماعزؓ ابن مالک اسلمی کا، دوسرے بنو غامد کی ایک عورت کا، تیسرے ایک اعرابی کی بیوی کا جس کے رجم کے لئے آپؐ نے حضرت اُنیس اسلمی کو بھیجا تھا، اور چوتھے دو یہودیوں کا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ تمام واقعات صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ پہلے تینوں واقعات میں مجرموں نے خود زنا کا واضح اعتراف کیا تھا۔ گواہوں کے ذریعے رجم کا کوئی واقعہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں کے درمیان

پیش نہیں آیا۔البتہ یہودیوں کا رجم گواہوں کی بنا پر ہوا تھا (ابو داؤد: السنن، ۲: ۶۱۲، اصح المطابع، کراچی)۔

قرآن مجید کی آیت ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲٤[النور]:۲) ﴾ یعنی زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ) میں جو حکم مذکور ہے وہ مذکورہ احادیث متواترہ کی بنا پر باجماع صرف غیر شادی شدہ زانی کا حکم ہے اور یہ خیال درست نہیں ہے کہ رجم کے واقعات اس آیت کے نزول سے پہلے کے ہیں اور اس آیت نے رجم کے حکم کو منسوخ کر کے ہر قسم کے زانی کے لئے کوڑوں کی سزا مقرر کر دی ہے، اس لئے کہ مضبوط دلائل سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد رجم پر عمل فرمایا ہے، یہ آیت سورۃ النور کی ہے جو واقعۂ افک (۴ھ یا ۵ھ یا ۶ھ) میں نازل ہوئی تھی، لہذا اس کا نزول زیادہ سے زیادہ ۶ھ میں ہوا ہے (ابن حجر: فتح الباری، ۱۲: ۱۰۰، مصر ۱۳۴۸ھ) اور رجم کے تقریباً تمام واقعات ۶ھ کے بعد کے ہیں، اس لئے کہ متعدد ایسے صحابہ نے رجم کے واقعات کا مشاہدہ کیا ہے جو ۶ھ کے بعد اسلام لائے تھے، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ۔ صحیح بخاری میں تصریح ہے کہ عسیف والے واقعہ میں وہ خود موجود تھے، چنانچہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں: ﴿ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وسلم ﴾ (البخاری: الصحیح، باب الاعتراف بالزنا، ۲: ۱۰۰۸، اصح المطابع، دہلی ۱۳۵۷ھ)، حالانکہ حضرت ابوہریرہؓ خیبر کے موقعہ پر (۷ھ میں) اسلام لائے ہیں۔اسی طرح البزار اور الطبرانیؒ کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن الحارث بن جزء یہودیوں کے رجم میں شریک تھے، فرماتے ہیں: ﴿ فَكُنْتُ فِيْ مَنْ رجمهما ﴾ (الہیثمی: مجمع الزوائد، ۶: ۲۷۱، دار الکتاب، بیروت ۱۹۶۷ء)؛ اور وہ اپنے والد کے ساتھ فتح مکہ (۸ھ) کے بعد اسلام لائے تھے (دیکھئے فتح الباری، ۱۲: ۱۴۴، باب احکام اهل الذمة وَاِحْصَانِهِمْ اِذَا زَنَوْا،

المطبعة البہتیہ، مصر ۱۳۴۸ھ) ادھر احمد: مسند اور الطبرانی: معجم میں حضرت ابن عباسؓ انہیں یہودیوں کا واقعہ روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں ﴿ فَكَانَ مِمَّا صَنَعَ اللّٰهُ لِرَسُوْلِهٖ صلی اللہ علیہ وَآلِهٖ وسلم فِيْ تَحْقِيْقِ الزِّنَا مِنْهُمَا ﴾ (مجمع الزوائد، ۶: ۲۷۱)، یعنی اللہ نے اپنے رسولؐ کے لئے زنا کے حکم کی تحقیق ان یہودیوں کے ذریعہ کرائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا واقعہ رجم کا سب سے پہلا واقعہ تھا؛ باقی تمام واقعات اس کے بعد ہوئے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رجم کے تمام واقعات فتح مکہ کے بعد ہوئے ہیں، یعنی سورۃ النور نازل ہونے کے کم از کم دو سال بعد، لہٰذا اگر سورۃ النور کا حکم ہر قسم کے زانی کے لئے ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نزول کے بعد کسی کو رجم نہ فرماتے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجم فرمانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سورۃ النور کا حکم صرف غیر محصن زانی کے لئے تھا اور محصن زانی کی شرعی سزا رجم ہی تھی۔ اسی وجہ سے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم مسلمانوں میں اجماعی اور غیر مختلف فیہ رہا ہے، علامہ الآلوسی لکھتے ہیں: ''صحابۂ کرام، اسلاف، علمائے امت اور ائمۂ مسلمین کا اس پر اجماع ہے کہ زانی محصن کو سنگسار کیا جائے گا اور خوارج کا رجم سے انکار کرنا باطل ہے۔'' (روح المعانی، ۱۸: ۷۸ و ۷۹، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر)؛ علامہ کمال الدین ابن الہمام لکھتے ہیں: رجم پر صحابہؓ اور تمام پچھلے علمائے اسلام کا اجماع ہے اور خوارج کا رجم کرنے سے انکار کرنا باطل ہے، اس لئے کہ اگر وہ اجماع صحابہ کی حجیت کا انکار کریں تو یہ جہل مرکب ہے اور اگر وہ خبر واحد کی حجیت سے انکار کرتے ہوئے یہ کہیں رجم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں تو علاوہ اس کے کہ خبر واحد کی حجیت سے انکار دلائل کی رو سے باطل ہے یہ مسئلہ خبر واحد سے متعلق ہی نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجم کا ثبوت

معنیٰ ایسا ہی متواتر ہے جیسے حضرت علی کی شجاعت اور حاتم طائی کی سخاوت۔ رہیں اخبار آحاد، سو وہ صرف رجم کی صورتوں اور خصوصیات کی تفصیل سے متعلق ہیں۔ جہاں تک رجم کے اصل حکم کا تعلق ہے، اس کے ثبوت میں کوئی شک نہیں۔۔۔اور خوارج بھی عام مسلمانوں کی طرح متواتر معنوی پر عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن چونکہ وہ صحابہ کرامؓ اور عام مسلمانوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے اور مسلمان اہل علم اور راویوں سے انہوں نے تعلق نہیں رکھا، اس لئے وہ بہت سی جہالتوں میں مبتلا ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے سامنے رجم پر یہ اعتراض کیا کہ اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے تو حضرت عمرؒ نے ان سے کہا کہ پھر رکعات نماز کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقداریں کہاں سے ثابت ہوئیں؟ انہوں نے کہا کہ حضور اور مسلمانوں کے عمل سے۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے فرمایا: ''رجم بھی اسی طرح ثابت ہوا۔'' (ابن الہمام فتح القدیر، ۴: ۱۲۱ و ۱۲۲، بولاق ۱۳۱۶ھ)۔

پھر اس بات پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ رجم کی سزا صرف اس زانی کے لئے ہے جس میں احصان کی شرائط پائی جاتی ہوں، لیکن ان شرائط کی تفصیل میں تھوڑا سا اختلاف ہے: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک رجم کے حکم میں محصن اس شخص کو کہیں گے جو مسلمان ہو، آزاد ہو، عاقل و بالغ ہو اور کسی مسلمان، عاقل، بالغ اور آزاد عورت کے ساتھ نکاح صحیح کے ذریعہ تعلقات زناشوئی قائم کر چکا ہو۔ ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو گی تو اسے محصن نہیں کہا جائے گا اور اگر وہ زنا کرلے تو اس کی سزا رجم کے بجائے سو کوڑے ہو گی۔ (ابن نجیم: البحر الرائق، ۵: ۱۱، الطبعۃ العلمیہ، مصر) امام مالکؒ کے نزدیک بھی احصان کی یہی شرائط ہیں، البتہ ان کے نزدیک ایک شرط اور ہے، اور وہ یہ کہ اس نے اپنی منکوحہ سے خلوت صحیحہ کی ہو، لہٰذا حیض یا روزے کی حالت میں خلوت سے احصان متحقق نہیں ہوگا (ابن رُشد: بدایۃ المجتہد، ۲: ۴۰۷، المطبعۃ الازہریہ

،مصر ۱۳۸۹ھ)۔ امام شافعیؒ کے نزدیک احصان کے لئے نہ مجرم کا مسلمان ہونا شرط ہے اور نہ اس کی منکوحہ کا مسلمان یا آزاد ہونا (الشافعی: کتاب الام،۶:۱۵۴، المطبعۃ الازھریہ، مصر ۱۳۸۱ھ)۔ امام احمدؒ کے نزدیک مسلمان ہونا تو شرط نہیں، لیکن اس کی منکوحہ کا آزاد ہونا ضروری ہے (ابن قدامہ: المقنع،۳:۴۵۲و۴۵۳، المطبعۃ السّلفیہ، الروضہ،۱۳۸۲ھ)۔

یہ بھی اجماعی مسئلہ ہے کہ ایسے محصن شخص کا صرف وہی زنا رجم کا مستوجب ہے جس میں حلال ہونے کو کوئی شبہ نہ ہو، لہذا جہاں نکاح کا شبہ بھی پایا جاتا ہو وہاں رجم نہیں ہوگا (ابن رشد: بدایۃ المجتہد،۲:۴۶۷)۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ زنا کا ثبوت دو طریقوں سے ہوسکتا ہے، ایک مجرم کے اعتراف واقرار سے، دوسرے گواہوں سے۔ جہاں تک اعتراف کا تعلق ہے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک میں یہ ضروری ہے کہ یہ اقرار چار مرتبہ ہو، اور اقرار کرنے والا ہر مرتبہ اپنی جگہ بدل کر اقرار کرے؛ امام احمدؒ کے نزدیک چار مرتبہ ہونا تو ضروری ہے مگر جگہ بدلنا ضروری نہیں۔ (ابن الہمام: فتح القدیر،۴:۱۱۷)۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک صرف ایک مرتبہ اعتراف کر لینا بھی کافی ہے (بدایۃ المجتہد،۲:۴۷۳)۔ گواہوں کے بارے میں اس پر اتفاق ہے کہ کم از کم چار گواہ ہونے ضروری ہیں جنہوں نے اپنی آنکھ سے مجرم کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہو اور صریح الفاظ میں بغیر کسی کنایہ کے اس کی گواہی دی ہو (حوالۂ سابق)۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ قاضی ان پر جرح کرے اور ان کی عدالت وصداقت کی مکمل تحقیق ہو جانے پر رجم کا حکم دے (فتح القدیر۴:۱۱۵،۱۱۶)۔

رجم کا طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو کسی کھلی جگہ میں لے جایا جائے جہاں عام لوگ بھی موجود ہوں۔ اگر مجرم عورت ہو تو اس کے لئے گڑھا کھود کر اس کو اس میں کھڑا کر دینا مناسب ہے، پھر اگر زنا کا ثبوت گواہوں سے ہوا ہے تو پتھر مارنے کی ابتداء گواہ کریں

گے، اور اگر اعتراف سے ہوا ہے تو ابتداء امام المسلمین کرے گا، پھر تمام حاضرین رجم میں حصہ لیں گے یہاں تک کہ مجرم کی موت واقع ہو جائے (فتح القدیر، ۴: ۱۲۳ و ۱۲۴)۔

اسلام کا اصل منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رجم کی سزا کم سے کم جاری ہو، لیکن جب جاری ہو تو سالہا سال کے لئے سامان عبرت بن جائے اور اس کی دہشت جرم کی لذت پر غالب آ جائے۔ چنانچہ اول تو معاشرہ میں عفت وعصمت عام کرنے کے لئے ایسے احکام وضع کئے گئے ہیں جن کی موجودگی میں زنا کا صدور مشکل سے مشکل تر ہو جائے، پھر قابل رجم زنا کے ثبوت کے لئے شرائط انتہائی سخت رکھی گئی ہیں چار قابل اعتماد گواہوں کا بغیر کسی کنایہ کے صریح الفاظ میں چشم دید واقعہ کی گواہی دینا اسی وقت ممکن ہے جب کہ مجرم نے جرم کا ارتکاب کھلم کھلا کیا ہو، پھر اگر سزا جاری ہونے سے پہلے ان میں سے کوئی ایک گواہ بھی رجوع کرلے یا گواہی دیتے وقت ان میں کوئی معمولی اختلاف ہو جائے یا اقرار کی صورت میں مجرم کسی بھی وقت یہاں تک کہ سزا جاری ہونے کے دوران میں بھی، اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے (فتح القدیر، حوالۂ سابق)۔ اس کے علاوہ دوسرے معمولی معمولی شبہات کی بنا پر سزا کو ساقط کر دیا گیا ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ دوسری طرف اگر کسی پر زنا کا الزام لگانے کے بعد کوئی شخص قانونی شرائط کے مطابق اسے ثابت نہ کر سکے تو اس کیلئے اسّی کوڑوں کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ ان کڑی شرائط کے باوجود اگر کسی شخص سے قابل رجم زنا کا صدور ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کا یہ عضو سڑ چکا ہے جسے کاٹے بغیر جسم کی اصلاح ممکن نہیں، پھر اس عضو پر رحم کرنا پورے جسم پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

استاذ عبدالقادر عودہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگ آج زانی محصن کے لئے رجم کی سزا کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں، لیکن یہ محض ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے جس پر خود ان کے دلوں کو یقین نہیں۔ (اگر ان میں سے کسی شخص کے اپنے بہت قریبی حلقوں میں یہ واقعہ پیش آ جائے تو اس کا ردعمل شاید اس سے بھی سخت ہوگا)۔ اسلامی شریعت نے اس مسئلہ میں بھی اپنے دوسرے احکام کی طرح باریک بینی اور انصاف کی روش اختیار کی ہے۔۔۔ جو لوگ زانی کو قتل کرنے کے تصور سے گھبرا اٹھتے ہیں، اگر وہ واقعات کی دنیا کو دیکھیں تو ان پر حقیقت واضح ہو جائے اور انہیں پتہ چل جائے کہ اسلام نے زانی محصن کو سنگسار کرنے کا حکم دے کر کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے انسانی طبیعت مانوس نہ ہو۔ آج کے مروجہ قانون ہی کو دیکھ لیجئے، اگر زنا کے مجرموں میں سے کوئی ایک شادی شدہ ہو تو اس قانون کی رو سے اس کی سزا صرف قید ہے، اور اگر کوئی شادی شدہ نہ ہو تو جب تک جبر و اکراہ نہ ہو، کوئی سزا نہیں؛ یہ موجودہ قانون کا فیصلہ ہے، لیکن کیا لوگ قانون کے اس فیصلے پر راضی ہو گئے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ لوگ نہ اس پر راضی ہوئے ہیں اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ مروجہ قانون کو توڑتے ہیں اور زانی کو قتل کر کے اس سے انتقام لے کر رہتے ہیں، اور بعض مرتبہ یہ انتقامی قتل رجم سے بھی زیادہ شدید طریقوں سے کئے جاتے ہیں، سمندر میں ڈبو دینا، آگ میں جلا دینا، عضو عضو کاٹ ڈالنا اور ہڈیاں توڑ دینا۔ (بعض اوقات یہ سلسلۂ قتل نسلوں تک جاری رہتا ہے)۔ اس قسم کے واقعات روزمرہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم رجم کی سزا سے کیوں ڈریں؟ اس سزا کو اختیار کرنا ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ہے اور حقیقت کو تسلیم کرنا شجاعت اور فضیلت کی بات ہے۔'' (عبدالقادر عودہ: التشریع الجنائی الاسلامی، ۱: ۶۴۱ و ۶۴۲، مکتبہ دار العربیۃ، قاہرہ ۱۳۷۸ھ)

مآخذ:۔

(۱)......القرآن المجید: (۴[النسا] :۱۰۵)، (۵[المائدہ]:۴۲تا۴۴، (۲۴[النور]:۲)

(۲)......اور آیات کے تحت تمام تفاسیر، خصوصاً؛ ابن کثیر: تفسیر، المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ ۱۳۵۶ھ؛

(۳)......محمود الآلوسی: روح المعانی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر؛)

(۴)......القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، دارالکاتب العربی، ۱۳۸۷ھ؛)

(۵)......قاضی ثناء اللہ پانی پتی: تفسیر مظہری، ندوۃ المصنفین دھلی؛ [نیز اردو تفاسیر بالخصوص امیر علی: مواہب الرحمن؛ بذیل آیات متعلقہ] ؛ نیز قرآن مجید میں رجم کو ذکر نہ ہونے پر لطیف و دقیق بحث کے لئے دیکھئے

(۷)......علامہ انور شاہ کشمیری: مشکلات القرآن، ص۲۱۳، مطبوعہ مجلس علمی دہلی ۱۳۵۷ھ؛ رجم سے متعلق احادیث کا بڑا ذخیرہ صحاح ستہ کے علاوہ

(۸)......الفتح الربانی (تبویب مسند احمد)، جلد۱۶ مطبوعہ مصر ۱۳۷۱ھ؛

(۹)......البیہقی: السنن الکبریٰ، جلد۸، دائرۃ المعارف، دکن ۱۳۵۴ھ؛

(۱۰)......الہیثمی: مجمع الزوائد، جلد۶، دارالکتاب، بیروت ۱۹۶۷ء؛ احادیث رجم کی مفصل تشریح کے لئے

(۱۱)......ابن حجر: فتح الباری، جلد۱۲ مطبوعہ المطبعۃ البہیہ مصر بہترین ہے؛

(۱۲)......السیوطی: الاتقان ۲:۲۶ المطبعۃ الازہریۃ، مصر ۱۳۱۸ھ

(۱۳)......ابن امیر الحاج: التقریر والتعبیر ۳:۶۶ بولاق ۱۳۱۷ھ؛ نیز اصول فقہ اور

علوم القرآن کی کتب میں نسخ کی بحث دیکھئے؛ رجم کی فقہی تفصیلات کے لئے

(۱۴)......ابن رشد: بدایۃ المجتہد، جلد۲، المطبعۃ الازہریۃ، مصر ۱۳۸۹ھ؛

(۱۵)......ابن نجیم: البحر الرائق، جلد۵، المطبعۃ العلمیہ مصر؛

(۱۶)......ابن الہمام: فتح القدیر، جلد۴، بولاق ۱۳۱۶ھ ناگزیر ہیں۔ زنا کی مختلف صورتوں، ان کے احکام اور ان کی عقلی حکمتوں کے لئے دیکھئے:

(۱۷)......عبدالقادر عودہ: التشریع الجنائی الاسلامی، جلد اول، مکتبہ دار العروبہ، قاہرہ ۱۳۷۸ھ؛

(۱۸)......عبدالعزیز عامر: التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۷۷ھ؛

(۱۹)......احمد فتحی بہنسی: الجرائم فی الفقہ الاسلامی، مطبوعہ الشرکۃ العربیۃ للطباعۃ والنشر، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

(مفتی محمد شفیع)

۸۷

اِسلامی ذبیحہ

ذبیحہ کے حلال ہونے کیلئے شرعی شرائط
پر مفصل بحث اور شبہات کا جواب

تاریخ تالیف ـــــــــ رجب المرجب ۱۳۸۷ھ (مطابق ۱۹۶۷ء)

مقامِ تالیف ـــــــــ دارالعلوم کراچی

اشاعت اول ماہنامہ البلاغ شعبان، رمضان، شوال وربیع الثانی

ذبح کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ کا نام لینا کس حد تک ضروری ہے؟ مشینی ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟ اہل کتاب کا کونسا ذبیحہ حلال ہے؟ اس مقالہ میں انہی سوالات کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذی اصطفیٰ

تحقیق، ریسرچ کے نام پر جو فتنہ اجماعی مسائل میں تشکیک بلکہ تحریف دین کا ہمارے ملک میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ذمہ دار ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی تحریروں سے کھڑا کر دیا ہے، اس نے مجبور کیا کہ ذبیحہ اسلامی کے اس مسئلے کو جو دنیا کے تمام مسلمانوں میں معروف اور متفق علیہ ہے، پھر از سر نو واضح کیا جائے، اور جو شبہات کئے گئے ہیں، ان کا ازالہ کیا جائے۔

اسلامی طریقے سے بہتر ذبح کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے

یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں گوشت خوری کا دستور انتہائی قدیم ہے، لیکن اسلام سے پہلے جانوروں کا گوشت کھانے کے عجیب عجیب طریقے بغیر کسی پابندی کے اختیار کئے ہوئے تھے، مردار کا گوشت کھایا جاتا تھا، زندہ جانور کے کچھ اعضاء کاٹ کر کھا لئے جاتے تھے، جانور کی جان لینے کے لئے بھی انتہائی بے رحمانہ سلوک کیا جاتا تھا، کہیں لاٹھیوں سے مار کر، کہیں تیروں کی بوچھار کر کے جانور کی جان لی جاتی تھی۔

اسلام نے سب سے پہلے تو یہ تفریق کی کہ مردار کا گوشت حرام کیا، جو انسان کی جسمانی اور روحانی دونوں صحتوں کو برباد کرنے والا ہے، ان جانوروں کو حرام قرار دیا، جن کے گوشت سے اخلاقِ انسانی مسموم ہو جاتے ہیں، خنزیر، کتا، بلی، درندہ جانور

وغیرہ پھر جن جانوروں کو حلال کیا، ان کا گوشت کھانے میں بھی ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے ناپاک خون زیادہ سے زیادہ نکل جائے، اور جانور کو تکلیف کم سے کم ہو، طبی اصول پر انسانی صحت اور غذائی اعتدال میں اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ موجودہ زمانے کے بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے، بہر حال اسلام نے جانور کا گوشت کھانے میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑا کہ جس طرح درختوں کے پھل اور ترکاریاں وغیرہ کو جس طرح چاہیں کاٹیں، اور کھالیں، اسی طرح جانور کو جس طرح چاہیں کھا جائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی غذا خواہ نباتات سے ہو یا حیوانات سے ہو، سب اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہیں اور اس حیثیت سے ہر کھانے کو اللہ کا نام لے کر کھانا اور کھانے سے فارغ ہو کر اللہ کا شکر ادا کرنا، سنت اسلام ہے، جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اتنا عام کیا کہ وہ ایک اسلامی شعار بن گیا، لیکن جانوروں کے ذبح پر اللہ کا نام لینے کا معاملہ اس سے کچھ آگے ہے کہ جانور کا گوشت اس کے بغیر حلال ہی نہیں ہوتا، کوئی غافل انسان ترکاری، پھل وغیرہ کو بغیر اللہ کے نام کے کاٹے کھائے، تو اسے غافل تارکِ سنت تو کہا جائے گا، لیکن اس کے کھانے کو حرام نہیں کہا جا سکتا۔ بخلاف جانور کے کہ اس کے ذبح کے وقت بسم اللہ کہنا اس کے حلال ہونے کی شرط ہے، اس کے بغیر سارے آداب ذبح پورے بھی کر دیے جائیں، تو بھی جانور مردار و حرام ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے حجۃ اللہ البالغہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ الاسلام میں اسلامی ذبیحہ کی حکمت اور اس کے آداب و شرائط پر بصیرت افروز تحقیقات فرمائی ہیں [1]، یہاں ان کو پورا نقل کرنے کا موقع نہیں

(۱) ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ص: ۵۰۷ ج: ۲ مطبوعہ اصح المطابع کراچی و حجۃ الاسلام ص: ۱۶۴، ۱۶۵ مطبوعہ معارف القرآن دیوبند۔

ان میں سے ایک بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے، کہ جانوروں کا معاملہ عام نباتی مخلوقات کا سا نہیں کیونکہ ان میں انسان کی طرح روح ہے، انسان کی طرح دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چلنے پھرنے کے آلات واعضاء ہیں، انسان کی طرح ان میں احساس وارادہ اور ایک حد تک ادراک بھی موجود ہے، اس کا سرسری تقاضا یہ تھا کہ جانور کا کھانا مطلقاً حلال نہ ہوتا، لیکن حکمت الٰہیہ کا تقاضا تھا کہ اس نے انسان کو مخدوم کائنات بنایا جانوروں سے خدمت لینا، ان کا دودھ پینا، اور بوقت ضرورت ذبح کر کے ان کا گوشت کھالینا بھی انسان کے لئے حلال کر دیا، مگر ساتھ ہی اس کے حلال ہونے کے لئے چند ارکان اور شرائط بتلائے جن کے بغیر جانور حلال نہیں ہوتا۔

اسلامی ذبیحہ کے ارکان وشرائط

شرط اول:......سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر ذبح کے وقت اللہ کے اس انعام کا شکر ادا کیا جائے کہ روح حیوانی میں مساوات کے باوجود اس نے کچھ جانوروں کو ہمارے لئے حلال کر دیا ہے، اور اس شکر کے ادا کرنے کا طریقہ قرآن وسنت نے یہ بتلایا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں، بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کریں، جس نے ذبح پر اللہ کا نام قصداً چھوڑ دیا، اس کا ذبیحہ حلال نہیں، مردار ہے، قرآن کریم کے ارشادات اس معاملہ میں حسب ذیل ہیں:

ا:......وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (انعام: ۱۲۱)

ترجمہ:......"اور ایسے جانوروں سے مت کھاؤ، جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اور بلاشبہ یہ گناہ کی بات ہے، اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو

تعلیم دے رہے ہیں تاکہ یہ تم سے جدائی کریں، اور تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو، تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ۔''

۲:......فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ. (حج: ۳۶)

ترجمہ:......''سو تم ان (اونٹوں کو نحر کرتے وقت) کھڑے کر کے اللہ کا نام لیا کرو۔''

۳:......وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ط .(حج: ۳۴)

ترجمہ:......''اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں، جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔''

۴:......وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ .

(انعام: ۱۳۸)

ترجمہ:......''اور مویشی ہیں جن پر یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے محض اللہ پر افتراء باندھنے کے طور پر۔''

۵:......اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ . (نحل: ۱۱۵)

ترجمہ:......''تم پر صرف مردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر دیا گیا ہو۔''

۶:...... وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ .

(انعام: ۱۱۹)

ترجمہ:......''اور تم کو کون امر اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم ایسے جانور

میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔"

۷:...... اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ. (بقرہ: ۱۷۳)

ترجمہ:...... "اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف مردار کو اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانور کو حرام کیا ہے، جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔"

۸:...... حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ. (مائدہ: ۳)

ترجمہ:...... "تم پر حرام کئے گئے ہیں، مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو، اور جو گلا گھونٹنے سے مر جائے، اور جو کسی چوٹ سے مر جائے، اور جو اونچے سے گر کر مر جائے، اور جو کسی کی ٹکر سے مر جائے، اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے، لیکن جس کو ذبح کر ڈالو۔"

۹:...... وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ. (مائدہ: ۵)

ترجمہ:...... "اور جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں، ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے، اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے۔"

۱۰:...... يَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ط قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ لا وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ز فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ. (مائدہ: ۴)

ترجمہ:...... "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا جانور ان کے لئے

حلال کئے گئے ہیں؟ آپ فرما دیجئے کہ تمھارے لئے کل حلال جانور حلال رکھے ہیں، اور جن شکاری جانوروں کو تعلیم دو، اور تم ان کو چھوڑو بھی، اور ان کو اس طریقے سے تعلیم دو، جو تم کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمھارے لئے پکڑیں، اس کو کھاؤ، اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا کرو۔"

آیات مذکورہ سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے:

۱:...... جانوروں کا معاملہ عام انسانی غذاؤں کی طرح نہیں بلکہ ان کے حلال ہونے کے لئے خاص شرائط ہیں۔

۲:......سب سے پہلی اور اہم شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں میں اس شرط کو بہ تکرار ذکر فرمایا ہے، اور اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ صرف اس جانور کا گوشت کھا سکتے ہو، جس کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے، اور وہ جانور حرام ہے، جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔

۳:...... یہ کہ جس جانور پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا وہ حرام ہے، جیسے کفار اپنے بتوں اور مصنوعی خداؤں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔

۴:...... جو جانور گلا گھونٹ کر یا چوٹ مار کر مارا گیا ہو، یا کسی اونچی جگہ سے گر کر یا کسی کی ٹکر سے مر گیا ہو، یا جس کو کسی درندے نے کاٹا ہو، وہ حلال نہیں، بجز اس کے کہ اس کی جان نکلنے سے پہلے اس کو شرعی صورت سے ذبح کر لیا جائے۔

۵:...... ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی شرط سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی کافر مشرک کا ذبیحہ حلال نہیں، کیونکہ وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے پر عقیدہ نہیں رکھتے، اس مسئلے میں عام کفار میں سے اہل کتاب کو اس لئے مستثنیٰ کر دیا گیا کہ اہل کتاب

یعنی یہود و نصاریٰ کا اپنا مذہب بھی شریعت اسلام کے مطابق ہے کہ ان کے نزدیک ذبح کرنا، اور اس پر اللہ کا نام لینا ضروری ہے گلا گھونٹا ہوا یا چوٹ یا ٹکر سے مارا ہوا جانور حرام ہے۔

۶:......سورۂ انعام کی آیت مذکورہ وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کے بعد اول تو جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا اس کے کھانے کو فسق اور نافرمانی قرار دیا، اور اس کے بعد ارشاد فرمایا، و ان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم الآیۃ اس میں بتلا دیا گیا کہ اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور میں شک و شبہ کرنا اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو حلال سمجھنا یہ خالص شیطانی تعلیم ہے، اگر تم نے شیطان کی اطاعت اختیار کی، تو تم مشرک ہو جاؤ گے۔ امام بخاریؒ (۱) نے آیت کے اس حصے کو انہی لوگوں کے رد میں پیش کیا ہے، جو آیت مذکورہ میں تاویلیں کر کے اس جانور کو حلال ٹھہرانا چاہتے ہیں، جس پر بوقت ذبح اللہ کا نام نہیں لیا گیا، اور اس تاویل کو تلقین شیطانی قرار دیا ہے۔

جانور کے حلال ہونے کی دوسری شرط

ذکات ہے یعنی جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا شریعت اسلام نے جانور کو حلال کرنے کے لئے جو پاکیزہ طریقہ بتلایا قرآن کریم نے اس کا نام ذکوٰۃ رکھا ہے، (الا ما ذکّیتم) اس کی دو قسمیں ہیں:

ایک اختیاری دوسری غیر اختیاری۔

اختیاری صورت سے مراد ان جانوروں کا ذبیحہ ہے جو گھروں میں پالے جاتے ہیں، جیسے بکری، گائے، بیل، بھینس وغیرہ اور کسی جنگلی جانور جیسے ہرن وغیرہ کو گھر میں

(۱) دیکھئے فتح الباری ص:۵۱۲، ج:۹

پال کر مانوس بنالیا جائے، تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہو جاتا ہے اور غیر اختیاری صورت سے مراد وہ جنگلی اور وحشی حلال جانور ہیں، جن کا شکار کیا جاتا ہے، اور اگر پالتو جانوروں میں سے بھی کوئی جانور وحشی ہو کر بھاگ جائے، تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس دوسری قسم غیر اختیاری کے معاملے میں تو شرعی حکم یہ ہے کہ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر کسی دھار دار آلے تیر، تلوار وغیرہ سے جانور کو زخمی کر دیا جائے، تو وہ حلال ہو جاتا ہے، اسی طرح شکاری کتوں کو یا باز وغیرہ کو اگر تربیت دے کر ایسا سدھا لیا جائے، کہ وہ جانور کو پکڑ کر لائیں، اور اس میں سے کھائیں نہیں، ایسی صورت میں تربیت یافتہ کتے کو اگر بسم اللہ پڑھ کر شکار کے لئے چھوڑا جائے، اور یہ کتا یا باز جانور کو زخمی کر دے، جس سے جانور کی جان نکل جائے، تو یہ بھی حلال ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کی آیت مذکورہ سورۂ مائدہ: ۴ میں اسی طرح کے شکار کا بیان ہے، اور احادیث صحیحہ میں بسم اللہ پڑھ کر شکاری جانور پر تیر چلانے اور اس کے حلال ہونے کی تصریحات موجود ہیں، تمام کتب فقہ میں بھی اس کے مسائل اور جزئیات کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔

پہلی یعنی اختیاری صورت میں اونٹ کے لئے تو نحر کرنے کا طریقہ مسنون ہے، یعنی اونٹ کے پاؤں باندھ کر کھڑا کر دیا جائے، اور تیر، نیزہ یا چھری اس کے لبہ میں مار کر خون بہا دیا جائے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ سورۂ حج: ۳۶ میں اسی کا بیان ہے، اور فصل لربک و انحر میں اسی کی تصریح ہے۔

اونٹ کے علاوہ دوسرے جانور بکری، گائے، بیل، بھینس وغیرہ کے لئے مسنون طریقہ ذبح کا ہے، کیونکہ قرآن کریم نے گائے کے لئے فرمایا: ان تذبحوا بقرۃ اسی طرح بکرے کے لئے ذبح عظیم کے الفاظ ارشاد فرمائے، اور اونٹ کے لئے

فصل لربک و انحر فرمایا اسی قرآنی اشارہ کے مطابق شریعت کا حکم یہ ہوا کہ اونٹ کو نحر اور گائے بیل بکرے وغیرہ کو ذبح کیا جائے۔

ذبح کرنے کے احکام وآداب

اس کی تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل احادیث سے واضح ہوتی ہیں:

۱:......عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال ما انهر الدم و ذکر اسم اللّٰہ علیہ فکلوہ لیس السن و الظفر. (بخاری و مسلم وسنن اربعہ) (۱)

ترجمہ:......''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو دھار دار چیز جانور کا خون بہادے، اور ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے، (وہ حلال ہے) کھا سکتے ہو، مگر دانت اور ناخن (کہ دھار دار ہونے کے باوجود ان سے ذبح کرنا جائز نہیں، دیگر ہڈیوں کا بھی یہی حکم ہے۔)''

۲:......عن عدی بن حاتم قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم امرر الدم بما شئت و اذکر اسم اللّٰہ.

(ابوداؤد و نسائی، از حوالۂ بالا)

ترجمہ:......''جس دھار دار چیز سے چاہو، جانور کا خون بہا دو، اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لو۔''

۳:......عن شداد بن اوس عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلة و اذا اذبحتم فاحسنوا الذبح و لیحد

(۱) جمع الفوائد ص:۲۰۶، ج:۱

احدکم شفرته. (۱)

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے متعلق حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے، پس اگر تمہیں کسی کو (قصاص وغیرہ میں) قتل کرنا ہو، تو بہتر ہیئت میں قتل کرو۔ (کہ آسانی سے جان نکل جائے) اور کسی جانور کو ذبح کرنا ہو، تو اچھے طریقے سے ذبح کرو، چنانچہ پہلے اپنی چھری کو خوب تیز کرلو۔ (تاکہ جانور کو زیادہ تکلیف نہ ہو)''

۴:......عن ابن عمر امر النبی صلی اللہ علیه و سلم بحد الشفار و ان توارى عن البهائم قال اذا ذبح احدكم فليجهز. (قزوینی) (۲)

ترجمہ:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھریوں کی دھار کی جانب سے ذبح کرنے کا حکم فرمایا اور حکم فرمایا کہ چھریاں جانوروں کی آنکھ سے چھپا کر رکھی جائیں، نیز فرمایا اگر ذبح کرو، تو مکمل طور پر ذبح کرو۔ (ادھورا نہ چھوڑو)

۵:......قال ابن عباس و انس و ابن عمر اذا قطع الرأس مع ابتداء الذبح من الحلق و لايتعمد فان ذبح من القفا لم تو كل سواء قطع الرأس ام لم يقطع.
(بخاری) (۳)

ترجمہ:......''حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر حلق کی جانب سے ذبح کرتے وقت جانور کا سر کٹ کر الگ ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں لیکن بالارادہ ایسا نہ کرنا چاہئے کہ یہ مکروہ

(۱)......صحیح مسلم ص:۱۵۲، ج:۲ (۲)......جمع الفوائد ص:۲۰۶، ج:۱
(۳)......بخاری فی تراجمہ ص:۸۲۸، ج:۲

ہے اور اگر جانور کو پشت کی طرف سے ذبح کیا جائے، تو وہ کسی حال میں حلال نہیں، برابر ہے کہ سر کٹ جائے، یا نہ کٹے (یعنی دونوں حالتوں میں ناجائز ہے)۔"

۶:......الذکوٰۃ بین الحلق و اللبۃ (دارقطنی) و قال ابن عباس الذکاۃ بین الحلق و اللبۃ (بخاری فی الترجمۃ) و مثلہ عن عمرؓ فی تخریج الھدایۃ .(۱)

ترجمہ:......"ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ذبح حلقوم اور زخرہ کے بیچ میں ہونا چاہئے اور حضرت عمرؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔"

۷:......افر الاوداج بما شئت. (ھدایہ) (۲)

ترجمہ:......"رگیں (جن کو اوداج کہتے ہیں) ان کو اچھے طریقے سے کاٹ دو۔"

۸:......عن ابن عباس ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم نھی عن شریطۃ الشیطان ھی الذبیحۃ یقطع منھا الجلد و لاتفری الاوداج. (ابوداؤد) (۳)

ترجمہ:......"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کے ذبیحہ سے منع فرمایا، یعنی ایسے ذبیحہ سے جس کا صرف اوپر کا گوشت کاٹا جائے، اور زخرہ کے متصل رگیں سالم رہ جائیں۔"

۹:......نھی النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان تنخع الشاۃ اذا ذبحت. (الطبرانی فی المعجم) (۴)

ترجمہ:......"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے نخع کرنے سے

(۱)...... نصب الرایہ ص:۲۸۹، ج:۵ (۲)......جمع الفوائد ص:۲۰۶، ج:۱
(۳)......نصب الرایہ ص:۲۹۲، ج:۵ (۴)......نصب الرایہ ص:۲۸۷، ج:۵

منع فرمایا (یعنی ذبح میں اتنا مبالغہ کرنا کہ گردن کی ہڈیوں کے سفید مغز اور گودے بھی کاٹے جائیں)۔''

۱۰:......قال علیہ الصلوٰۃ و السلام فی امر المجوس غیر ناکحی نسائھم و لا اکلی ذبائحھم.

(مصنف عبد الرزاق و ابن ابی شیبہ) [۱]

ترجمہ:...... ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آتش پرست کافروں کے متعلق فرمایا کہ ان کی عورتوں سے شادی کرنے اور ان کے ہاتھ کے ذبیحہ کھانے کے علاوہ دوسرے امور میں ان کے ساتھ اہل کتاب جیسا معاملہ کرو، (مجوس کے اس حکم میں اہل کتاب کے سوا دوسرے کفار و مشرکین سب شامل ہیں کہ) ان کا ذبیحہ اور عورتیں مسلمان کے لئے حلال نہیں حرام ہیں۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ ہدایات سے امور ذیل معلوم ہوئے:

اول:...... یہ کہ ذبح کا مقام حلق اور لبہ کے درمیان ہے۔ (حدیث:۵)

دوم:...... یہ کہ گردن کو پورا کاٹ کر الگ نہ کیا جائے، بلکہ حرام مغز تک بھی نہ کاٹا جائے، (حدیث:۷) بلکہ حلقوم اور مری یعنی سانس کی نالی اور اس کے اطراف کے خون کی رگیں جن کو اوداج کہا جاتا ہے، وہ قطع کی جائیں، (حدیث:۶ و ۷) اس طرح نجس خون بھی پورا نکل جاتا ہے، اور جانور کو تکلیف بھی بہت کم ہوتی ہے، اس طریق کے خلاف جتنی صورتیں ہیں، ان میں خون بھی پورا نہیں نکلتا اور جانور کو بلا ضرورت تکلیف بھی شدید ہوتی ہے۔

سوم:...... یہ کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے یعنی بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا جائے۔ (حدیث:۱ و ۲)

---

(۱) نصب الرایہ ص:۲۸۷، ج:۵

چہارم:...... یہ کہ اس کا پورا اہتمام کیا جائے کہ جانور کو تکلیف کم سے کم ہو، اس لئے یہ حکم دیا کہ چھری کو تیز کرلو، اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرو، اور مذکورہ حلقوم وغیرہ کو پورا کاٹو، تاکہ جان آسانی سے نکل جائے، ایک حدیث میں اس سے بھی منع کیا گیا ہے، کہ جانور کے سامنے چھری تیز نہ کی جائے۔

پنجم:...... یہ کہ زندہ جانور کا کوئی عضو نہ کاٹو۔ (حدیث:۹)

ششم:...... یہ کہ جانور کو گدّی کی طرف سے ذبح نہ کرو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جھٹکا جائز نہیں، جس میں دفعتاً گردن الگ کردی جاتی ہے۔

ہفتم:...... یہ کہ جو جانور گدّی کی طرف سے ذبح کیا جائے، حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کا گوشت بھی حلال نہیں۔ (حدیث:۹)

ہشتم:...... یہ کہ کفار میں سے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے، دوسرے کسی کافر کا حلال نہیں، (حدیث:۱۰) اور اہل کتاب کے ذبیحہ کی حلت بھی اس وجہ سے ہے کہ اس مسئلے میں ان کا اپنا مذہب بھی اسلام کے مطابق ہے۔

تیسری شرط ذبح کرنے والے کا مسلمان یا کتابی ہونا

جمادات و نباتات کے کاٹنے، تراشنے، پکانے، بنانے میں اسلام نے کوئی یہ پابندی نہیں لگائی کہ وہ مسلمان ہی کے ہاتھ سے ہو، مگر روحِ حیوانی کے خصوصی احترام کی وجہ سے جیسے اللہ کا نام بوقت ذبح لینا شرط قرار دیا ہے، اسی طرح ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا یا کم از کم اہل کتاب میں سے ہونا، شرط حلت قرار دیا ہے، آیت **و طعام الذین اوتوا الکتاب** سے باتفاق ائمہ تفسیر ان کے ذبائح مراد ہیں۔ گوشت کے علاوہ دوسری غذاؤں میں تو اہل کتاب اور تمام کفار برابر ہیں کہ عام کھانے پینے کی چیزیں جو

پاک وحلال ہیں، وہ ہر شخص کے ہاتھ کی حلال ہیں، مسلمان ہو، یا کوئی کافر یہود و نصاریٰ کے سوادوسرے کفار کے ذبائح حرام ہونے کے متعلق حدیث نمبر ۱۰ کی تصریح واضح ہے، اور تمام طوائف کفار میں سے صرف یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ اوران کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دینے کی وجہ بھی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں ان کا اپنا مذہب اور تورات وانجیل کی تصریحات بھی عین قرآن اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں، اور سینکڑوں تحریفات کے بعد اب تک بھی یہ حکم اس میں موجود ہے، عہد نامہ جدید کی کتاب اعمال میں غیر قوم کے لئے تمام احکام کو ختم کر کے اتنا پھر بھی لکھا گیا ہے، کہ تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ (اعمال: ۱۵: ۲۹)

اہل کتاب کون لوگ ہیں؟

قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق اہل کتاب سے مراد صرف یہود و نصاریٰ ہیں سورۂ مائدہ آیت نمبر ۵ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت منقول ہے:

و طعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم یعنی ذبیحة الیهود و النصرانی. (۱)

یہود و نصاریٰ میں وہ لوگ داخل نہیں، جو مذہباً دہریے ہیں، خدا اور رسول اور آخرت کے قائل ہی نہیں، جیسے آج کل یورپ کے بہت سے قومی عیسائیوں کا حال ہے کہ محض قومی طور پر وہ مسیحی یا عیسائی کہلاتے ہیں، مگر وہ خدا ہی کے وجود کے قائل نہیں پھر کسی رسول و پیغمبر کے کیا قائل ہوتے۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے نصاریٰ بنی تغلب کے ذبیحہ کو حرام قرار دیا، اور فرمایا کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے سوائے شراب نوشی کے

(۱) تفسیر القرطبی ص: ۲۶، ج: ۲

اور کسی چیز کو نہیں مانتے،(۱) ہاں جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی اور تورات وانجیل کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں، وہ اہل کتاب میں داخل ہیں، اگر چہ انھوں نے اپنے دین کو بدل ڈالا ہے، تورات وانجیل میں تحریف کر ڈالی ہے، اور تثلیث وغیرہ جیسے مشرکانہ عقائد اختیار کر لئے ہیں، مگر یہ آج کے نہیں، نزول قرآن کے زمانے میں بھی ان کا یہی حال تھا، اور قرآن کریم نے ان حالات کے باوجود ان کو اہل کتاب قرار دیا، اور ان کے ذبائح کو حلال کیا، اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا، امام تفسیر ابن کثیر نے اس پر علماء امت کا اجماع نقل کر کے فرمایا:

لانهم يعتقدون تحريم الذبح لغير الله و لايذكرون على ذبائحهم الا اسم الله و ان اعتقدوا فيه تعالىٰ ما هو منزه عنه تعالىٰ و تقدس.(۲)

خلاصۂ کلام

قرآن وسنت کی مذکورہ بالا تصریحات سے اسلامی ذبیحہ کے لئے تین شرائط ثابت ہوئیں:

۱:......ذابح کا مسلمان یا کتابی ہونا۔

۲:......بوقت ذبح اللہ کا نام لینا۔

۳:......شرعی طریق پر حلقوم اور سانس کی نالی اور خون کی رگیں کاٹ دینا۔

ان میں سے کوئی ایک بھی رہ جائے، تو وہ اسلامی ذبیحہ نہیں، یہ سب بیان اختیاری ذکات کا تھا، غیر اختیاری ذکات، شکار وغیرہ کے احکام درج ذیل ہیں:

---

(۱)......تفسیر القرطبی ص:۲۶، ج:۲

(۲)......تفسیر ابن کثیر ص:۱۹، ج:۲

شکار کے احکام

اوپر اسلامی ذبیحہ کے متعلق قرآن مجید کی دس آیات اور چند احادیث پیش کی گئی ہیں، ان میں ایک تو عام ذبائح کا حکم مذکور ہے، جو گھریلو اور پالتو جانوروں سے متعلق ہے، جن کے حلال ہونے کے لئے تین شرطوں کی تصریح پوری وضاحت کے ساتھ آ چکی ہے، ذابح کا مسلمان ہونا ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اور عروق ذبح کو دھار دار چیز سے قطع کرنا۔

دوسرا حکم شکار کا بھی سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ تربیت یافتہ کتے وغیرہ کو اگر بسم اللہ کہہ کر شکار پر چھوڑا جائے، اور وہ جانور کو زخمی کر کے پکڑ لائے، اور خود اس میں سے نہ کھائے، تو یہ شکار حلال ہے، احادیث صحیحہ میں بسم اللہ پڑھ کر شکار پر تیر پھینکنے کا بھی یہی حکم مذکور ہے، اس حکم کی مزید وضاحت مندرجہ ذیل روایات حدیث میں ہے:

عن ابی ثعلبة اذا ارسلت کلبک فاذکر اللّٰہ و اذا رمیت بسهمک فاذکر اللّٰہ۔ (ابن کثیر، مائدہ)

جب تم اپنے تربیت یافتہ شکاری کتے کو شکار پر چھوڑو، تو اللہ کا نام لو، اور جب تم شکار پر تیر پھینکو تو اللہ کا نام لو۔

اور حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث صحیح بخاری و مسلم میں بالفاظ ذیل آئی:

اذا ارسلت کلبک فاذکر اسم اللّٰہ فان امسک علیک فادرکته حیا فاذبحه و ان ادرکته قد قتل و لم یاکل منه فکله و ان اکل فلا تاکل فانما امسک علی نفسه و ان وجدت مع کلبک کلبا غیره و قد قتل فلاتاکل فانک لاتدری ایهما قتل و اذا رمیت

بسهمک فاذکر اسم اللّٰه.

جب تم اپنے کتے کو شکار کے لئے چھوڑو تو اللہ کا نام لو، اگر اس نے شکار کو تمہارے لئے روک لیا تو اگر تم نے اس کو زندہ پالیا، تو باقاعدہ ذبح کرلو، اور اگر اس نے قتل کر ڈالا ہے، مگر خود اس میں سے نہیں کھایا، تو اس کو کھا سکتے ہو، اور اگر شکاری کتے نے خود اس میں کھالیا، تو اس کو نہ کھاؤ، کیونکہ وہ اس نے اپنے لئے شکار کیا ہے، تمھارے لئے نہیں، اور اگر تم نے اپنے کتے کے ساتھ کوئی دوسرا کتا بھی شکار کے پکڑنے میں شریک پایا، اور وہ شکار قتل ہو گیا، تو اس کو نہ کھاؤ، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اس کو ان دو کتوں میں سے کس نے قتل کیا ہے، اور جب تم شکار پر تیر پھینکو، تو اس پر اللہ کا نام لو۔

نیز حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی بخاری و مسلم میں منقول ہیں:

قال قلت یا رسول اللّٰه ارسل کلبی فاجد معه کلبا اخر قال فلاتاکل فانما سمیت علی کلبک و لم تسم علی کلب اٰخر. (بخاری و مسلم . از مظهری :مائده)

عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بعض اوقات میں اپنے کتے کو شکار پر چھوڑتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کتا بھی شریک ہو گیا، آپ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں شکار نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے اللہ کا نام اپنے شکاری کتے پر لیا تھا، دوسرے کتے پر نہیں لیا۔

اور ترمذی میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے:

نهینا عن صید کلب المجوس (مشکوٰۃ)

ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی مجوسی بت پرست کے شکاری کتے کا شکار کھائیں۔

احادیث مذکور میں شکار کے حلال ہونے کے لئے چند شرطیں ذکر کی گئی ہیں، اول شکاری کتے یا تیر وغیرہ کو شکار پر چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لینا، دوسرے یہ کہ شکاری کتا تربیت یافتہ ہو، وہ شکار کو کھائے نہیں بلکہ شکاری کے پاس پکڑ لائے، تیسرے یہ کہ شکار کرنے والا بھی مسلمان ہو، مشرک نہ ہو، جیسا کہ حدیث :۴ سے ثابت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ذکاۃ اختیاری کی تین شرطوں میں سے دو شرطیں شکار میں بھی ضروری ہیں، یعنی شکاری کا مسلمان ہونا، اور شکار پر تیر یا شکاری کتا چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لینا، صرف تیسری شرط یعنی عروق ذبح کو قطع کرنا، اس غیر اختیاری قسم میں معاف کر دیا گیا، بلکہ جانور کے کسی حصے کو زخمی کر دینا کافی سمجھا گیا ہے، تو فرق صرف محل ذبح کا رہ گیا، کہ اختیاری صورت میں گردن کی خاص رگیں قطع کرنا ضروری ہے، غیر اختیاری میں کسی جگہ زخم لگنا کافی ہے، اور بتصریح احادیث صحیحہ جو پالتو اور مانوس جانور وحشی بن جائے، اور قابو سے نکل جائے، وہ بھی شکار ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے، صحیح بخاری و مسلم میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حکم نقل کیا گیا ہے، اور اسی بنیاد پر حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اگر کسی شکاری جانور ہرن وغیرہ کو گھر میں پال کر مانوس کر لیا جائے، تو وہ پالتو جانوروں کے حکم میں داخل ہو جاتا ہے، اس کو اسی طرح ذبح کرنا چاہئے جس طرح عام جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، اس کے بغیر وہ حلال نہیں ہوگا۔

صحابہ و تابعین اور علمائے امت کی تشریحات

اسلامی ذبیحہ کے اصل مسئلے کو خود قرآن کریم نے براہ راست ایسا واضح کر دیا

ہے کہ اس میں کسی اجتہاد و رائے کی گنجائش نہیں چھوڑی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی احادیث نے اس کو اور بھی زیادہ واضح اور روشن کر دیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جانور کے حلال ہونے کا اصل مدار اللہ کے نام سے ذبح کرنے پر ہے، باقی شرائط سب اسی کی تفصیلات ہیں، قرآنی تشریحات پر پھر ایک مرتبہ اجمالی نظر ڈالئے سورۃ الانعام میں یکے بعد دیگرے تین آیات میں اس مسئلے کے ہر منفی اور مثبت پہلو کو ایسا کھول دیا ہے، کہ اس کے بعد کسی اختلاف رائے کی جگہ نہیں رہتی آیت نمبر ۱۱۸ میں پہلے یہ ارشاد فرمایا:

فکلوا مما ذکر اسم اللّٰہ علیہ ان کنتم بایتہ مؤمنین.

سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے۔

اس میں تو ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو یہ کہتے تھے کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے خود مارا یعنی مردار اس کو مسلمان حرام کہتے ہیں اور جس کو خود مارتے ہیں اس کو حلال ٹھہراتے ہیں، قرآن کریم نے اس آیت میں فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا تمھارے اپنے اختیار میں نہیں، یہ قانون الٰہی کے تابع ہے، اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو حلال قرار دیا ہے، جس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے، اور اس جانور کو حرام کیا ہے، جو خود مر جائے۔

دوسری آیت: ۱۱۹ میں پھر اس کی مزید تاکید اور توضیح اس طرح آئی:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ .

اور کیا سبب ہے کہ تم نہیں کھاتے اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا اللہ کا۔

اس آیت نے یہ بات واضح کر دی کہ جانور کی حلت کا اصل مدار اللہ کا نام لے

کر ذبح کرنے پر ہے، جب وہ اس طرح ذبح کر دیا جائے، پھر اس کے کھانے میں کوئی تردد کرنا کفار کا اتباع ہے، اس کے بعد آیت :۱۲۱ میں اس کے منفی پہلو کو پوری وضاحت سے اس طرح بیان فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ط وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ .

اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا، اور یہ کھانا گناہ ہے، اور شیاطین دل میں ڈالتے ہیں، اپنے رفیقوں کے تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے۔

اس آیت میں کس قدر صاف وصریح یہ حکم دیا ہے، کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس میں سے نہ کھاؤ، اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ اس کا کھانا گناہ ہے، اور اس کے بعد مزید تاکید کے لئے یہ بھی بتلا دیا کہ اس حکم کے خلاف مجادلہ کرنا شیاطین کا کام ہے۔

ذرا غور کیجئے

کہ قرآن حکیم تو بلاغت کا معیاری اور جامع مختصر کلام ہے، اگر کوئی شخص آپ کو پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتلانا چاہے کہ بغیر اللہ کا نام بوقت ذبح لئے ہوئے جانور حلال نہیں ہوتا، اس کا کھانا حرام ہے، تو وہ اس سے زیادہ کون سے الفاظ لائے، جس سے آپ کو اس مسئلے میں شبہ نہ رہے۔

یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ جس معاملے میں کسی وقت اہل زیغ کی طرف سے کج بحثی کا خطرہ تھا اس کو بار بار مختلف عنوانات سے ایسا صاف کر دیا کہ تاویلات فاسدہ کرنے والے کو راہ نہ ملے۔

اسی لئے امام بخاریؒ نے اس آیت کے آخری جملے سے اس طرف اشارہ ثابت

کیا ہے کہ جو لوگ اس آیت میں تاویل کر کے بسم اللہ چھوڑنے کا جواز نکالتے ہیں وہ شیاطین کا اتباع کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الذبائح باب التسمیۃ علی الذبیحہ)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات میں اول تو اسی آیت سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جس جانور کے ذبح پر اللہ کا نام قصداً چھوڑ دیا جائے، وہ حرام ہے، بھول کر رہ جائے، تو وہ معاف ہے، کیونکہ قرآن کریم نے اس کو فسق فرمایا ہے، اور بھولنے والے کو فاسق نہیں کہا جاسکتا، اس کے بعد آیت کا آخری جملہ و ان الشیاطین الخ نقل فرمایا ہے، اس جملے کے نقل کرنے کا مقصد حافظ حدیث امام ابن حجر شافعیؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یہ ذکر کیا ہے کہ:

فکانہ یشیر بذلک الی الزجر عن الاحتجاج لجواز ترک التسمیۃ بتاویل الایۃ و حملھا علی غیر ظاھرھا.

گویا کہ امام بخاری آیت کے اس جملے سے اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کو زجر و تنبیہ مقصود ہے، جو آیت مذکورہ میں ظاہر کے خلاف تاویل کر کے بسم اللہ ترک کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین سے لے کر متاخرین فقہاء تک سبھی اس مسئلے میں متفق ہیں کہ جان بوجھ کر کوئی شخص ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا چھوڑ دے، تو وہ ذبیحہ نہیں مردار ہے، کھانا اس کا حرام ہے، امام ابو یوسفؒ نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے۔ (کذا فی الہدایہ)

ان حضرات کی تصریحات اور اقوال کو پورا نقل کیا جائے، تو ایک بڑی کتاب اسی کی بن جائے، جس کا پڑھنا دیکھنا لوگوں کے لئے آسان نہیں اس لئے اس میں سے کچھ اختصار کے ساتھ بقدر ضرورت نقل کیا جائے گا۔

ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی تلبیس یا التباس

مگر اس سے پہلے اس مغالطے کا ازالہ ضروری ہے، جس کو لے کر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور ان کے بعض رفقاء نے پورے ملک میں ایک نیا فتنہ اخبارات و رسائل کے ذریعہ پھیلا رکھا ہے، اور حیرت یہ ہے، اس میں وہ میرا نام بھی بار بار لا کر لوگوں کو یہ مغالطہ دینا چاہتے ہیں کہ میں نے یہ کہا ہے کہ اس مسئلے میں علماء امت کا اختلاف ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں دو مسئلے جدا جدا ہیں، ایک مسلمانوں کا ذبیحہ اور اس پر اللہ کا نام لینے کی قطعی شرط، دوسرے اہل کتاب کا ذبیحہ جس کا بیان عنقریب تفصیل کے ساتھ آئے گا، پہلے مسئلے میں پوری امت میں کوئی اختلاف نہیں، صرف امام شافعیؒ کی طرف جو اختلاف منسوب کیا جاتا ہے، اس کی تحقیق آگے آرہی ہے، البتہ دوسرا مسئلہ یعنی اہل کتاب کے ذبائح کی حلت جو قرآن کریم میں مذکور ہے، اس کے متعلق بیشک صحابہ و تابعین اور فقہاء امت میں اختلاف چلا آتا ہے، بعض حضرات کے نزدیک ان کا وہی ذبیحہ حلال قرار دیا جائے گا، جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، بعض نے فرمایا کہ ان کا وہ ذبیحہ بھی حلال ہے، جس پر اللہ کا نام لینا یا نہ لینا ہمیں معلوم نہ ہو، اور بعض حضرات نے ان کے اس ذبیحہ کو بھی جائز قرار دیا ہے، جس پر اللہ کا نام نہ لینا معلوم ہو، اور بعض حضرات نے تو یہاں تک بھی کہا ہے کہ جس ذبیحہ پر انھوں نے عزیر یا مسیح کا نام لیا ہو، وہ بھی حلال ہے، جس کی تفصیل ذبائح اہل کتاب کے تحت میں آئے گی، یہی وہ اختلاف ہے، جس کا احقر نے اپنے ایک فتویٰ میں ذکر کیا ہے، افسوس ہے کہ ادارۂ تحقیقات کے محققین میرے اس جملے کو جو ذبائح اہل کتاب کے سلسلے میں تھا، مسلمانوں کے ذبیحہ میں کھینچ لائے، اور یہ مغالطہ دیا کہ مسلمانوں کے ذبیحہ میں بھی اللہ کا نام لینے کی شرط ہمیشہ سے زیر اختلاف چلی آئی ہے، اور جب میں نے اس پر یہ لکھا کہ اس مسئلے میں امت

کے درمیان کوئی معتد بہ خلاف نہیں، بلکہ جمہور امت کے نزدیک مسئلہ اجماعی ہے، تو میرے دو کلاموں میں تضاد ثابت کرنے لگے، میں پھر کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ذبیحہ میں جس پر قصداً اللہ کا نام چھوڑ دیا جائے، وہ باتفاق اہل اسلام حرام و ناجائز ہے، امام ابو یوسفؒ نے اس کو اجماع کے خلاف قرار دیا ہے ایک امام شافعیؒ کے اختلاف کی حقیقت کا بیان آگے آرہا ہے۔

ہاں ذبائح اہل کتاب کے معاملہ میں بے شک یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اس میں صحابہ و تابعین اور فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، فرمائیے ان دو باتوں میں کیا تضاد اور تعارض ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر ایک نظر

اس معاملہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل مذہب اس مسئلے میں کیا ہے، خود حضرت امام موصوف کی اپنی تصنیف کتاب الام میں امام کے یہ الفاظ ہیں:

> و لو نسی التسمیة فی الذبیحة اکل لان المسلم یذبح علی اسم الله عز و جل و ان نسی و کذلک ما اصبت بشیٔ من سلاحک الذی یمور فی الصید.
>
> (کتاب الام، ص: ۲۲۷، ج: ۲)
>
> اگر ذبیحہ پر بسم اللہ کہنا بھول جائے، تو یہ ذبیحہ کھانا جائز ہے، کیونکہ مسلمان دراصل اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتا ہے، اگرچہ زبان سے نام لینا بھول گیا ہو، اسی طرح جب تم نے اپنا کوئی ہتھیار تیر وغیرہ جو شکار کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے، پھینکا (اور بسم اللہ پڑھنا بھول گئے)۔

(تقریباً یہی عبارت کتاب الام کتاب الصید و الذبائح ص: ۲۸۱ جلد: ۸ میں

بھی مذکور ہے)۔

اس عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی جمہور امت کے مطابق ترک بسم اللہ کو صرف نسیان کی صورت میں جائز قرار دیتے ہیں۔

اس لئے اسی کتاب کے باب ذبائح اہل کتاب میں فرمایا:

فاذا زعم زاعم ان المسلم ان نسی اسم الله تعالیٰ اکلت ذبیحته و ان ترکه استخفافا لم تو کل ذبیحته.

(کتاب الام ص: ۲۳۱، ج: ۲)

اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ اگر مسلمان بوقت ذبح اللہ کا نام لینا بھول جائے، تو اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا، اور اگر اس نے اللہ کا نام لینا قصداً بوجہ استخفاف یعنی لاپروائی کی بناء پر چھوڑا ہے، تو اس کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ بھول کر تسمیہ چھوٹ گیا، تو وہ معاف ہے، دوسرے یہ کہ جان بوجھ کر بھی استخفاف کے طور پر بسم اللہ کہنا چھوڑا ہے، تو اس کا ذبیحہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی حرام ہے، اب ایک صورت زیر اختلاف رہ گئی جس کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا وہ یہ کہ کسی نے بسم اللہ کہنا چھوڑا، تو قصداً ہے، مگر اتفاقی طور پر ایسا ہو گیا، بسم اللہ کہنے سے بے پروائی یا استخفاف مقصود نہیں، اس کا جواز اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے، یہی قول اشہبؒ کا تفسیر قرطبی نے اس طرح نقل کیا ہے:

قال اشهب تو کل ذبیحة تارک التسمیة عمداً الا ان یکون مستخفاً. (تفسیر قرطبی، ص:۷۶، ج:۷)

اشہبؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ذبیحہ پر اللہ کا نام قصداً چھوڑ دیا ہے، اس کا ذبیحہ کھایا جا سکتا ہے، مگر جب اس نے استخفاف کے طور پر

تسمیہ چھوڑا ہو، تو اس کا ذبیحہ حرام ہے۔

لفظ استخفاف خفت سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ہلکا ہونا تو استخفاف کے معنی کسی چیز کو ہلکا سمجھنے کے ہوئے، بعض دوسرے علماء نے استخفاف کی جگہ لفظ تہاون استعمال کیا ہے، شرح مقدمہ مالکیہ میں اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

و کل ھذا فی غیر المتھاون و اما المتھاون فلا خلاف انھا لاتوکل ذبیحتہ تحریما قالہ ابن الحارث و البشیر و المتھاون ھو الذی یتکرر منہ ذلک کثیراً و اللّٰہ اعلم . (ذکرہ فی تفسیر المظہری من سورۃ الانعام ص:۳۱۸، ج:۳)

قصداً ترک تسمیہ کے متعلق جس کسی کا کچھ اختلاف ہے، وہ صرف اس صورت میں ہے کہ بسم اللہ کہنے کو تہاون کے طور پر نہ چھوڑا ہو، لیکن تہاون کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اس کا ذبیحہ حرام ہے، کھانے کے قابل نہیں، یہ قول ابن حارث اور بشیر کا ہے، اور متہاون وہ شخص ہے، جس سے بار بار بکثرت یہ فعل صادر ہو کہ ذبیحہ پر بسم اللہ نہ کہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ یا بعض دوسرے علماء جنھوں نے قصداً ترک تسمیہ کے باوجود ذبیحہ کو حلال کہا ہے، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے، کہ یہ ترک تسمیہ استخفافاً اور تہاوناً نہ ہو، یعنی اس کی عادت نہ ڈال لے، بلکہ اتفاقی طور پر کبھی تسمیہ چھوڑ دیا ہے۔

اور پھر اس خاص شرط کے ساتھ متروک التسمیہ عمداً کو جو حلال کہا گیا ہے، اس کے ساتھ امام شافعیؒ کا قول ظاہر یہ ہے، کہ پھر بھی اس کا کھانا مکروہ ہے، جیسا کہ امام ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے۔

ان ترکھا متعمداً کرہ اکلھا و لم تحرم قالہ القاضی ابو الحسن و الشیخ ابوبکر من اصحابنا و ھو ظاھر قول الشافعیؒ . (احکام ابن عربی، ص:۳۰۹، ج:۱)

اگر بسم اللہ کو قصداً چھوڑ دیا تو اس ذبیحہ کا کھانا مکروہ ہے، مگر حرام نہیں، ہمارے اصحاب میں سے قاضی ابوالحسن اور شیخ ابوبکر کا یہی قول ہے، اور ظاہر قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے۔

اور علامہ نووی جو شافعی المذہب امام ہیں، شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

و علی مذهب اصحابنا يكره تركها و قيل لايكره و الصحيح الكراهة (صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح ص:۱۴۵، ج:۲)

ہمارے اصحاب یعنی شافعیہ کے مذہب پر بسم اللہ کا چھوڑنا مکروہ ہے، اور بعض نے کراہت سے انکار کیا، مگر صحیح یہی ہے کہ شافعی مذہب میں ترک تسمیہ عمداً مکروہ ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے مذہب کے متعلق امور ذیل ثابت ہوئے۔

۱:...... ذبیحہ پر بسم اللہ کا قصداً چھوڑنا ان کے نزدیک بھی مکروہ ہے۔

۲:...... جس ذبیحہ پر بسم اللہ قصدا چھوڑ دی گئی ہو، اس کا کھانا بھی ظاہری قول امام شافعیؒ کے مطابق مکروہ ہے۔

۳:...... یہ کراہت کا قول بھی اس وقت ہے جب کہ بسم اللہ چھوڑنا بطور استخفاف و تہاون کے نہ ہو، اتفاقی ہو، اور جو شخص بار بار ایسا کرے، اور اس کی عادت بنا لے، وہ تہاون و استخفاف میں داخل ہے، اس کا ذبیحہ جمہور امت کے قول کے مطابق امام شافعیؒ کے نزدیک بھی حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کی طرف مطلقاً متروک التسمیہ عمداً کی حلت کو منسوب کر دینا صحیح نہیں، بلکہ جمہور امت کی طرح متہاون فی ترک التسمیہ کے ذبیحہ کو وہ بھی حرام کہتے ہیں، نیز جس کو حلال کہا ہے، وہ بھی کراہت اور گناہ سے خالی نہیں، اور

جمہور علماء امت اس صورت کو بھی قطعی حرام اور ذبیحہ کو مردار قرار دیتے ہیں، اسی لئے صاحب ہدایہ نے امام شافعیؒ کے اس قول کو اجماع کے خلاف قرار دیا ہے، اور ان کے الفاظ یہ ہیں:

و هذا القول من الشافعیؒ مخالف للاجماع فانه لا خلاف فیمن کان قبله فی حرمة متروک التسمیة عامداً و انما الخلاف بینهم فی متروک التسمیة ناسیا فمن مذهب ابن عمر انه یحرم و من مذهب علی و ابن عباس انه یحل بخلاف المتروک التسمیة عامداً و لهٰذا قال ابویوسف ان متروک التسمیة عامداً لایسع فیه الاجتهاد و لو قضی القاضی بجواز بیعه لا ینفذ لکونه مخالفا للاجماع. (هدایه کتاب الذبائح)

امام شافعیؒ کا یہ قول اجماع کا مخالف ہے، کیونکہ امام شافعیؒ سے پہلے قصداً بسم اللہ چھوڑے ہوئے ذبیحہ کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں، جو کچھ خلاف سلف صالحین میں ہے، وہ بھول کر بسم اللہ چھوٹ جانے میں ہے، جس میں ابن عمرؓ کا مذہب یہ ہے کہ بھولے سے بسم اللہ چھوٹ گئی، تب بھی جانور حرام ہوگیا، اور حضرت علی وابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ وہ حلال ہے، بخلاف اس جانور کے جس پر بسم اللہ قصداً چھوڑ دی گئی ہو، اس لئے امام ابویوسفؒ نے فرمایا کہ متروک التسمیہ عامداً میں کسی اجتہاد و اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اور اگر کوئی قاضی اس کی بیع کے جائز ہونے کا فیصلہ دے دے، تو اس کا فیصلہ بھی خلاف اجماع ہونے کے سبب نافذ نہیں۔

صاحب ہدایہ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ سے پہلے صحابہ و

تابعین میں کسی کا یہ قول نہیں کہ جس ذبیحہ پر قصداً بسم اللہ چھوڑ دی جائے، وہ حلال ہے، مگر ابن کثیرؒ نے سورہ انعام کی تفسیر میں ہدایہ کے اس نقل اجماع پر اس لئے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ابن کثیرؒ نے اس مسئلے میں امام شافعیؒ کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، اور عطاء ابن ابی رباحؒ کا قول بھی ذکر کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

و حکی عن ابن عباس و ابی ھریرۃ و عطاء.

یعنی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ اور عطاء کا بھی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ابن کثیرؒ نے ان حضرات کا یہ قول بصیغہ تمریض نقل کیا ہے، یعنی یہ کہ ایسا کہا جاتا ہے، نہ تو اس کی کوئی سند اور حوالہ دیا، اور نہ اس پر جزم کا اظہار کیا ہے، بہرحال ابن کثیرؒ نے یہاں یہ تسلیم نہیں کیا کہ امام شافعیؒ سے پہلے کوئی اس کا قائل نہیں تھا، اور تفسیر قرطبی میں تو اس قول کی موافقت میں بہت سے صحابہ و تابعین کے نام شمار کر دیے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

ان ترکھا عامداً او ناسیاً اکلھا و ھو قول الشافعی و الحسن و روی ذلک عن ابن عباس و ابی ھریرۃ و عطاء و سعید بن المسیب و الحسن و جابر بن زید و عکرمۃ و ابی عیاض و ابی رافع و طاؤس و ابراھیم النخعی و عبدا لرحمن بن ابی لیلیٰ و قتادۃ الخ

(ص: ۷۵، ج: ۷)

اگر بسم اللہ کو چھوڑ دیا، خواہ قصداً یا نسیاناً اس کو کھا سکتے ہیں، یہی قول امام شافعیؒ اور حسن بصری کا ہے، اور ایک روایت میں ابن عباس، ابو ہریرہ، عطاء، سعید بن مسیّب، حسن، جابر بن زید، ابو عیاض، ابو رافع، طاؤس، ابراھیم نخعی، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور قتادہ سے بھی منقول ہے۔

اس میں بھی قرطبی نے امام شافعیؒ کی موافقت میں حضرت حسن کا قول تو جزم و یقین کے الفاظ سے ذکر کیا ہے، باقی اقوال کو وہی بصیغہ تمریض لفظ ''روی'' سے بغیر کسی سند اور حوالہ کے لکھا ہے، بہر حال اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اتنے حضرات صحابہ و تابعین کا قول امام شافعیؒ کی موافقت میں ہے، تو اس کو خلاف اجماع نہیں کہا جا سکتا، لیکن صاحب ہدایہ نے ابن کثیرؒ کے اس اشکال کا پہلے ہی یہ جواب دے دیا ہے کہ امام شافعیؒ کے سوا باقی حضرات کا جو اختلاف ہے، وہ عام نہیں بلکہ صرف نسیان اور بھول کی صورت میں ہے کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا بھول گیا، تو ان حضرات کے نزدیک وہ ذبیحہ بغیر تسمیہ کے بھی حلال ہے، اور اس کے بالمقابل بہت سے حضرات صحابہ و تابعین کا قول یہ ہے، کہ بھول کر بھی بسم اللہ چھوٹ گئی، تو ذبیحہ حلال نہیں۔

اب ذرا مذکور الصدر حضرات کے اقوال کی حقیقت پر نظر ڈالئے کہ وہ عمداً ترک بسم اللہ کے متعلق ہیں یا سہواً کے متعلق؟ ان میں سے حضرت ابن عباسؓ کا قول تو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس طرح نقل کیا ہے:

و قال ابن عباس من نسی فلا بأس.

(صحیح بخاری کتاب الذبائح جلد دوم)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ جو شخص بسم اللہ کہنا بھول گیا تو کوئی مضائقہ نہیں، (ذبیحہ اس کا حلال ہے)

اگر ابن عباس کے نزدیک قصداً اور نسیاناً ہر حالت میں ترک بسم اللہ میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا، اور وہ دونوں کو حلال قرار دیتے، تو یہاں نسیان کی قید و شرط کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس کا قول صرف نسیان کی صورت سے متعلق ہے، عمداً اور قصداً ترک تسمیہ کی صورت میں ان کے نزدیک ذبیحہ حلال نہیں، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے، اور خود حافظ ابن کثیرؒ نے اسی آیت کے ذیل میں،

یہاں امام شافعیؒ کی موافقت میں ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ اور عطاءؒ کا قول نقل کیا ہے، اسی سلسلے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

المذهب الثالث في المسئلة ان ترک البسملة علی ذبیحة نسیاناً لم یضر و ان ترکها عمداً لم تحل هذا هو المشهور من مذهب الامام مالک و احمد بن حنبل و به یقول ابوحنیفة و اصحابه و اسحٰق بن راهویه و هو المحکی عن علی و ابن عباس و سعید بن المسیب و عطاء و طاؤس و الحسن البصری و ابی مالک و عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ و جعفر بن محمد و ربیعة بن عبدالرحمن . (ابن کثیر ص: ۱۷۰، ج: ۲)

تیسرا مذہب اس مسئلے میں یہ ہے کہ اگر بسم اللہ کو ذبیحہ پر نسیاناً ترک کرے، تو مضر نہیں، اور اگر قصداً ترک کردے، تو حلال نہیں، یہی مشہور مذہب ہے امام مالک، احمد ابن حنبل کا اور اسی کے قائل ہیں ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور اسحاق بن راہویہ۔

اور وہی روایت کیا گیا ہے، حضرت علی، ابن عباس، سعید بن المسیب، عطاء، طاؤس، حسن بصری، ابو مالک، عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، جعفر بن محمد، ربیعہ بن عبدالرحمٰن سے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس جگہ ابن کثیرؒ نے تقریباً ان تمام حضرات کے اختلاف کو صرف نسیان کی صورت میں نقل کیا ہے، جن کا قول تفسیر قرطبی اور خود ابن کثیر نے امام شافعیؒ کی موافقت میں ذکر کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان تمام حضرات کا اختلاف صرف نسیان بسم اللہ کی صورت میں ہے، عمداً ترک کرنے کی صورت میں نہیں، جس کسی نے ان کا قول امام

شافعیؒ کی موافقت میں نقل کر دیا ہے، وہ اس بنیاد پر ہے کہ ایک جزو یعنی بصورت نسیان ترک تسمیہ میں یہ حضرات بھی امام شافعیؒ کی موافقت رکھتے ہیں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان حضرات میں سے کسی کے اس مسئلے میں دو قول ہوں، ایک امام شافعیؒ کی موافقت میں دوسرا خلاف میں جیسا کہ ائمہ مجتہدین کے اقوال کا تجربہ رکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ بعض مسائل میں ایک فقیہ کے خود مختلف اقوال ہوتے ہیں، جن میں معمول بہ وہ قول ہوتا ہے، جو ان کا آخری قول ہو یا دلائل کتاب وسنت کی رو سے زیادہ قوی ہو، اسی طرح کچھ ایسا بھی ہوا ہے، کہ بعض صحابہ وتابعین نے ذبائح اہل کتاب کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ بسم اللہ قصداً بھی ترک کر دیں، تو ان کا ذبیحہ حلال ہے، ان حضرات کے قول کو بھی بعض نے تسامحاً امام شافعیؒ کی موافقت میں نقل کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں تین مسئلے الگ الگ ہیں:

۱:...... مسلمانوں کے ذبیحہ پر اللہ کا نام قصداً چھوڑ دینا۔

۲:...... مسلمانوں کے ذبیحہ میں سہواً ونسیاناً بسم اللہ کا ترک ہو جانا۔

۳:...... اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصداً اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔

ان میں سے آخری دو مسئلوں میں تو صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین میں اختلافات ہیں، مگر پہلے مسئلہ میں امام شافعیؒ سے پہلے کوئی اختلاف نہیں، بعض مصنفین نے آخری دو مسئلوں میں امام شافعیؒ کی موافقت کرنے والوں کا قول کہیں مسامحۃً مطلق قول شافعیؒ کی تائید میں بھی نقل کر دیا ہے، جس سے بعض حضرات کو مغالطہ لگا ہے، اس لئے صاحب ہدایہ کا یہ کہنا کہ یہ قول مخالف اجماع ہے، اپنی جگہ صحیح ودرست ہے، اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ان میں سے ایک دو قول بالکل امام شافعیؒ کی موافقت میں یعنی مسلمان کے قصداً ترک تسمیہ کی صورت میں بھی ذبیحہ کو حلال قرار دینا ان کا مسلک ہو، تو جمہور امت کے بالمقابل ایک دو قول کو منافی اجماع نہیں کہا جاسکتا۔

جیسا کہ اسی آیت کی تفسیر میں ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے لکھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

الا ان قاعدة ابن جرير انه لا يعتبر قول الواحد و الاثنين مخالفا لقول الجمهور فيعده اجماعاً فليعلم هذا والله الموفق. (ابن کثير ص: ١٧٠، ج: ٢)

مگر ابن جریر کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایک دو قول جو جمہور کے مخالف ہوں، اس کا اعتبار نہیں کرتے، بلکہ جمہور کے قول کو اجماع ہی قرار دیتے ہیں، اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ شافعیہ میں سے بھی بہت سے محقق حضرات نے امام شافعیؒ کے اس قول کو اختیار نہیں کیا، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان سے کون سا مسلمان واقف نہیں، اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ان کا فقہی مسلک امام شافعیؒ کی پیروی ہے، مگر انھوں نے احیاء العلوم کتاب الحلال والحرام میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

لان الأية ظاهرة في ايجابها و الاخبار متواترة فيه فانه صلى الله عليه و سلم قال لكل من سأله عن الصيد اذا ارسلت كلبك المعلم و ذكرت اسم الله فكل و نقل ذلك على التكرر و قد شهر الذبح بالبسملة و كل ذلك يقوى دليل الاشتراط.

(احیاء العلوم مصری، ص: ١٠٣، ج: ٢)

کیونکہ آیت قرآنی سے یہی ظاہر ہے کہ بسم اللہ پڑھنا ذبیحہ پر واجب ہے اور احادیث اس مسئلہ پر متواتر ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے شکار کے متعلق ہر سوال کرنے والے کو یہی جواب دیا ہے کہ جب تم نے اپنے تربیت یافتہ شکاری کتے کو بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑا تو اس کا شکار حلال ہے، اور یہ سوال و جواب بار بار پیش آیا ہے، اور امت میں ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا مشہور و معروف ہے یہ سب وجوہ اس کی تائید و تقویت کرتی ہیں کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لئے بسم اللہ شرط ہے۔

اور ابن کثیرؒ نے ایک شافعی المذہب عالم ابو الفتوح محمد علی طائی کی کتاب اربعین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے شافعی المذہب ہونے کے باوجود متروک التسمیہ عامداً کو حلال نہیں کہا۔ (ابن کثیر ص:۱۶۹، ج:۲، سورۃ انعام)

یہ بحث خاصی طویل ہوگئی لیکن اس کی ضرورت اس لئے تھی کہ ملک میں جو فتنہ مشینی ذبیحہ کا پھیلایا جارہا ہے، اس کی تمہید اسی بحث سے اٹھائی گئی ہے کہ ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا کوئی شرعی اہمیت نہیں رکھتا، مسلمان بالقصد بھی بسم اللہ ترک کردے، تو ذبیحہ حلال رہتا ہے، اول اس مسئلے کو دوسرے مسائل مثلاً ذبائح اہل کتاب اور نسیاناً ترک بسم اللہ کے ساتھ خلط ملط کر کے ایک اختلافی مسئلہ بنا دیا گیا، پھر اقوال مختلفہ میں سے اپنے مسلک کے مطابق ایک قول کو اختیار کر لینا کوئی مشکل کام نہ رہا۔

حالانکہ یہاں جس قول کو اختیار کیا جارہا ہے، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین میں امام شافعیؒ کے ایک قول کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں۔

اور امام شافعیؒ کے قول میں بھی تفصیل ہے ان کے نزدیک بھی بعض صورتیں متروک التسمیہ عامداً کی حرام ہیں، اور جن کو جائز کہا، ان میں ظاہر مذہب ان کا یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے، پھر بھی بہت سے علماء شافعیہ نے بھی اس مسئلے میں جمہور ہی کے قول کو ترجیح دی ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی، اور وجہ اس کی قرآن کی وہ واضح آیات ہیں، جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، پھر احادیث متواترہ نے اس کو اور بھی ناقابل تاویل بنا دیا، جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔

ذبائح اہل کتاب کا مسئلہ

قرآن کریم نے متعدد آیات میں ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کو شرط ضروری بتلا کر یہ واضح کر دیا کہ جانور کا ذبیحہ عام کھانے پینے اور برتنے کی چیزوں کی طرح نہیں، بلکہ اس کی ایک شرعی اور مذہبی حیثیت ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کا ذبیحہ حلال نہ ہو، کیونکہ وہ اس اسلامی پابندی پر ایمان ہی نہیں رکھتا کہ اللہ کے نام سے جانور حلال ہوتا ہے، اس کے بغیر مردار ہو جاتا ہے۔

لیکن سورۂ مائدہ کی آیت مذکورہ نے اس میں سے کفار اہل کتاب کو مستثنیٰ کر دیا ہے، آیت کے الفاظ یہ ہے:

> اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ط وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ. (مائدہ:۵)

> آج حلال ہوئی تم کو سب ستھری چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے، اور تمھارا کھانا ان کو حلال ہے، اور حلال ہیں تم کو پاک دامن عورتیں مسلمان اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو دی گئی کتاب تم سے پہلے۔

سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں مذکور تھا، **الیوم اکملت لکم دینکم** یعنی ہم نے آج تمھارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر مکمل کر دی، اس پانچویں آیت میں **الیوم احلت لکم الطیبات** کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ جو طیبات تم پر اب حلال رکھی گئی ہیں، وہ ہمیشہ کے لئے حلال ہیں، اب کسی نسخ کا احتمال نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اس آیت میں اول تو مسلمانوں کے لئے طیبات یعنی پاکیزہ

چیزوں کے حلال کرنے کا ذکر فرمایا، اس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ کفار خواہ مشرکین ہوں، یا اہل کتاب کسی کا مارا ہوا جانور مسلمانوں کے لئے حلال نہ ہو، کیونکہ وہ بظاہر طیبات میں داخل نہیں مگر اس کے بعد **وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم** فرما کر اہل کتاب کے ذبیحہ کو بطور استثناء مسلمانوں کے لئے حلال قرار دے دیا گیا، اسی طرح اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد کے نکاح کی بھی اجازت آیت کے آخر میں دے دی گئی، اس کی تفصیلی بحث تو آگے آرہی ہے۔

یہاں ایک جملہ اور قابل غور ہے **طعامکم حل لھم** یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے، اس میں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں کا کھانا تو سبھی کے لئے حلال ہے، مشرکین کے لئے بھی ممنوع نہیں، پھر اس جگہ اہل کتاب کے لئے خاص کر کے کیوں ذکر کیا گیا؟

علماء تفسیر نے اس کی کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں، ان میں سے زیادہ اقرب وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت نے اہل کتاب کے ساتھ دو معاملوں کی اجازت دی ہے، ایک ان کے ذبائح کھانے کی اجازت، دوسرے ان کی عورتوں سے نکاح کا جواز۔

اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص سے مقصود ان دونوں معاملوں میں ایک خاص فرق کا اظہار ہے، وہ یہ کہ طعام و ذبائح کا معاملہ تو دونوں طرف سے جائز ہے، اہل کتاب کے ذبائح مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کے اہل کتاب کے لئے جائز ہیں۔ مگر نکاح کا معاملہ ایسا نہیں، اس میں جواز صرف یک طرفہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، مگر مسلمان عورت کے لئے اہل کتاب مرد سے نکاح جائز نہیں، اس لئے طعام کے مسئلے کو دوطرفہ جواز کی صورت میں بیان کر دیا، اس کے بعد نکاح کے مسئلے میں صرف نساء اہل کتاب کی اجازت مسلمانوں کے لئے مخصوص کر کے بتلا دی، جس سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب مرد

سے جائز نہیں۔

آیت مذکورہ کے الفاظ کی تشریح وتفسیر کے بعد مسئلہ زیر بحث کا تجزیہ کیا جائے، تو چار سوال قابل غور ہیں:

۱:.....اول یہ کہ اہل کتاب سے کون لوگ مراد ہیں؟

۲:.....دوسرے یہ کہ طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

۳:.....تیسرے یہ کہ تمام کفار میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی حکمت کیا ہے؟

۴:.....چوتھے یہ کہ طعام اہل کتاب سے ان کا ہر کھانا بلا کسی قید وشرط کے مطلقاً مراد ہے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں، وہ سب مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا گیا، یا صرف وہی کھانا مراد ہے، جو اسلامی اصول کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔

پہلے سوال کا جواب گزشتہ تحریر میں بحوالہ تفسیر قرطبی ص:۲۶، ج:۲ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے بیان سے یہ آچکا ہے کہ اہل کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں، اور تفسیر بحر محیط میں ہے:۔

و ظاهر قوله اوتوا الكتاب انه مختص ببنى اسرائيل و النصارى الذين نزل عليهم التوراة و الانجيل .

(ص: ۴۳۱، ج:۳)

قرآن کے الفاظ الذین اوتوا الکتاب سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اور نصاریٰ کے ساتھ مخصوص ہے جن پر توراۃ وانجیل نازل ہوئی ہے۔ اور خود قرآنی تصریحات سے یہ بھی ثابت ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں جو یہود ونصاریٰ موجود تھے، اور جن کے کھانے اور عورتوں کی حلت کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، یہ وہی یہود ونصاریٰ ہیں، جن کے بارے میں قرآن کریم نے یہ بھی تصریح فرمادی ہے کہ یہ لوگ

اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کیا کرتے تھے، اور یہ کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کو خدا تعالیٰ کا شریک اور معبود بنا رکھا تھا، اور اسی لئے قرآن کریم نے ان کو کافر قرار دیا ہے۔

لقد كفر الذين قالوا ان الله هو المسيح بن مريم.

کافر ہو گئے وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ طعام اہل کتاب جس کے حلال ہونے کا اس آیت میں ذکر ہے ان اہل کتاب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصل تورات وانجیل پر عمل کرتے ہوں، بلکہ وہ سب یہود ونصاریٰ اس میں داخل ہیں، جو اصلی تورات وانجیل میں تحریف کر کے شرک میں مبتلا ہو گئے تھے، اور تورات وانجیل کے بہت سے احکام کو بھی بدل ڈالا تھا، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، بحر محیط وغیرہ میں تمام صحابہ وتابعین اور جمہور امت کا یہی مسلک نقل کیا گیا۔

صرف نام کے یہودی نصرانی بحقیقت دہریے اس میں داخل نہیں

آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے، جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں، مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود کے اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں، نہ تورات وانجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں، نہ موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کو اللہ کا نبی وپیغمبر تسلیم کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ وہ محض مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے، نصاریٰ بنی تغلب کے بارہ میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں، اس کی وجہ یہی بتلائی ہے کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے۔

روی ابن الجوزی بسندہ عن علیؓ قال لاتاکلوا من ذبائح نصاری بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا من النصرانیة بشئ الا شربھم الخمر و رواہ الشافعیؒ بسند صحیح عنه. (تفسیر مظھری ص: ۳۴، ج:۳ مائدہ)

ابن جوزی نے سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاری بنی تغلب کے ذبائح کو نہ کھاؤ، کیونکہ انھوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا، امام شافعیؒ نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں، نصرانی نہیں ہیں، اگر چہ نصرانی کہلاتے ہیں، اس لئے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا۔

جمہور صحابہ و تابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں، بالکل دین کے منکر نہیں، اس لئے انہوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

و قال جمھور الامة ان ذبیحة کل نصرانی حلال سواء کان من بنی تغلب او غیرھم و کذالک الیھودی

(تفسیر قرطبی ص:۷۸،ج:٦)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

خلاصہ یہ کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی ہی نہیں مانتے وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں، جس میں از روئے لغت عربی ہر قسم کے کھانے کی چیزیں داخل ہیں، لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے، کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں، کھانے پینے کی خشک چیزیں گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا مسلمانوں کے لئے حلال و جائز ہے، اس میں کسی کا کوئی خلاف نہیں، اور جس کھانے میں انسانی صنعت کو دخل ہے، جیسے پکی ہوئی روٹی، ترکاری وغیرہ اس میں چونکہ کفار کے برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے، بلا ضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں، مگر اس میں جو حال مشرکین بت پرستوں کا ہے وہی اہل کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذبائح کے گوشت میں ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں باتفاق امت طعام اہل کتاب سے مراد ان کے ذبائح ہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے لکھا ہے:

و الطعام اسم لما یو کل و الذبائح منه و هو ههنا خاص بالذبائح عند کثیر من اهل العلم بالتاویل و اما ما حرم من طعامهم فلیس بداخل فی عموم الخطاب

(تفسیر قرطبی، ص:۷۷، ج:۶)

لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی داخل ہیں اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا، اکثر علماء تفسیر کے نزدیک اور اہل کتاب کے طعام میں سے جو

چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں، وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔
اس کے بعد امام قرطبیؒ نے اس کی مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

لا خلاف بين العلماء ان ما لايحتاج الىٰ ذكاة كالطعام الذى لا محاولة فيه كالفاكهة و البر جائز اكله اذ لا يضر فيه تملك احد والطعام الذى تقع فيه المحاولة على ضربين احدهما ما فيه محاولة صنعة لاتعلق لها بالدين كخبزه الدقيق و عصره الزيت و نحوه فهذا ان تجنب من الذمى فعلى وجه التقذر و الضرب الثانى التذكية اللتى ذكرنا انها هى التى يحتاج الى الدين و النية فلما كان القياس ان لاتجوز ذبائحهم كما نقول انه لا ملة لهم و لاعبادة مقبولة لكن رخص الله تعالىٰ فى ذبائحهم على هذه الامة و اخرجها النص عن القياس على ما ذكرنا من قول ابن عباسؓ.

(تفسیر قرطبی، سورۂ مائدہ ص:۷۷، ج:۶)

علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ چیزیں جن میں ذکاۃ کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً وہ کھانا جس میں کوئی تصرف نہیں کرنا پڑتا ہے، جیسے میوہ اور گندم وغیرہ اس کا کھانا جائز ہے، اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بننا چنداں مضر نہیں ہے، البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے، جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً آٹے سے روٹی بنانا اور زیتون سے تیل نچوڑنا وغیرہ کافر ذمی کی ایسی چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ محض طبعی کراہت کی بنا پر ہوگا، اور دوسری قسم وہ ہے جس میں عمل ذکاۃ کرنا

پڑتا ہے، جس کے لئے دین اور نیت کی ضرورت ہے، تو اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ کافر کی نماز اور عبادتوں کی طرح اس کا عمل ذکاۃ بھی قبول نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن اللہ نے اس امت کے لئے خاص طور پر ان کے ذبائح حلال کر دیئے اور حضرت ابن عباسؓ کی نص نے اس مسئلے کو خلاف قیاس ثابت کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہل کتاب سے مراد اس آیت میں بالاتفاق علماء تفسیر وہ طعام ہے، جس کی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے، یعنی ذبیحہ اسی لئے اس طعام میں اہل کتاب کے ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں، اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعویٰ کو مجروح کر دیا، یہاں تک کہ شرک و کفر میں مبتلا ہو گئے، بخلاف بت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی و رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے اور جن کتابوں یا شخصیتوں پر ان کا ایمان ہے، وہ نہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، نہ ان کا رسول و نبی ہونا، اللہ کے کسی کلام سے ثابت ہے۔

اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی حکمت اور وجہ

زیر بحث مسئلے کا تیسرا سوال ہے اس کا جواب اکثر صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر کی طرف سے یہ ہے کہ تمام کفار میں سے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات کے باوجود ان دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے، یعنی وہ بھی ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں، اس کے بغیر جانور کو مردار و میتہ اور ناپاک و حرام قرار دیتے ہیں، اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے، ان کے مذہب میں بھی حرام ہے، اور جس طرح اسلام میں نکاح کا اعلان

اور گواہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے، اسی طرح ان کے موجودہ مذہب میں بھی یہی احکام ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیر نے یہی قول اکثر صحابہ و تابعین کا نقل فرمایا ہے، ان کی عبارت یہ ہے:

(و طعام اهل الكتاب) قال ابن عباس و ابو امامة و مجاهد و سعيد بن جبير وعكرمة و عطاء و الحسن و مكحول و ابراهيم النخعي و السدى و مقاتل بن حيان يعني ذبائحهم و هذا امر مجمع عليه بين العلماء ان ذبائحهم حلال للمسلمين لانهم يعتقدون تحريم الذبح لغير الله و لايذكرون على ذبائحهم الا اسم الله و ان اعتقدوا فيه تعالىٰ ما هو منزه عنه تعالىٰ و تقدس.

(ابن کثیر سورۂ مائدہ،ص:۱۹،ج:۳)

ابن عباسؓ، ابوامامہؓ، مجاھد، سعید بن جبیر، عکرمۃ، عطاء، حسنؒ، مکحولؒ، ابراھیم نخعیؒ، سدیؒ اور مقاتل بن حیان نے طعام اہل الکتاب کی تفسیر ان کے ذبائح کے ساتھ کی ہے، اور یہ مسئلہ علماء کے درمیان اجماعی ہے کہ ان کے ذبیحے مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کو حرام سمجھتے ہیں، اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیتے، اگر چہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں، جن سے باری تعالیٰ بری پاک اور بلند و بالا ہے۔

ابن کثیر کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام مذکور الصدر حضرات صحابہ و تابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے ان کے ذبائح مراد ہیں، اور ان کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے، جس کی تفصیل دوسرے سوال کے جواب

میں بھی گزر چکی ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان سب حضرات کے نزدیک ذبائح اہل کتاب کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود ونصاری کے مذہب میں بہت سی تحریفات کے باوجود ذبیحہ کا مسئلہ اسلامی شریعت کے مطابق باقی ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو وہ بھی حرام کہتے ہیں، اور ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں وہ تثلیث کے مشرکانہ عقیدہ کے قائل ہو گئے، اور اللہ اور مسیح بن مریم کو ایک ہی کہنے لگے، جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

لقد كفر الذين قالوا ان اللّٰه هو المسيح بن مريم.

بے شک کافر ہو گئے وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ذبیحہ کے متعلق تمام قرآنی آیات جو سورۂ بقرہ اور سورۂ انعام میں آئی ہیں، جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کو بھی اور اس جانور کو بھی جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام قرار دیا ہے۔ یہ سب آیتیں اپنی جگہ پر محکم اور معمول بہا ہیں، سورۂ مائدہ کی آیت جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے، وہ بھی ان آیات کے حکم سے مختلف نہیں، کیونکہ طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان کے موجودہ مذہب میں بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور اور وہ جانور جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام ہے۔ موجودہ زمانے میں تورات وانجیل کے جو نسخے اب موجود ہیں، ان میں بھی ذبیحہ اور نکاح کے احکام تقریباً وہی ہیں، جو قرآن اور اسلام میں ہیں، جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف کچھ عمل

کرتے ہوں، جیسا کہ خود مسلمانوں کے جاہل عوام میں بھی بہت سی جاہلانہ رسمیں خلاف قرآن وسنت شامل ہوگئی ہیں، مگر ان کو مذہب اسلام نہیں کہا جا سکتا، نصاریٰ کے جاہل عوام کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہی بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے طعام اہلِ کتاب کو حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبائح کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں، کوئی اس پر مسیح یا عزیر کا نام لیتا ہے کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ آیت مائدہ جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے، اس آیت نے ذبائح اہل کتاب کے حق میں سورۂ بقرہ اور انعام کی ان آیتوں میں تخصیص یا ایک قسم کا نسخ کردیا ہے، جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض اکابر علماء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات تابعین نے اہل کتاب کے متروک التسمیہ ذبیحہ اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے، ان کے نزدیک بھی اہل کتاب کا اصل مذہب تو اسلامی احکام سے مختلف نہیں ہے، مگر ان کے جاہل عوام یہ غلطیاں کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود ان حضرات نے جاہل اہل کتاب کو بھی عام اہل کتاب کے حکم سے الگ نہیں کیا، اور ذبیحہ اور نکاح کے معاملے میں ان کا بھی وہ حکم رکھا جو ان کے آباء واجداد اور اصل مذہب کے پیروؤں کا ہے کہ ان کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد ابوالفتح مقدسی سے سوال کیا کہ موجودہ نصاریٰ تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، مثلاً مسیحؑ یا عزیرؑ کا نام بوقت ذبح لیتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کیسے حلال ہوسکتا ہے، اس پر ابوالفتح مقدسی نے فرمایا:

هم من آبائهم و قد جعلهم الله تعالىٰ تبعاً لمن كان

قبلهم مع علمه بحالهم.

(احکام القرآن ابن عربی ص:۲۲۹، ج:اول)

ان کا حکم اپنے آباء واجداد کا سا ہے، (آج کے اہل کتاب کا) یہ حال اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا، لیکن اللہ نے ان کو ان کے آباء کے تابع بنادیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اسلاف امت میں جو بعض علماء نے اہل کتاب کے ایسے ذبائح کی اجازت دے دی ہے، جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بلکہ غیر اللہ کا لیا گیا ان کے نزدیک بھی اصل مذہب اہل کتاب کا یہی ہے، کہ یہ چیزیں ان کے مذہب میں بھی حرام ہیں، مگر ان حضرات نے غلط کار عوام کو بھی اس حکم میں شامل رکھا، جو اصل اہل کتاب کا حکم ہے، اس لئے ان کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دے دیا، اور جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس پر نظر فرمائی کہ اہل کتاب کے جاہل عوام جو غیر اللہ کے نام یا بغیر کسی نام کے ذبح کرتے ہیں، یہ اسلامی حکم کے تو خلاف ہے، اس لئے ان کے عمل کا احکام پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے، انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان لوگوں کا ذبیحہ طعام اہل کتاب میں داخل ہی نہیں اس لئے اس کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور ان کے غلط عمل کی وجہ سے آیاتِ قرآنی میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

اسی لئے تمام ائمہ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ سورۂ بقرہ اور انعام کی آیات میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا، یہی جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کا مذہب ہے جیسا کہ بحوالہ ابن کثیر اوپر نقل ہو چکا ہے، اور تفسیر بحر محیط میں بالفاظ ذیل مذکور ہے:

و ذهب الى ان الكتابى اذا لم يذكر الله على الذبيحة و ذكر غير الله لم توكل و به قال ابو الدرداء و عبادة بن الصامت و جماعة من الصحابة و به قال ابو حنيفة و ابو يوسف و محمد و زفر و مالك و كره

النخعی و الثوری اکل ما ذبح و اھل بہ لغیر اللہ.

(بحر محیط ص: ۴۳۱، ج: ۴)

ان کا مذہب یہ ہے کہ کتابی اگر ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لے، اور اللہ کے سوا کوئی نام لے، تو اس کا کھانا جائز نہیں، یہی قول ہے ابوالدرداءؓ اور عبادۃ بن الصامتؓ اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کا۔

اور یہی ابوحنیفہؒ، ابویوسفؒ، محمدؒ، زفرؒ اور مالکؒ کا مذہب ہے، نخعیؒ اور ثوریؒ اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور اسلاف امت کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہل کتاب کا اصل مذہب زمانہ نزول قرآن میں بھی یہی تھا کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا جائے، یا قصداً اللہ کا نام چھوڑا جائے، وہ حرام ہے، اسی طرح نکاح کی حلت و حرمت میں بھی اہل کتاب کا اصل مذہب موجودہ زمانے تک اکثر چیزوں میں اسلامی شریعت کے مطابق ہے، اس کے خلاف جو کچھ اہل کتاب میں پایا گیا، وہ جاہل عوام کی اغلاط ہیں، ان کا مذہب نہیں ہے۔

موجودہ تورات و انجیل جو مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں، ان سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، ملاحظہ ہوں ان کے مندرجہ ذیل اقوال:

بائیبل کے عہد نامہ قدیم میں (جو موجودہ زمانے کے یہود و نصاری دونوں کے نزدیک مسلم ہے) ذبیحہ کے متعلق یہ احکام ہیں:

۱...... جو جانور خود بخود مر گیا ہو، اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو، ان کی چربی اور کام میں لاؤ، تو لاؤ پر تم اسے کسی حال میں نہ کھانا۔ (احبار، ۷: ۲۴)

۲...... پر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے خدا کی دی ہوئی برکت کے موافق ذبح کر کے کھا سکے گا، ۔۔۔۔۔۔ لیکن تم خون کو

بالکل نہ کھانا۔ (استثناء،۱۲: ۱۵)

۳.....تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ (عہد نامہ جدید کتاب اعمال ۱۵: ۲۹)

۴.....عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے، جو قربانی غیر قومیں کرتی ہیں، شیاطین کے لئے قربانی کرتی ہیں نہ کہ خدا کے لئے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو، تم خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے دونوں میں سے نہیں پی سکتے۔ (کرنتھیوں ۱۰: ۲۰، ۲۱)

۵.....کتاب اعمال حواریین میں ہے:

ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا تھا کہ وہ صرف بتوں کی قربانی کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ (اعمال ۲۱: ۲۵)

یہ تورات وانجیل کی وہ تصریحات ہیں، جو آج کل کی بائیبل سوسائیٹیوں نے چھاپی ہوئی ہیں، جن میں سینکڑوں تحریفات وترمیمات کے بعد بھی بعینہ قرآن کریم کے احکام کے مطابق یہ چیزیں باقی ہیں، قرآن کریم کی آیت یہ ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ. (المائدہ : ۳)

تم پر حرام کر دیا گیا، مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، اور گلا گھونٹا ہوا، اور چوٹ کھا کر مرا ہوا، اور گر کر مرا ہوا، اور سینگ کھا کر مرا ہوا، اور جسے درندے نے کھایا ہو، الا یہ کہ تم نے اس کو پاک کر لیا ہو، اور وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا

جائے۔

اس آیت نے میتہ یعنی خود مرا ہوا جانور اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور گلا گھونٹا ہوا جانور اور چوٹ سے مارا یا اونچی جگہ سے گر کر مرا ہوا، یا سینگوں کی چوٹ سے مارا ہوا، اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو، سب حرام قرار دیئے ہیں۔

تورات وانجیل کی مذکورہ تصریحات میں بھی لحم خنزیر کے علاوہ تقریباً سبھی کو حرام قرار دیا ہے، صرف چوٹ سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا سینگوں سے مرنے والے جانور کی تفصیل اگر چہ مذکور نہیں ہے، مگر سب تقریباً خود مرے یا گلا گھونٹ کر مارے ہوئے کے حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کی تاکید فرمائی ہے، فکلوا مما ذکر اسم اللّٰہ علیہ اور جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کو حرام کیا ہے، لاتاکلوا مما لم یذکر اسم اللّٰہ علیہ بائیبل میں کتاب استثناء کی عبارت مذکور نمبر۲ سے بھی اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے، کہ جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔

اسی طرح نکاح کے معاملات میں بھی اہل کتاب کا مذہب اکثر چیزوں میں شریعت اسلام کے مطابق ہے، ملاحظہ ہو، احبار ۱۸: ۶ تا ۱۹ جس میں ایک طویل فہرست محرمات کی دی گئی ہے، جن میں بیشتر وہی ہیں، جن کو قرآن نے حرام کیا ہے، یہاں تک کہ جمع بین الاختین یعنی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کی حرمت اور حالت حیض میں صحبت کا حرام ہونا بھی اس میں مصرح ہے۔

نیز بائیبل میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بت پرست اور مشرک اقوام سے نکاح جائز نہیں، موجودہ تورات کے الفاظ یہ ہیں:

تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا، نہ ان کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا، اور نہ اپنے

بیٹوں کے لئے ان کی بیٹیاں لینا، کیونکہ وہ میرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے، تاکہ وہ اور خدا کی عبادت کریں۔ (استثناء:۷:۳،۴)

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال، اور دوسرے کفار کے ذبائح کو اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کے اغلاط ہیں، ان کا مذہب نہیں ہے۔

اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورۂ بقرہ، انعام، مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد یا نسخ یا تخصیص نہیں ہے، اور جن علماء تابعین نے غلط کار عوام کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا، اور آیات بقرہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے، اس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے ان اللّٰه هو المسيح بن مريم یعنی اللہ تو عیسیٰ بن مریم ہی ہیں، یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں، تو اس سے بھی مراد عیسیٰ بن مریم ہی لیتے ہیں، اس لئے ان کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہو گیا، اس بناء پر ان حضرات نے ذبائح اہل کتاب میں اس کی اجازت دے دی، ابن عربی نے احکام القرآن میں اس بنیاد کی وضاحت فرمائی ہے۔

(احکام ابن عربی ص:۲۲۹، ج:۱)

مگر جمہور امت نے اس کو قبول نہیں کیا، جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر و تفسیر بحر محیط ابھی گزر چکا ہے، اور تفسیر مظہری میں اقوال مختلفہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

و الصحيح المختار عندنا هو القول الاول يعني ذبائح اهل الكتاب تاركاً للتسمية عامداً او على غير

اسم اللّٰہ تعالیٰ لایو کل ان علم ذلک یقینا او کان غالب حالھم ذاک و ھو محمل النھی عن اکل ذبائح نصاریٰ العرب و محمل قول علیؓ لاتاکلوا من ذبائح نصاریٰ بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا من النصرانیۃ بشیٔ الا بشربھم الخمر فلعل علیاً علم من حالھم انھم لایسمون اللّٰہ عند الذبائح او یذبحون علی غیر اسم اللّٰہ.

فکذا حکم ان نصاری العجم ان کان عادتھم الذبح علی غیر اسم تعالیٰ غالباً لا یو کل ذبیحتھم و لاشک ان النصاری فی ھذا الزمان لایذبحون بل یقتلون بالوقذ غالباً فلایحل طعامھم. (تفسیر مظھری ص:۳۷، ج: ۳)

اور صحیح اور مختار ہمارے نزدیک وہ پہلا ہی قول ہے، یعنی یہ کہ اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہو، یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں، وہ حلال نہیں، اگر یقینی طور پر اس کا علم ہو جائے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا یا غیر اللہ کا نام لیا ہے، یا اہل کتاب کی عام عادت ہی یہ ہو جائے۔ جن بزرگوں نے عرب کے نصاریٰ کے ذبائح کو منع کیا ہے، ان کے قول کا مقصد بھی یہی ہے، اسی طرح حضرت علیؓ نے جو یہ فرمایا کہ نصاریٰ بنی تغلب کے ذبائح کھانا جائز نہیں کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کچھ نہیں لیا، اس کا محمل بھی یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ ثابت ہوا ہوگا کہ بنی تغلب اپنے ذبائح پر اللہ کا نام نہیں لیتے یا غیر اللہ کا نام لیتے ہیں، پس یہی حکم عجمی نصاریٰ کا بھی ہے کہ اگر ان کی عادت یہی ہو جائے کہ عام طور پر غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں، اور اس میں شک نہیں کہ آج کل کے نصاریٰ تو ذبح ہی نہیں کرتے، بلکہ عام طور پر چوٹ

مار کر ہلاک کرتے ہیں، اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

مصر کے مفتی عبدہ اور ان کا فتویٰ

اب سے نصف صدی پہلے مصر کے مفتی عبدہ نے پوری امت اسلامیہ اور ائمہ اربعہ کے خلاف یورپ میں ہونے والے سب ذبائح کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا، جس پر پورے عالم میں اضطراب پیدا ہوا، مفتی عبدہ کو ان کے عہدہ سے ہٹانے کے مطالبات ہوئے، اطراف عالم کے علماء نے ان کے فتویٰ کی تردید کی۔

مفتی عبدہ کی علمی وسعت اور وسیع مطالعہ سے کسی کو انکار نہیں، لیکن لغزش وخطاء سے انبیاء کے سوا کوئی معصوم نہیں، اور یہ بھی اسلام کا دائمی معجزہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی اگر کتاب وسنت اور جمہور امت کے خلاف کسی لغزش میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بھی امت ان کے فتویٰ کو قبول نہیں کرتی۔

مفتی عبدہ کا تو کہنا کیا ہے، اسلامی دنیا کے مسلم مقتدا حضرت امام شافعیؒ نے خود ذبیحہ کے متعلق جمہور امت سے مختلف یہ رائے اختیار کی کہ کسی ذبیحہ پر قصداً بسم اللہ چھوڑ دینا اگرچہ ناجائز ہے، اور ایسے ذبیحہ کا گوشت کھانا بھی مکروہ ہے، مگر اس کو حرام نہیں کہا جا سکتا، جب کہ جمہور امت اس کو نص قرآنی کی رو سے قطعی حرام کہتی ہے، امت اسلامیہ کے بڑے بڑے ائمہ نے امام شافعیؒ کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کے اس فتویٰ کو خلاف اجماع ایک اجتہادی لغزش قرار دے دیا، اور خود شافعی المسلک علماء میں بھی متعدد حضرات نے اس رائے کو قبول نہیں کیا۔

مفتی عبدہ کو کتنا ہی بڑا عالم کہا جائے مگر امام شافعیؒ سے ان کو کیا نسبت جمہور امت نے امام شافعیؒ کے اس قول کو اجتہادی لغزش کہنے سے گریز نہیں کیا تو مفتی عبدہ کی کھلی ہوئی لغزش کو کون قبول کرتا، پھر امام شافعیؒ تو اس فعل کو ناجائز اور گوشت کو مکروہ قرار دیتے ہیں، اور مفتی عبدہ نے اسلامی ذبیحہ کے سارے اصول اور پابندیوں کو یکسر ختم کر

کے یورپین ذبیحہ کو مطلقاً حلال ٹھہرا دیا، جو امام شافعیؒ کے مسلک کے بھی خلاف ہے، اس لئے علماء امت نے مفتی عبدہ کے اس فتویٰ کو قرآن وسنت کے نصوص اور ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے خلاف قرار دیا، اور اسلامی دنیا کے ہر علاقہ سے اس کی تردید میں مضامین لکھے گئے۔

مفتی عبدہ کے شاگرد علامہ رشید رضا مصری مصر کے اہل قلم صحافی اور ذی علم ہیں، انہوں نے اپنے استاد کی حمایت میں مضامین لکھے، اور اپنے سیاسی اقتدار اور خاص کوششوں کے ذریعہ کچھ علماء کی موافقت بھی حاصل کرلی، اس طرح یہ فتنہ مصر میں دب گیا، مگر کسی فتنہ کا دب جانا اور چیز ہے، اور فتویٰ کا مانا جانا دوسری چیز۔ اس زمانہ کے اخبارات ورسائل دیکھے جائیں، تو یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں رہ سکتی کہ پوری دنیا کے علماء نے مفتی عبدہ کے اس فتویٰ کو غلط ناقابل اعتبار قرار دیا تھا۔

ذبیحہ کے شرعی احکام اور اس کے ارکان وشرائط قرآن وسنت کی واضح دلائل کے ساتھ پہلے لکھے جا چکے ہیں، اس کے بعد میں مفتی عبدہ کے فتویٰ اور رشید رضا صاحب کی طویل بحث کی تفصیلی تردید میں اپنے قارئین کو الجھانے کے بجائے صرف اتنا کافی سمجھتا ہوں کہ ذبیحہ کے مسئلے میں مفتی عبدہ اور رشید رضا صاحب کی اصلی رائے کو واضح الفاظ میں پیش کردوں، جو طویل بحثوں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے، وہ مسلمانوں کے سامنے واضح ہوکر آجائے، تو وہ اپنی تردید آپ ہی کر دے گی۔ کیونکہ اس کا قرآن وسنت کی نصوص اور ائمہ فقہاء کی اجماعی تحقیق کے مخالف ہونا اتنا واضح ہے کہ ہر لکھا پڑھا مسلمان اس کی مخالفت کو محسوس کرسکتا ہے۔

ذبیحہ کے متعلق مفتی عبدہ کی انوکھی تحقیق

اسلام کے قرن اول سے لے کر آج تک ہر طبقے اور ہر فرقے کے مسلمان اس

عقیدہ پر متفق ہیں کہ معاشرتی امور میں سے نکاح وطلاق کی طرح ذبیحہ بھی ایک خالص مذہبی چیز ہے، جو قرآن وسنت کے مقرر کردہ اصول وشرائط کے بغیر حلال نہیں ہوتا، اسی لئے اس پر بسم اللہ پڑھنا اور ذبح کرنے والے کا مسلمان یا اہل کتاب میں سے ہونا نص قرآنی میں شرط قرار دیا ہے جو خالص مذہبی چیز ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں اسلامی ذبیحہ کو ان شعائر میں شمار فرمایا ہے جن سے مسلمان کا مسلمان ہونا پہچانا جاتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

من صلی صلوتنا و استقبل قبلتنا و اکل ذبیحتنا فذالک المسلم الذی له ذمة اللّٰه و رسوله.

(صحیح بخاری باب استقبال القبلة)

جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف نماز میں رخ کیا، اور ہمارا ذبیحہ کھایا، وہ ہی مسلمان ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں ہے۔

اس میں جس طرح نماز اور اسلامی قبلہ کو مسلمان کی علامت قرار دیا ہے، اسی طرح اسلامی ذبیحہ کو اسلام کا شعار اور علامت بتلایا ہے۔

ایک حدیث میں مجوسی کفار کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کے ساتھ وہ ہی معاملہ کیا جائے، جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے، صرف دو چیزوں کا فرق ہے وہ یہ کہ:

غیر ناکحی نسائهم و لا آکلی ذبیحتهم.

یعنی نہ تو ان کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز ہے، نہ ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔

اس حدیث میں یہ بات اور واضح ہوگئی کہ نکاح اگرچہ انسانی عادات اور معاشرتی امور میں سے ہے لیکن اسلام نے اس پر بھی کچھ مذہبی پابندیاں عائد کی ہیں،

جن کے بغیر شرعاً نکاح نہیں ہوتا، اسی طرح ذبیحہ بھی ایسے ہی امور عادیہ میں سے ہونے کے باوجود اس پر اسلامی پابندیاں ہیں، جن کے بغیر ذبیحہ حلال نہیں ہوتا، اور یہ ایک ایسی بات ہے، جس کو ہر طبقے اور ہر فرقے کے مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے، اور ضروریات دین میں داخل سمجھتا ہے، اس پر کچھ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

قرآن کریم میں جانوروں کے حلال کرنے کے لئے تین لفظ آئے ہیں، ذکوٰۃ، ذبح، نحر۔

ذکوٰۃ لفظ مشترک ہے، جو ذبح نحر کو شامل ہے، اور غیر اختیاری ذکاۃ کی ان تمام صورتوں کو بھی جن سے شرعاً جانور حلال ہو جاتا ہے، سب کو شامل ہے، اور باتفاق امت ذکوٰۃ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، جیسے صلوٰۃ اور صوم جس طرح صلوٰۃ اور صوم کا مفہوم شرعی وہی معتبر ہے، جو قرآن کی دوسری آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ثابت ہے، محض لغوی مفہوم مراد لینا تحریف قرآن ہے، اسی طرح لفظ ذکوٰۃ بھی خالص اصطلاحی لفظ ہے، جس کی دو قسمیں اختیاری اور غیر اختیاری قرآن میں مذکور ہیں، اور دونوں کے احکام الگ الگ مذکور ہیں، حضرات محدثین وفقہاء نے ذکوٰۃ اختیاری کو ذبائح کے عنوان سے اور غیر اختیاری کو صید کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، مگر دونوں کے لئے از روئے قرآن وسنت کچھ ارکان وشرائط ہیں، جن کی تفصیل پہلے لکھی جا چکی ہے۔

مگر مفتی عبدہ صاحب نے قرآن کے اس اصطلاحی لفظ کو بھی تمام فقہاء و مفسرین کے خلاف ایک نئے معنی پہنائے، جس کا خلاصہ ان کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ذکوٰۃ کے لئے صرف اتنا کافی ہے، کہ کسی جانور کو کھانے کی نیت سے بالقصد مارا جائے، مارنے کی صورت کچھ بھی ہو، انھوں نے ذکوٰۃ اختیاری کو بھی قرآن وسنت کی تصریحات کے خلاف غیر اختیاری ذکوٰۃ یعنی شکار پر قیاس کر کے ایک کر ڈالا ہے، اور

اختیاری ذکوۃ میں جو باتفاق امت حلقوم کی رگوں کا کاٹنا شرط ہے، انھوں نے اس کا بھی انکار کردیا، وہ تو یہاں تک پہنچے ہوئے ہیں کہ جانور کو بجلی کے کرنٹ کے ذریعہ مار دیا جائے، تو وہ بھی حلال ہے، اور حلال ہی نہیں بلکہ افضل و مستحسن بھی ہے۔

تفسیر المنارص:۱۴۴ جلد ۶ میں یہ سب تفصیل موجود ہے، اس کا ایک جملہ یہ ہے:

و انی لاعتقد ان النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم لو اطلع علی طریقة التذکیة اسهل علی الحیوان و لاضرر فیها کالتذکیة بالکهربائیة ان صح هذا الوصف فیها لفضلها علی الذبح. (المنار ص:۱۴۴، ج:۶)

اور میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تذکیہ کا کوئی ایسا طریقہ معلوم ہوتا، جو جانوروں کے لئے سہولت کا اور بے ضرر ہو، جیسا بجلی کے کرنٹ سے مارنے کا تذکیہ ہے، اگر یہ وصف اس میں صحیح ہو، تو آپ اس طریقہ کو اسلامی ذبح کے طریقے سے افضل قرار دیتے۔

اس میں بجلی کے کرنٹ سے مارنے کو بھی تذکیہ کہا گیا ہے اور یہ کتنی بڑی جرأت ہے کہ اپنے اس لغو قیاس اور غلط نظریے کے متعلق یہ بھی دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوتی تو اسلامی ذبح کے طریقے کو چھوڑ کر اسی کو افضل قرار دیدیتے۔ انا للّٰہ و انا الیه راجعون

ان کے اسی اجتہاد کا تکملہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک جانور کا گلا گھونٹ کر بالقصد مار دیا جائے، تو وہ بھی حلال ہے، اور اس میں آیت قرآنی کی صریح مخالفت کا جواب منخنقہ اور مخنوقہ کی بحث کا مغالطہ پیش کر کے دیا ہے، جو تمام صحابہ و تابعین اور جمہور امت کے خلاف ہے۔ (تفسیر المنارص:۱۳۷، ج:۶)

مفتی عبدہ نے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کی ضرورت کا پہلے ہی انکار کر دیا تھا، حلقوم کی رگیں کاٹنے کی ضرورت کا بھی انکار صاف آ گیا، گلا گھونٹ کر بالقصد مارے ہوئے جانور بھی حلال ہو گئے، تو اب ان کی تحقیق کی رو سے حرام صرف وہ جانور رہ گیا، جو اپنی موت مر گیا ہو یا کسی انسان کے قصد و اختیار کے بغیر کسی ٹکر سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا خود بخود گلا گھٹ کر مر گیا ہو، اور جس کو کسی انسان نے کھانے کی نیت سے بالقصد مارا ہو، وہ سب حلال ہے، کوئی مارے کسی طرح مارے اللہ کا نام لے یا نہ لے، ذبح کرنے والا مسلمان ہو، یا کافر، حلقوم کی رگیں کاٹے، یا نہ کاٹے۔ خصوصاً اہل کتاب کے معاملے میں تو ان کی تحقیق یہ ہے کہ طعام اہل کتاب بغیر کسی قید و شرط کے سب جائز ہے، خواہ اہل کتاب نے گلا مروڑ کر مارا ہو، یا جھٹکے سے قتل کیا ہو، یا اور کسی صورت سے۔

(تفسیر المنار ص:۲۰۰، ج:۶)

صرف اتنی عنایت اسلام اور مسلمانوں پر فرما دی کہ طعام اہل کتاب عام ہے، تو اس میں تو خنزیر بھی داخل تھا اس کو حلال نہیں کیا، اگر چہ ان کی تفسیر کا اصل مقتضا یہی تھا کہ طعام اہل کتاب عام ہے، تو اس میں خنزیر بھی داخل ہو۔

اس کے بعد واضح لفظوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ جانور کا گوشت کھانا امور طبعیہ عادیہ میں سے ہے، مذہب و ملت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شرعی پابندیاں صرف عبادات میں ہوا کرتی ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

و امور العادات فی الاکل و اللباس لیست مما یتعبد اللّٰہ الناس تعبداً باقرارھم علیه و انما تکون احکام العبادة بنص الشارع. (المنار، ص:۱۴۵، ج:۶)

اور کھانا اور لباس وغیرہ جو عادات میں سے ہیں، ان چیزوں میں سے نہیں ہیں، جن کے ذریعہ اللہ کی عبادت کی جاتی ہے، نصوص شریعت کی

پابندی تو صرف عبادات میں ہوتی ہے۔

مفتی عبدہ کے اس اجتہاد کا حاصل اس کے سوا کیا ہے، کہ کھانے، پینے، پہننے، برتنے کی چیزوں میں حلال وحرام کی بحث ہی فضول ہے، اگر یہی اجتہاد ہے، تو نکاح طلاق بھی امور عادیہ طبعیہ میں سے ہیں، ان میں بھی حلال وحرام کی بحث لغو اور شرعی پابندیاں غلط ہوں گی۔

اس دور آزادی اور دین بیزاری کے لئے اس سے اچھا نسخہ کیا ہو سکتا تھا، اسی لئے مغرب زدہ نوجوانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔

مفتی عبدہ اور علامہ رشید رضا مصری سے یہ لغزش ہوئی، اور بڑی سخت ہوئی مگر ان کی علمی خدمات اور سوابق سے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے دعاء اور امید مغفرت کی ہے۔

لیکن فکر ان لوگوں کی ہے جنھوں نے کسی ترجیحی دلیل یا مغالطہ کی بناء پر نہیں، بلکہ اپنی تن آسانی اور نفس کی پیروی کے لئے اس فتویٰ کا بہانہ اور آلۂ مدافعت بنالیا ہے۔

کسی بڑے سے بڑے عالم سے کوئی لغزش ہو جانا کوئی بعید نہیں، عرب کا مشہور مقولہ ہے: **لكل جواد كبوة و لكل عالم هفوة** یعنی اچھے گھوڑے کو ہی ٹھوکر بھی لگتی ہے، اور ہر عالم سے کوئی بات لغو وغلط بھی صادر ہو جاتی ہے۔

قابل افسوس حال اس شخص کا ہے، جو جمہور امت کے فتویٰ اور بیانات واضح ہونے کے باوجود ان سب میں سے اسی لغزش کو اپنا مذہب بنالے۔

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام اوزاعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

من اخذ بنوادر العلماء خرج من الاسلام.

یعنی جو شخص علماء کی نوادر اور لغزشوں ہی کو اپنا مذہب بنالے، وہ اسلام سے نکل جائے گا۔

سنا جاتا ہے کہ بہت سے عرب حضرات جو یورپ کا سفر کرتے ہیں، یا وہاں مقیم ہیں، وہ اسی مفتی عبدہ کے فتویٰ کو بہانہ بنا کر یورپ کے غیر مذبوح حرام گوشت کھانے کھلانے میں کوئی احتیاط نہیں کرتے، اور قدرتی طور پر عرب حضرات کو لوگ اپنا مقتدا سمجھتے ہیں، اس سے دوسرے مسلمانوں میں بھی یہ وبا عام ہونے لگی، کچھ دین کی فکر رکھنے والے مسلمان بھی ہیں، جن کے سوالات یورپ کے ذبائح کے متعلق آتے رہتے ہیں، ایسے ہی ایک سوال کا جواب بزبان عربی عرصہ ہوا دیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی اردو ترجمہ اس رسالہ کے آخر میں شامل کر دیا جائے تا کہ یورپ میں رہنے والے مسلمانوں کی آگاہی کا ذریعہ بنے۔ واللہ الموفق والمعین

مسئلہ ذبیحہ

اور ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے ڈائرکٹر کا فتنہ

پاکستان کے مسلمانوں کی بڑی کوششوں کے بعد حکومت پاکستان میں تحقیقات اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ ادارہ مستشرقین یورپ کی اسلام کے خلاف ہفوات کا دفاع کرے، اور دور جدید میں پیدا ہونے والے نئے مسائل شرعیہ کی اسلامی اصول کے تحت تحقیقات کرے، ان مسائل میں جو مشکلات مسلمانوں کو درپیش ہیں، کتاب وسنت اور فقہاء امت کے اجتہادات کی روشنی میں ان کا حل تلاش کر کے ملک کے علماء ماہرین کے مشورہ سے ان میں فیصلے دے۔

لیکن ہماری شامت اعمال سے اس ادارہ کا ڈائرکٹر ایک ایسے صاحب کو بنا دیا گیا، جن کی تعلیم یورپ کے مستشرقین یہود ونصاریٰ ہی کی مرہون منت تھی، انھوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ سیکھا، وہ یورپ میں انہی مستشرقین کے زیر سایہ سیکھا، ان کے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کے زاویے وہی تھے، جو مستشرقین کے تھے، انھوں نے اصول اسلامی کے تحت مسائل کا حل تلاش کرنے کے بجائے خود اصول اسلام میں ترمیم اور حذف واز دیاد کا راستہ اختیار کر کے تحریف دین کا کام انجام دینا شروع کر دیا، کبھی سود کو حلال کرنے پر مقالے اور کتابیں لکھیں، کبھی زکوٰۃ کے قرآنی اور شرعی نصاب میں تبدیلی کو اسلام کی خدمت قرار دیا، اب جانوروں کے ذبیحہ کو موضوع بحث بنا کر قرآن وسنت میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا۔

وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان کے متعدد اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ یہاں بہت سے شہروں کی میونسپل کمیٹیوں نے مذبح خانوں کے لئے ذبیحہ کی مشینیں یورپ سے درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اور عنقریب بڑے شہروں میں ذبیحہ ان مشینوں کے ذریعہ ہوا کرے گا، ملک کے علماء اور عام مسلمانوں میں یہ سوالات ابھرے کہ مشینی ذبیحہ میں شریعت اسلامیہ کی شرائط ذبح کو کیسے پورا کیا جائے گا۔ اور اگر ان شرائط کو پورا نہ کیا گیا تو گوشت کیسے حلال ہوگا۔

یہ سن کر ہمارے ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے محققین نے اپنی ریسرچ و تحقیق کا رخ اسلامی ذبیحہ کی طرف پھیر دیا، ان کا یہ قدم مبارک و مسعود ہوتا، اور ان کی کوشش وقت کی ایک ضرورت کو پورا کرتی، اگر صحیح اصول سے کام لیا جاتا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ:

ا:......سب سے پہلے مشینی ذبیحہ کے جو طریقے یورپ کے مختلف شہروں میں رائج ہیں، ان کی مکمل معلومات بہم پہنچا کر عام مسلمانوں خصوصاً اہل علم کے لئے غور و فکر کی راہ ہموار کرتے۔

۲:......ان میں کوئی طریقہ ذبح کا اسلام کے مسلمہ اصول کے مطابق موجود تھا، تو اس کی تائید و حمایت کرتے، ملک کی میونسپل کمیٹیوں کو توجہ دلاتے کہ اگر ذبیحہ کے لئے مشینوں کا استعمال ناگزیر ہی ہے تو فلاں قسم کی مشین درآمد کریں، دوسری مشینوں سے پرہیز کریں، تاکہ بلاوجہ مسلمانوں میں خلفشار پیدا نہ ہو، جیسا کہ حال میں بعض بیانات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یورپ میں مشینی ذبیحہ کا ایک طریقہ ایسا بھی رائج اور موجود ہے، جس میں مشین کا کام صرف جانور کو قابو میں کرنا ہوتا ہے، پھر کوئی انسان اس کو چھری سے ذبح کرتا ہے، اس کے بعد کھال، بال، ہڈی وغیرہ صاف کرنے کا سب کام مشین کرتی ہے۔

۳:......اگر بالفرض مشینی ذبیحہ کا کوئی طریقہ بھی اسلامی اصول پر پورا نہیں اترتا

تھا، تو ریسرچ و تحقیق کا رخ اس طرف پھیرنا چاہئے تھا کہ ماہرین سائنس کو ایسی ترمیم کی طرف توجہ دلائیں، جس سے اس کا ذبیحہ اسلامی اصول کے خلاف نہ رہے، اور جو آسانیاں مشینی ذبیحہ سے مطلوب ہیں، وہ باقی رہیں، اس سلسلے میں اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ اسلامی اصول کے دائرہ میں رہ کر جس قدر سہولت اور وسعت دی جا جاسکتی ہے، اسلامی فقہ میں غور وفکر اور اہل علم کے مشوروں کے بعد اس سہولت سے کام لیتے۔

مگر ہمارے یہ محققین یہ دردسر کہاں مول لیتے، انھوں نے اس کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ یورپ میں جو طریقے مشینی ذبیحہ کے رائج ہیں ان کی پوری تفصیلات معلوم کر کے پیش کر دیتے اس کے بعد مشینی ذبیحہ کے حلال یا حرام ہونے کی بحث چھیڑتے کہ اس پر جو بحث بھی ہوتی، وہ بصیرت کے ساتھ ہوتی، انھوں نے صرف یہ خدمت انجام دی کہ اب سے نصف صدی پہلے مصر کے مفتی عبدہ نے پوری امت اسلامیہ اور ائمہ اربعہ کے خلاف یورپ میں ہونے والے ذبائح کے حلال ہونے فتویٰ دے دیا تھا، جس پر پورے عالم اسلام میں شور مچا، مفتی عبدہ کو عہدہ افتاء سے علیحدہ کرنے کے مطالبات ہوئے۔

ہمارے ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ڈائرکٹر صاحب نے تحقیق کا نام لے کر بعینہٖ مفتی عبدہ کا یہ فتویٰ اور انھیں کے دلائل عربی سے اردو میں منتقل کر دیے ہیں، جس میں حدیث وتفسیر اور فقہ کی بڑی بڑی اہم کتابوں کے حوالے موجود تھے، اس سے ہمارے اردو خواں طبقہ پر یہ اثر ڈالا کہ ڈاکٹر صاحب وقت کے بڑے متبحر اور محقق عالم ہیں۔

اس وقت تفسیر المنار کی جلد ششم میرے سامنے ہے، جس کا دل چاہے اس کتاب کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون کا اس سے موازنہ کرے، اس میں کوئی مبالغہ نہ پائے گا۔

خلاصہ یہ ہے، کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے مسئلہ ذبیحہ کے متعلق ریسرچ (تحقیق) کی ادنیٰ زحمت گوارا نہیں فرمائی کام صرف اتنا کیا کہ مفتی عبدہ کی تحریر کا اردو ترجمہ کر کے نصف صدی پہلے کے خوابیدہ فتنہ کو بیدار کیا، اور اپنے نزدیک پاکستان میں یورپ کے طریقہ ذبح کو اس کی تفصیلات اور صحیح صورت معلوم کئے بغیر رواج دینے کا راستہ ہموار کر دیا، لیکن اس کا قدرتی اثر وہی ہوا جو اب سے پہلے مصر میں ہو چکا تھا کہ دینی حلقوں میں سخت اضطراب پیدا ہوا اور ملک بھر میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔

فالیٰ اللّٰہ المشتکیٰ

مشینی ذبیحہ

اب رہا مسئلہ مشینی ذبیحہ کا تو اسلامی ذبیحہ کے ارکان وشرائط اور متعلقہ احکام قرآن وسنت کے دلائل اور ائمہ مجتہدین کی تحقیقات سے مفصل بیان کر دینے کے بعد دراصل یہ کوئی مستقل مسئلہ نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ ایک واقعاتی سوال ہے کہ مشینی ذبیحہ میں اسلامی ذبیحہ کے ارکان وشرائط پورے ہو جاتے ہیں، یا نہیں؟ پہلی صورت میں مشین کا ذبیحہ حلال اور دوسری صورت میں حرام ہونا متعین ہے، اور جب مسئلہ واقعاتی ہے، تو جب تک ان مشینوں کی صحیح صورت حال معلوم نہ ہو کوئی جواب دینا بے کار ہے۔

اب تک مشینی ذبیحہ کی جو بحثیں رسائل واخبارات میں آتی ہیں، وہ صحیح صورت حال کی تحقیق سے پہلے محض مفروضہ صورتوں سے متعلق رہیں مجھ سے بھی یہ سوال کیا گیا تو سائل کی بیان کی ہوئی صورت مفروضہ پر اس کا جواب لکھا گیا، جس میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ بہت سے جانوروں کو مشین کے نیچے کھڑا کر کے بیک وقت سب کی گردنیں مشین کی چھری سے کاٹ کر جدا کر دی جاتی ہیں، لیکن اسی عرصہ میں کچھ دیکھنے والوں کے بیانات سے کچھ اخباری مقالات سے یہ معلوم ہوا کہ مشینوں کے ذریعہ ذبح کرنے کا

کوئی ایک معین طریقہ نہیں بلکہ مختلف ملکوں اور شہروں میں اس کی مختلف صورتیں رائج ہیں، جن میں ایک صورت وہ بھی ہے، جس کو اسلامی ذبیحہ کا نام دیا جاتا ہے۔

اس میں مشین کا کام صرف جانور کو قابو کرنے کا ہوتا ہے، اور ذبح کوئی انسان اپنی چھری سے کرتا ہے، پھر کھال، بال، ہڈی وغیرہ صاف کرنے کا کام سب مشین کرتی ہے۔

ان حالات میں کسی مفروضہ صورت پر بحث فضول ہے، جب تک کہ درآمد کی ہوئی مشین کی صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو، کوئی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔

اتنی بات متعین ہے کہ اگر جانور کی عروق ذبح نہیں کاٹی گئیں، یا ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی نہیں ہے، یا سب کچھ ہے، مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا قصداً چھوڑ دیا ہے، یا کسی غیر اللہ کا نام اس پر ذکر کیا ہے، تو وہ ذبیحہ حلال نہیں کسی مشین میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی نہ ہو، تو اس کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے، اور ان میں سے ایک شرط بھی فوت ہوجائے، تو ذبیحہ حرام ہوجائے گا۔

اور جب تک صحیح صورت حال معلوم نہ ہو، اس وقت تک مشینی ذبیحہ کے گوشت سے احتیاط کرنا واجب ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ

محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ

توضيح كلام أهل الله
فيما أهل به لغير الله

تاریخ تالیف ______

مقامِ تالیف ______ ماخوذ از امداد المفتیین

یہ تقرب الی اللہ کے لئے کسی جانور کو نامزد کرنے کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام پر مشتمل یہ اہم رسالہ امداد المفتیین کا حصہ رہا تھا اب اسے جواہر الفقہ جدید میں بھی شامل کردیا گیا ہے۔

توضیح کلام اہل اللہ فیما اہل بہ لغیر اللہ

سوال (۸۳۷) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اس ریاست قرولی کے اندر ایک میلہ کیلا دیوی کا ہوتا ہے اور اہل ہنود وغیرہ اس میلہ میں کثرت سے شریک ہوتے ہیں، اس دیوی کے مندر کا ایک پجاری ہے جو چڑھاوا اس دیوی پر چڑھایا جاتا ہے وہ پجاری کا حق ہوتا ہے۔ چونکہ اس دیوی کا انتظام ریاست کے تحت میں ہے۔ لہٰذا میلہ کا انتظام بھی ریاست کی طرف سے ہوتا ہے اور ہمیشہ سے یہ عمل ہے کہ ہر سال پندرہ روز میلے کے ایام کا جو چڑھاوا ہوتا ہے وہ حق راج ہوتا ہے اور نقد وغیرہ جملہ سامان کو ملازمان راج سنبھال لیتے ہیں جس کو تمام لوگ جو چڑھانے والے ہیں خوب جانتے ہیں اور وہ اپنے چڑھاوے کو ریاست کے حوالہ کر جاتے ہیں۔ علاوہ نقد زیور وغیرہ کے بکرے اور بھینسے اس پر چڑھائے جاتے ہیں جو لوگ چاہتے ہیں وہ اسی وقت اپنے بکروں کی یا بھینسوں کی اسی مندر پر تلوار سے گردن اڑا دیتے ہیں اور جو نہیں چاہتے وہ اپنے بکروں کا کان کاٹ کر حوالہ ملازمان راج کر دیتے ہیں۔ ایسے جانوروں کو منتظمان ریاست اپنی تحویل میں لے لیتے۔ جب میلہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ جانور جو کان کاٹ کر چھوڑے گئے اور ملک راج کر دیئے گئے ان کو ریاست کی طرف سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور کچھ جانور بطور انعام ملازمان راج کو تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ اس تقسیم میں مسلمان ملازمان بھی شامل ہیں ان کو وہ بکرے ملتے ہیں۔ اور قصابان بھی کبھی ان کو خرید لیتے ہیں اور ذبح کر کے گوشت فروخت کرتے ہیں اس مسئلہ پر مابین زید و بکر نزاع ہے۔ زید کہتا ہے کہ یہ بکرے جو راج کے حوالہ ہوئے ہیں ان کا ذبیحہ نادرست ہے۔ اور ذبح کر کے کھانا حرام ہے۔؛ اور یہ ما اهل به لغير الله میں داخل ہے۔ جس کی دلیل میں زید تفسیر بیضاوی شریف کی یہ عبارت پیش کرتا ہے۔

وما اھل بہ لغیر اللہ .ای رفع بہ الصوت عندذبحہ للصنم والا ھلال اصلہ رویۃ الھلال یقال اھل الھلال واھللتہ لکن لماجرت العادۃ ان یرفع الصوت بالتکبیر اذارای الھلال سمی ذلک اھلا لاثم لرفع الصوت وان کان بغیرہ ص ۱۲۳ ج مطبوعہ مجتبائی دھلی. اور اسی کتاب کے حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے۔

للصنم مقام لغیر اللہ بدلیل قولہ تعالیٰ وماذبح علی النصب بینھما علی ان المقصود بالخطاب ھم المشرکون لانھم کانوا یستحبون ھذہ الامور ولیس المراد تخصیص الغیر کیف وخصوص السبب لاینافی عموم اللفظ کمابین فی الاصول فکل ما نودی علیہ بغیر اسم اللہ فھو حرام وان ذبح باسم اللہ تعالیٰ حیث اجمع العلماء لو ان مسلماًذبح ذبیحۃ وقصد بذبحہ التقرب الی غیر اللہ صارمرتدًا وذبیحتہ ذبیحۃ مرتد.

زید کہتا ہے کہ دلائل مذکور الصدران گوش بریدہ بکروں اور بھینسوں کی حرمت کے لئے کافی ہیں۔اور یہ گوش بریدہ بکرے وما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہیں۔

بکر کا قول ہے کہ دلائل مذکورہ سے اس قسم کے آزادشدہ بکرے وما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں، بلکہ بحیرہ اور سائبہ میں داخل ہیں۔اس واسطے کہ عبارت بیضاوی شریف اور اس کے حاشیہ سے صاف ظاہر ہے کہ ما اھل سے مراد وہ جانور ہیں جو بوقت ذبح غیر اللہ کے نام پر پکار کر اسی وقت ذبح کر دیا جائے اور یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ان کو رہا کر دیا جاتا ہے، ذبح نہیں کیا جاتا۔یوں ہی تقرب الی غیر اللہ صادق نہیں آتا۔

دوسری دلیل زید پیش کرتا ہے۔

والذابح مھل لان العرب کانوایسمون الاوثان عندالذبح

ویرفعون اصواتهم بذکر ها ومنه استهل الصبی فمعنی قوله وما اهل به لغیر الله یعنی ماذبح للاصنام وهوقول مجاهدوضحاک وقتاده .قال الربیع بن انس وابن زید یعنی ماذکر علیه غیر اسم الله وهذا القول اوفی لانه اشد مطابقة لللفظ وقال العلماء لو انّ مسلما ذبح ذبیحته وقصد بذبحها التقرب الی غیر الله صار مرتدا وذبیحته ذبیحة مرتد وهوذا الحکم غیر ذبائح اهل کتاب اما ذبح اهل الکتاب فتحل لنا . تفسیر کبیر :ص،۸۱، مطبع حسینیه مصری.

بکر کا قول ہے کہ مجاہد اور ضحاک اور قتادہ اور ابن انس اور ابن زید کا نزاع اختلاف الاصنام اور غیر اسم اللہ میں ہے نہ کہ لفظ اہل پر یعنی مجاہد وغیرہ کہتے ہیں کہ جو جانور بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے اور ابن انس وغیرہ کا قول ہے کہ چاہے صنم ہو یا مسیح یا موسیٰ وغیرہ غیر اسم اللہ جس پر بوقت ذبح پکارا گیا ہو وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے تفسیر کبیر :ص ۸۶ مطبع حسینیہ مصری۔

فصل رابع فی تحریم ما اهل به لغیر الله کے اندر صاف کھول دیا ہے من الناس من زعم ان المراد بذلک ذبائح عبدة الاوثان الذین کانوا یذبحوان لأوثانهم کقوله تعالی وما ذبح علی النصب واجازوا ذبیحة النصرانی اذا سمی علیها باسم المسیح وهو مذهب عطاء ومکحول والحسن والشعبی وسعید بن المسیب وقال مالکؒ والشافعیؒ وابوحنیفةؒ واصحابه لا یحل ذلک والحجة فیه انهم کانوا اذا ذبحوا علی اسم المسیح فقد اهلوا به لغیر الله فوجب ان یحرم وروی عن

علی بن ابی طالب انه قال اذا سمعتم الیهود و النصاری یهلون لغیر الله فلا تأکلوا و اذا لم تسمعوهم فکلوا الی آخره.

یہ بکر کا قول ہے کہ زید کی کسی دلیل سے یہ گوش بریدہ بکرے وما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں کیونکہ غیر اسم اللہ پر ذبح نہیں کئے جاتے بلکہ بحیرہ اور سائبہ ہیں جیسا کہ فتاوی مولانا عبدالحی جلد دوم صفحہ ۵۵ مطبوعہ یوسفی مفصل درج ہے ما قولکم رحمکم اللہ، اس مسئلہ میں کہ اہل ہنود اشیاء ذوی الاجسام کو مثلاً خصی بکرے کو گنگا پر چڑھاتے ہیں اور پانی میں زندہ چھوڑ دیتے ہیں اور اس گھاٹ کے زمیندار ہندو و دیگر اشخاص ان جانوروں کو دریا سے نکالتے ہیں اور بیچتے ہیں چڑھانے والے سے کچھ تعرض نہیں کرتے پس ایسے جانوروں کو خرید کر یا نکال کر ذبح کر کے کھانا حلال یا حرام اور یہ جانور ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہیں یا بحیرہ وسائبہ میں اور بحیرہ وسائبہ حلال ہیں یا حرام اور ما اہل بہ لغیر اللہ کے کیا معنی ہیں و ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ الخ کا کیا مطلب ہے اور تتمہ امداد الفتاوی ثالثہ کے صفحہ ۶۱ پر مولوی کفایت اللہ صاحب کا فتوی اسی نہج پر ہے اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کی تصدیق درج ہے؟۔

سوال (۲) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اہل ہنود اپنے دیوتاؤں کے یا مردوں کے نام پر گائے کو داغ لگا کر یا بلا داغ چھوڑتے ہیں جس طرح بعض مشرکین شیخ سدو یا پیران پیر وغیرہ کے نام کا بکرا یا مرغ چھوڑتے ہیں اسی طرح اہل ہنود گائے کو متبرک سمجھ کر چھوڑتے ہیں اب ایسی گائیوں کی اولاد ہو کر بہت سی ہوگئی ہیں اسی طریقے کے جو چھوٹے ہوئے جانور یعنی گائے یا ان کی اولاد کا ذبح کر کے گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب

جو جانور بتوں کے نام پر یا کسی غیر اللہ کے نام چھوڑے جاتے ہیں اور ان کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے اور ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں ان کو سائبہ کہتے ہیں اور ان کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے کہ وہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتی اگر مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دیدے تو وہ حلال ہیں، اور ایسی گایوں کی اولاد بھی مالک کی ہوتی ہے پس ان گایوں کی یا ان کی اولاد کو بلا اجازت مالک کے کھانا حلال نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد کفایت اللہ دہلی۔ محمد کفایت اللہ دہلوی

الجواب صحیح: علی ما قال مولانا کفایت اللہ سلمہ

اشرف علی

اس لیے عرض ہے کہ جواب صاف اور معہ حوالہ کے تحریر فرمایا جاوے۔

الجواب

حامدا ومصلیا امابعد! تقرب الی غیر الہ کے لیے کسی جاندار کو نامزد کرنے کی تین صورتیں ہیں اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا جائے اور بوقت ذبح اسی کا نام اس پر لیا جائے یہ صورت باتفاق وباجماع حرام ہے اور یہ جانور میتۃ ہے اس کے کسی جزو سے انتفاع جائز نہیں اور آیت کریمہ وما اہل لغیر اللہ میں اس کا داخل ہونا متفق علیہ اور مجمع علیہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے یعنی اس کا خون بہانے سے غیر اللہ کا تقرب مقصود ہو لیکن بوقت ذبح اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذبوحہ بحکم میتۃ ہے مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے بعض حضرات مفسرین وفقہاء نے اس کو بھی ما اہل لغیر اللہ کا مدلول صریح قرار دیا ہے جیسا

کہ حواشی بیضاوی کی عبارت مندرجہ سوال میں مذکور ہے نیز درمختار کتاب الذبائح میں ہے:

ذبح لقدوم الامیر ونحوه کواحد من الفظام(یحرم) لانه اھل به لغیر الله (ولو) وصلیة (ذکر اسم الله تعالی)الخ واقره الشامی: ۲/۲۱۴)

اور بعض حضرات نے اس کو آیت ما اہل لغیر اللہ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ اس میں بحیثیت عربیت تکلف ہے مگر اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے اس کو بھی ما اہل بہ لغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے اور احقر کے نزدیک یہی اسلم واحوط ہے نیز اس صورت کی حرمت کے لیے ایک دوسری مستقل آیت بھی شاہد ہے کہ یعنی آیت کریمہ وما ذبح علی النصب کیونکہ عطف کی وجہ سے ظاہر یہی ہے کہ ما اہل بہ لغیر اللہ اور ذبح علی النصب دو متغائر صورتیں ہیں پس ما اہل بہ لغیر اللہ تو وہ ہے جس پر غیر اللہ کا نام بوقت ذبح پکارا جائے اور ما ذبح علی النصب وہ ہے جو نصب کی تعظیم وتکریم کے لیے ذبح کیا جائے خواہ وہ اس پر نام کسی غیر اللہ کا ذکر نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا نام ذکر کریں۔

الغرض یہ صورت ثانیہ اول تو اشتراک علت یعنی ذبح لغیر اللہ اور تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے ما اہل بہ لغیر اللہ کے ساتھ حکماً ملحق ہے دوسری آیت ما ذبح علی النصب کا بھی مدلول ہے اس لیے یہ بھی حرام ہے اور ایسے مذبوح کا کھانا وغیرہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لیے چھوڑ دیا جائے نہ کہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو یہ جانور ما اہل بہ لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے۔

لقوله تعالیٰ: ما جعل الله من بحیرة ولا سائبة. الأیة

اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ اس فعل سے یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتا لیکن یہ بات محل غور وتامل ہے کہ اگر مالک خود اس جانور کو بیع کر دے یا ہبہ کر دے اور ذبح کرنے کی اجازت دیدے تو وہ دوسروں کے لیے اس کا کھانا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں، سواس خاص جزئیہ کے ماتحت تو فقہاء حنفیہ کی کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری، لیکن تعظیم غیر اللہ کے لیے جو نذر یا منت مانی جائے اس کے حرام وناجائز ہونے کی تصریحات نہایت واضح طور پر کتب فقہ میں موجود ہیں اور بظاہر بحیرہ سائبہ اور منذ ور لغیر اللہ میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ قصد تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ دونوں میں موجود ہے۔ پس جس طرح وہ شیرینی وغیرہ جو کسی غیر اللہ کی نذر مانی جائے حرام وناجائز ہے اسی طرح یہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑ دیا گیا ہے اور قصد اس کے ذبح کرنے کا نہیں ہے وہ بھی حرام ہونا چاہئے البتہ اگر مالک اپنی نیت تعظیم غیر اللہ سے توبہ کرے تو یہ حرمت رفع ہو جائے گی اور اس کا کھانا اس کے لیے بھی جائز ہوگا اور اس کی اجازت سے دوسروں کے لیے بھی جائز ہو جائے گا۔

الغرض اس صورت میں جانور کے حلال ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں اول یہ کہ مالک اپنی سابقہ نیت سے توبہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے کھانے وغیرہ کی اجازت دے

والدلیل علی ما قلنا هذه العبارات فی صوم البحر عن الشیخ قاسم فی شرح الدرر واما النذر الذی ینذره اکثر العوام علی ما هو شاهد کان یکون لانسان غائب اومریض او له حاجة ضروریة فیاتی بعض الصلحاء فیجعل ستره علی رأسه فیقول یا سیدی فلان ان رد غائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذهب کذا او من الفضة کذا اومن الطعام کذا او من الماء کذا او من الشمع کذا او من الزیت کذا فهذا النذر

باطل بالاجماع لوجوه منها انه نذر للمخلوق والنذر للمخلوق لا يجوز (الى قوله) ومنهاان المنذور له ميت والميت لايملک ومنها اعتقاد ان الميت يتصرف فى الامور دون الله تعالى واعتقاد ذلک كفر(ثم قال بعد ذلک باسطر) للاجماع على حرمة النذر للمخلوق ولا ينعقد ولا تشتغل الذمة به ولانه حرام بل سحت ولا يجوز لخادم الشيخ اخذه ولا اكله ولا التصرف فيه بوجه من الوجوه الا ان يكون فقيرا اوله عيال فقراء عاجزون عن الكسب وهم مضطرون فياخذونه على سبيل الصدقة المبتدأة فاخذه ايضا مكروه ما لم يقصد به الناذر التقرب الى الله تعالى وصرفه الى الفقراء ويقطع النظر عن نذر الشيخ فاذا علمت هذا مما يوخذ من الدراهم والشمع الزيت وغيرها وينقل الى ضرائح الاولياء تقربا اليهم فحرام باجماع المسلمين ما لم يقصد وابصر فها للفقراء الاحياء تولا واحدا.(البحر الرائق قبيل باب الاعتكاف من الصوم: ۲/۳۲۱)
ومثله فى الفتاوى الخيرية من كتاب الصوم: ۱/۸۱)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ جو چیز غیر اللہ کی تعظیم وتقرب کے لیے نذر کردی جائے عام اس سے کہ جائیداد ہو یا بے جان وہ سخت حرام ہے جب تک نذر کرنے والا اپنی اس نذر سے توبہ نہ کرے اس وقت تک کسی شخص کے لیے اس کا کھانا یا اس کو کسی کام میں لانا جائز نہیں اگر چہ مالک اجازت بھی دیدے۔

خلاصہ کلام

یہ ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم وتقرب کے لیے کسی جانور وغیرہ کو نامزد کرنے کی تینوں

صورتیں اصل فعل کے اعتبار سے تو باتفاق حرام وناجائز ہیں اور اس جانور کے حرام ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ پہلی دونوں صورتیں جن میں غیر اللہ کے لیے خون بہانا مقصود ہے ان میں یہ جانور بھی باتفاق حرام ہے اور تیسری صورت جس میں غیر اللہ کے لیے جان لینا مقصود نہیں بلکہ صرف ان کے نام پر چھوڑ نا مقصود ہے جیسے اکثر ہندو اپنے بتوں یا گنگا وغیرہ کے نام پر چھوڑتے ہیں یا بعض مسلمان اولیاء اللہ کی قبروں پر نذر مان کر چھوڑ دیتے ہیں جیسے شیخ سدو کا بکرا وغیرہ اس کے متعلق صراحۃ فقہاء حنفیہ کے کلام میں کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری اسی لیے علماء کا اس میں اختلاف ہے بعض حضرات اس کو اپنی اصل پر رکھ کر جائز قرار دیتے ہیں اور جواز کے لیے صرف اجازت مالک کو کافی سمجھتے ہیں اور بعض حضرات اس کو بھی نذر لغیر اللہ کے ساتھ ملحق سمجھ کر حرام قرار دیتے ہیں اور بحیثیت دلیل یہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ منذور لغیر اللہ اور سائبہ وغیرہ میں کوئی وجہ فرق کی معلوم نہیں ہوتی اس لیے اس بارہ میں احتیاط ہی لازم ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

مسئلہ مذکورہ کے متعلق حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کی تحقیق

اس مسئلہ میں تیسری صورت چونکہ احقر نے محض قواعد سے لکھی تھی اس لیے اس پر اطمینان نہ تھا بناء علیہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ کر استصواب کیا یہ خط مع جواب کے بعینہ درج ذیل ہے اور اس کے بعد مسئلہ کا اخری فیصلہ لکھا گیا ہے: محمد شفیع غفرلہ

بحضرت سیدی وسندی کہفی ومعتمدی وسیلۃ یومی وغدی متعنا اللہ تعالی بطول بقائہ بالخیر۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بعد تمنائے زیارت وآداب نیازمندانہ گزارش ہے کہ

یہ ناکارہ غلام بیس روز تک بیمار رہنے کے بعد الحمدللہ اب تندرست ہے مگر نقاہت اور بالخصوص ضعف دماغ بہت ہے ذرا سا دماغ کام کرنے سے گھنٹوں تک اثر رہتا ہے، مدرسہ کا کام آہستہ آہستہ شروع کردیا ہے، دعا کی ضرورت ہے۔

ایک فتوی ریاست قرولی کا دربارہ سائبہ وبحیرہ وغیرہ یہاں آیا ہوا ہے جس پر حضرت والا کی بھی تصدیق ہے غالبا تصدیق کی نقل میں تو غلطی نہیں ہے کیونکہ بیان القرآن جدید کے حاشیہ میں بھی حضرت نے اسی صورت کو ترجیح دی ہے اور کچھ یاد ہے کہ زبانی بھی حضرت سے چند جملے احقر نے سنے تھے، مگر اس میں ایک کھٹک اسی وقت سے چلی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ صورت ثالثہ جس میں اراقت دم لغیر اللہ مقصود نہیں، مگر نذر لغیر اللہ کی حد میں تو داخل ہے پھر اور منذور لغیر اللہ کی حرمت پر صاحب بحر نے عبارات ذیل میں اجماع مسلمین نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جانور کی حلت کے لیے صرف اذن مالک کافی نہیں بلکہ مالک کا اپنی نذر سے رجوع کرنا بھی ضروری ہے ہاں اگر سائبہ وغیرہ جانورں اور منذور لغیر اللہ میں کوئی فرق ہو تو بیشک یہ شبہ رفع ہوسکتا ہے مگر مجھے ان دونوں میں کوئی فارق معلوم نہیں ہوا کہ اصل علت تقرب الی غیر اللہ ہے وہ دونوں میں یکساں ہے صرف بحیرہ سائبہ میں صیغہ نذر کا نہیں ہے اگر ہوسکے تو اس پر نظر فرما کر اس کا حل فرما دیا جائے تا کہ اشکال رفع ہو اور اس کا جواب بھی روانہ کردیا جائے۔ والسلام ناکارہ غلام شفیع غفرلہ از دیوبند یکم ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ

جواب از حضرت ممدوح دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ میری نہ نظر وسیع ہے نہ فکر عمیق ہے مگر اس امید پر لکھ دیا کہ شاید اس سے کوئی مفید بات نکال کر جواب لکھ دیں باقی دعا کرتا ہوں۔

الجواب:

اس مسئلہ کے متعلق میری رائے پر تین دور گزرے ہیں ایک زید کی موافقت کا اور میں نے تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسرا تردد کا تفسیر کی جلد ثالث کے منہیہ میں اس تردد کو ظاہر کیا ہے۔ تیسرا بکر کی موافقت میں اور امداد الفتاوی کے فتوی منقولہ سوال میں اسی کا حکم کیا ہے جو کہ تفسیر سے زمانا متاخر ہے پس اخیر رائے یہی ہے اور پہلی دونوں رائیں مرجوع عنہ ہیں جس کا مقتضی یہ ہے کہ سوائب ما اہل بہ لغیر اللہ میں اخل نہیں کیونکہ ناذر کا مقصد ان کا ذبح نہیں پس ان کی حرمت کسی دوسرے عارض سے ہوگی جس کے ارتفاع سے حرمت اکل بعد الذبح مرتفع ہو جائے گی چنانچہ بکثرت مفسرین نے آیۃ **یا ایھا الناس کلوا ما فی الارض حلالا طیبا** کا سبب نزول اسی تحریم سوائب کو لکھا ہے اور آیت سے حلت کا اثبات اس حرمت کی نفی کی ہے اور بعض نے جو دوسرا سبب نزول لکھا ہے انہوں نے بھی اس حلت کی نفی اور حرمت کا اثبات نہیں کیا تو مسئلہ متفق علیہا ہو گیا البتہ میری تحقیق میں ما اہل بہ لغیر اللہ میں ایک دوسرا عموم ہے یعنی منذور بہ لغیر اللہ غیر حیوان کو بھی حکم حرمت کا شامل ہے مگر اس تفصیل سے کہ حیوان کی حرمت تو مدلول نص بلا واسطہ ہے **لان الایات وردت قطعا فی الحیوانات** اور غیر حیوان کی حرمت مدلول بواسطہ قیاس سے **لاشتراک العلة وھی نیة التقرب الی المخلوق** بکر کا فتوی اسی قیاس پر مبنی ہے۔ باقی آپ نے جو خلجان لکھا ہے اس کا جواب قواعد سے یہ ہے کہ منذور بہ بغیر اللہ میں وہ تصرف جس میں تقریر ہے ناذر کی غرض باطل کی حرام ہے لان اعانۃ الحرام حرام اور جس تصرف میں ابطال ہے غرض ناذر کا وہ جائز ہے۔ پس ما اہل بہ لغیر اللہ کے ذبح و تناول میں تو تقریر ہے اس کی غرض اراقۃ دم کی اس لیے حرام ہے اور سوائب کے ذبح و تناول میں ابطال ہے اس کی غرض کا اس لیے حرام نہیں اور بکر کی جزئیات میں مجاورین کا انتفاع یا ایقاد قنادیل وغیرہ یہ سب تقریر ہے غرض ناذر کی اس لیے حرام ہے اس سے فرق نکل آیا سوائب کے تناول میں اور منذور للقبور کے تناول میں۔ واللہ اعلم۔ کتبہ اشرف علی ۳/ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ۔

قول مختار

سیدی حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم کی تحقیق مذکور سے منذور بہ لغیر اللہ جواز قبیل حیوانات نہ ہوں جیسے شیرینی پھول وغیرہ ان میں اور سوائب و بحائر میں فرق واضح ہوگیا ہے کہ قسم اول میں ان چیزوں کا استعمال کرنا نذر کرنے والے کی غرض باطل کی تکمیل اور اس کی اعانت ہے اس لیے اس کی حرمت جو آیت ما اہل لغیر اللہ سے باشتراک حلت ثابت تھی بحالہا قائم رہی، جیسا کہ صاحب بحرالرائق وغیرہم کے فتوے میں مصرح ہے اور قسم دوم یعنی سوائب و بحائر میں ان کے ذبح کرنے اور کھانے میں نذر باطل کرنے والے کی غرض کا ابطال ہے اور نہ کھانے میں اس کی تکمیل اس لیے اس کے ذبح کرنے اور کھانے کی فی نفسہ اجازت دی گئی اب حلت کے لیے صرف اجازت مالک کی ضرورت رہ گئی جب مالک کی ضرورت رہ گئی جب مالک نے فروخت کردیا یا بدون معاوضہ کسی کو ہبہ کردیا تو کھانے کی اجازت ہے۔ الغرض اب مختار احقر کے نزدیک بھی وہی فتویٰ ہے جو مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی اور حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم کا سوال میں نقل کیا گیا ہے یعنی تیسری صورت میں صرف اجازت مالک جواز کے لیے کافی ہے اس لیے صورت مندرجہ سوال میں جو جانور کان کاٹ کر مالک نے ملازمان راج یا مندر میں رہنے والے خادموں کے حوالہ کردیئے وہ اسی تیسری صورت میں داخل ہیں ان کا فروخت کرنا اور خریدنا پھر ذبح کرکے کھانا سب جائز ہیں۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان وبیدہ العصمة والصواب وھو اعلم بالحق فی کل باب . کتبہ الاحقر محمد شفیع الدیوبندی عفا اللہ عنہ (خادم دارالعلوم دیوبند ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ.

۸۹

احکام و تاریخ قربانی

تاریخ تالیف ______ ۲۷/ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ (مطابق ۱۹۶۱ء)
مقامِ تالیف ______ کراچی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف وقت کی ضرورت کے تقریباً ہر موضوع پر بحمد للہ امت کی راہنمائی کر رہی ہیں، زیر نظر رسالہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے جس میں قربانی کی تاریخ، فوائد اور فضائل و مسائل کو بڑے دلنشیں انداز میں واضح کیا گیا ہے اور ملحدین کی تردید کی گئی ہے۔

یہ رسالہ ادارۃ المعارف سے پہلے لیتھو پر شائع ہوا تھا اور دوبارہ آفسٹ طباعت پر طبع ہوا اور اس میں محترم مولانا عبدالغفار صاحب ارکانی (سابق استاذ دارالعلوم کراچی) کا ایک مقالہ بھی شامل کر دیا گیا جس میں قرآن و سنت سے قربانی کی حقیقت اور اس کے بارے میں ائمہ مجتہدین کے اقوال کی مفصل تحقیق موجود ہے۔

اس جدید اشاعت میں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم (صدر و مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی) کے قلم سے ''مسائل چرم قربانی'' کے عنوان سے قربانی کی کھال اور اس سے متعلق دیگر بہت سے مسائل کے بارے میں شرعی احکام پر مشتمل ایک مقالہ بھی شامل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر معلومات کا ایک منفرد ذخیرہ بن گئی اب اسے بھی جواہر الفقہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُربانی کی تاریخ اور اُس کی حقیقت واہمیت

اُردو میں جس چیز کو قربانی کہتے ہیں یہ لفظ اصل میں قُربَانْ بروزن قُرْانْ ہے ''قربان'' ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ بنایا جائے، خواہ جانور کا ذبیحہ ہو یا عام صدقہ وخیرات، اور امام ابوبکر جصّاصؒ نے تو اس سے بھی زیادہ عام معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہر نیک عمل جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قریب ہونے کا قصد کیا جائے اس کو ''قربان'' کہتے ہیں، لیکن عرفِ عام میں یہ لفظ اکثر جانور کے ذبیحہ کے لئے بولا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں چند جگہ یہ لفظ آیا ہے، اکثر مواقع میں یہی جانور کا ذبیحہ مراد ہے۔

قربانی کی تاریخ

کسی حلال جانور کو اللہ تعالیٰ کے تقرّب کی نیت سے ذبح کرنا اس وقت سے مشروع ہے جب سے آدم علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے اور دنیا آباد ہوئی، سب سے پہلی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے دی۔

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا

''یعنی جب کہ دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی'' (سورۂ مائدہ)

ابنِ کثیرؒ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ ہابیل نے

ایک مینڈھے کی قربانی پیش کی اور قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار سے کچھ غلہ وغیرہ صدقہ کر کے قربانی پیش کی، حسبِ دستور آسمان سے آگ نازل ہوئی اور ہابیل کے مینڈھے کو کھا لیا، اور قابیل کی قربانی کو چھوڑ دیا۔

قربانی کے قبول ہونے یا نہ ہونے کی پہچان انبیاء سابقین کے عہد میں یہ تھی کہ جس قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرمالے تو ایک آگ آسمان سے آتی اور اس کو جلا دیتی تھی، سورۂ آلِ عمران میں اس کا ذکر صراحۃً آیا ہے:

بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ

''یعنی وہ قربانی جس کو آگ کھا جائے''

اُس زمانے میں بذریعہ جہاد جو مالِ غنیمت کفار سے ہاتھ آتا تو اس کو بھی آگ نازل ہو کر کھا جاتی تھی اور یہ جہاد کے مقبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی، اُمت محمدیہ ﷺ پر حق تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہوا کہ قربانی کا گوشت اور مالِ غنیمت اُن کے لئے حلال کردیئے گئے، حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے خصوصی فضائل اور انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمِ

یعنی میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا

یہی وجہ تھی کہ عہد نبوی ﷺ کے بعض غیر مسلموں نے اپنے اسلام قبول نہ کرنے کا ایک یہ عذر بھی پیش کیا کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی قربانیوں کو تو آگ کھا جایا کرتی تھی آپ ﷺ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا، اس لئے ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ صورت ظاہر نہ ہو، سورۂ مائدہ میں اُن کے اس عذرِ لنگ کو بیان کر کے یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء کے زمانے میں قربانیوں کو آگ نے کھایا تھا تم انہی پر کون سا ایمان لائے ہو، تم نے تو اُن کی بھی تکذیب ہی کی تھی، بلکہ ان کے قتل تک سے دریغ نہ کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تمہارا یہ قول کسی حق طلبی کے مد میں نہیں، بلکہ حیلہ جوئی کے سوا کچھ نہیں، سورۂ

آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۸۳

حَتّٰی یَأْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْکُلُہُ النَّارُ

سے آیت نمبر ۱۸۴ تک یہی مضمون مذکور ہے، سورۂ مائدہ کی آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جانور کی قربانی سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے عبادت اور تقرّبِ الٰہی کا ذریعہ قرار دی گئی ہے، اور سورۂ آلِ عمران کی آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ قربانی کی قبولیت کا ایک خاص طریقہ کہ آسمانی آگ آکر اس کو جلا دے یہ خاتم الانبیاء ﷺ کے عہدِ مبارک تک تمام انبیاء سابقین کے دور میں معروف رہا۔

قربانی کا ایک عظیم الشان واقعہ

سُنتِ ابراہیم علیہ السلام

قربانی کا بحیثیت عبادت کے مشروع ہونا اگرچہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے ثابت ہے، لیکن اس کی ایک خاص شان حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ایک واقعہ سے شروع ہوتی ہے اور اسی کی یادگار کی حیثیت سے شریعتِ محمدیہ ﷺ میں قربانی کو واجب قرار دیا گیا ہے، یہ واقعہ تاریخِ عالم کا ایک بے نظیر اور سبق آموز واقعہ ہے، قرآنِ کریم نے اس کو سورۂ صافات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اسلام میں مسئلہ قربانی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے مرکزی نقطہ یہی واقعہ ہے، اس لئے اس کا جتنا حصّہ قرآن اور مستند روایات سے ثابت ہے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

دعوتِ حق

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے پیغمبرانہ فریضہ اور دعوتِ حق کو لے کر اُٹھے تو سب سے پہلے اپنے والد آذر ہی سے سابقہ پڑا، آدابِ پدری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن

کو بُت پرستی چھوڑنے کی دعوت دی، مگر وہ اس پر بھی خفا ہو گئے، گھر سے نکالنے اور تکلیف پہنچانے کی دھمکیاں دینے لگے۔

لَارْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (سورۂ مریم:۴۶)

نتیجہ یہ ہوا کہ بُت پرستی کی آبائی رسم کو چھوڑنے اور اس کی دعوت دینے کے سبب والد سمیت پوری قوم مخالف ہوگئی۔

قوم کی دشمنی اور آگ میں ڈالنا

ان ظالموں نے اس بزرگ ہستی کو آگ میں ڈال کر جلانے کا ایک جشن منایا، وہ جس وقت آگ میں ڈالے جا رہے تھے تو جبرئیل امین آئے اور کہا کہ میری امداد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں، فرمایا کہ اگر امداد آپ کی ہے تو مجھے ضرورت نہیں، جس ذات کے لئے یہ معاملہ میرے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ خود علیم وخبیر ہے، مجھے دیکھ رہا ہے، وہ جو کچھ میرے لئے تجویز فرمائے میں اس پر راضی ہوں۔

بجُرمِ عشقِ توام می کشند وغوغائیست
تو نیز برسرِ بام کہ خوش تما شائیست

عراق سے ہجرت

اللہ تعالیٰ نے آگ کو بَرْدًا وَّسَلَامًا یعنی ٹھنڈی اور سلامتی بن جانے کا حکم دے دیا، اس کے آسمان بوس شعلے ان کے لئے گلزار بن گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا معجزہ دیکھ کر بجائے اس کے کہ اُن پر ایمان لاتے ان لوگوں کی دشمنی اور تیز ہوگئی، ماں، باپ اور خاندان اور وطن کو اللہ تعالیٰ سے بیگانہ پایا تو ان سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

ہزار خویش کہ بیگانہ ازخدا باشد
فدائے یک تنِ بیگانہ کآشنا باشد

اُس وقت فرمایا اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ۔یعنی میں اپنے پروردگار کی رضائی جوئی کی طرف جاتا ہوں وہی میری رہنمائی کسی ایسے مقام کی طرف فرمائیں گے جو اُن کے نزدیک پسندیدہ ہو، پروردگار کی طرف جانے کا مطلب یہی تھا کہ کسی ایسی جگہ جاتا ہوں جہاں پروردگار کے احکام کی تعمیل آسان ہو۔ حضرت لوط علیہ السلام جو آپ پر ایمان لے آئے تھے اُن کو ساتھ لے کر اپنے وطن عراق سے نکل کھڑے ہوئے اور علاقہ فلسطین کنعان میں قیام فرمایا، چھیاسی (۸۶) سال کی عمر میں اپنے وطن اور ماں باپ اعزّاء واحباب سب کو اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ کر دارِ غربت میں بے یار ومددگار بسر کرنے لگے۔

اولاد کے لئے دُعاء

اس وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی:

رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ

''یعنی اے اللہ میرے پروردگار! مجھے اولاد صالحین میں سے عطا فرما''

اللہ تعالیٰ نے دعاء قبول فرمائی۔

اسمٰعیل علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت

اور خوش خبری ان الفاظ میں آئی: فَبَشَّرْنٰہُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۔ ''یعنی ہم نے ابراہیم کو ایک حلیم لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دے دی'' اشاراتِ قرآن اور روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں کہ غُلَامٌ حَلِیْمٌ سے مراد اس جگہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں جو حسبِ روایات اہلِ کتاب چھیاسی سال کی عمر میں پیدا ہوئے تھے، کیونکہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سب سے پہلے اور اکلوتے صاحبزادے تھے اور خود اہلِ کتاب کی روایات میں ذبح کئے جانے والے صاحبزادے کو ''وحید'' یعنی اکلوتا کہا گیا ہے وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہوسکتے ہیں، اہلِ کتاب کی روایات کے مطابق اس کے بعد ننانوے سال کی عمر میں دوسرے

صاحبزادے حضرت اسحق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شان میں حق تعالیٰ نے غُلَامٌ حَلِيمٌ فرما کر ان کے اس خاص وصف کی طرف بھی اشارہ فرمادیا جس کا ظہور بعد میں حکمِ قربانی کے وقت ہوا، کیونکہ "حلیم" کے معنی ہیں بُردبار جو مشقت ومصیبت کے وقت گھبرائے نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کا سخت امتحان حجاز کی طرف دوسری ہجرت کا حکم

یہ اکلوتے صاحبزادے جو بڑھاپے کی عمر میں دعاؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل ہوئے تھے یہ کس کو معلوم تھا کہ یہی حضرت خلیل علیہ السلام کے لئے سب سے بڑے امتحان کا سبب بنیں گے۔

پہلا امتحان یہ ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ملا کہ صاحبزادے اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کو ساتھ لے کر پُرفضا ملکِ شام سے ہجرت کر کے حجاز کے لق ودق گرم ریگستان میں جہاں دُور دُور نہ کسی آدمی کا نام ونشان ہے نہ جانور اور درخت کا، وہاں اُن کا وطن بنادیں اللہ تعالیٰ کے خلیل نے بغیر کسی جھجک کے حکم کی تعمیل فرمائی، شیر خوار حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ ہاجرہ کو لے کر اس ہلاکت خیز میدان میں ٹھہر گئے جس کو کسی زمانے میں انہی کے ذریعہ "مکّہ معظّمہ" اور "اُمّ القریٰ" بننا تھا۔

پھر اسی پر بس نہیں ہوئی، بلکہ اب حکم یہ ملا کہ ماں اور بچے کو یہیں چھوڑ کر خود مُلکِ شام واپس چلے جائیں، اللہ کے خلیلؑ نے حکم ملتے ہی تعمیل کی اور جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے شام کی طرف چلنا شروع کر دیا، اتنی دیر بھی گوارہ نہیں کی کہ حضرت ہاجرہؓ کے پاس جا کر اُن کو تسلّی کر دیتے اور بتلا دیتے کہ میں بحکم خداوندی جارہا ہوں، جب حضرت ہاجرہ نے دیکھا کہ دُور چلے جارہے ہیں تو آوازیں دیں کہ اس جنگل میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے خلیل نے مُڑ کر نہ دیکھا، پھر خود حضرت ہاجرہؓ کو خیال آیا کہ یہ مقدس بزرگ ایسا کام بدون حکمِ خداوندی کے نہیں کر سکتے تو پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں سے جانے کا حکم دے دیا ہے؟ اُس وقت حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے جواب دیا کہ

ہاں، حضرت ہاجرہ نے یہ سُن کر فرمایا: اِذَنْ لَا یُضِیْعُنَا کہ اگر حکم خداوندی ہے تو جائیے وہ ہمیں بھی ضائع نہ فرمائیں گے۔

اب یہ بے آب و گیاہ لق ودق اور گرم ریگستان ہے اور تنہا ایک خاتون اور اُن کا شیر خوار بچہ جن کو آئندہ مکہ معظمہ کی بستی بسانے کے لئے یہاں لایا گیا ہے، آگے یہ قصہ طویل ہے کہ کس طرح یہاں اس ماں اور بچے کی جان بچی اور کس طرح اس وحشت کدہ میں اپنا وقت گذارا، وہ خود قدرتِ خداوندی کا ایک عجیب مظہر اور سینکڑوں درسِ عبرت اپنے اندر لئے ہوئے ہے، مگر یہ تفصیل واقعۂ قربانی کا جز نہیں، اس لئے اس کو یہیں چھوڑ کر زیرِ بحث مسئلہ قربانی کو دیکھنا ہے۔

قرآنِ عزیز میں ارشاد ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی.

یعنی جب یہ بچہ اس قابل ہوگیا کہ باپ کے ساتھ چل کر اُن کے کاموں میں مددگار بن سکے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ پیارے بیٹے! میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، بتلاؤ اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مطلب یہ تھا کہ انبیاء کا خواب بھی بحکم وحی ہوتا ہے، اس لئے خواب میں ذبح کرتے ہوئے دیکھنا حکمِ ذبح کے مرادف ہے، اب تم بتلاؤ کہ کیا تم اس حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تیار ہو؟

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکمِ خداوندی کے بعد کسی سے مشورہ لینے کی نہ ضرورت تھی اور نہ اُن کے نزدیک تعمیل حکم اس پر موقوف تھی، لیکن یہاں صاحبزادے سے مشورہ لینے میں حکمت یہ تھی کہ اوّل تو ان کے عزم و ہمت اور اطاعتِ خداوندی کے جذبے کا امتحان ہو جائے، دوسرے اگر وہ اطاعت اختیار کریں تو مستحقِ ثواب ہو جائیں، کیونکہ ثواب کا مدار قصد و نیت پر ہے، تیسرے ذبح کرنے کے وقت جو بتقاضائے بشریت وشفقتِ

پدری طبعی اضطراب ولغزش کا خطرہ تھا اس سے کسی درجہ میں اطمینان ہو جائے۔

(روح البیان)

آیتِ مذکورہ میں یہ الفاظ خصوصیت سے قابلِ نظر ہیں فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ یعنی جب وہ باپ کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گئے، اس میں اشارہ ہے کہ یہ صاحبزادے جن کے ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے یہی نہیں کہ بڑھاپے کے اکلوتے بیٹے اور تمناؤں اور دعاؤں کے بعد حاصل ہوئے ہیں، بلکہ اب وہ پل کر جوان ہونے کے قریب ہیں اور اس قابل ہیں کہ باپ کے ساتھ سعی وعمل میں اُن کی امداد کر سکیں، تاریخی روایات کے مطابق اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر نو سال ہو چکی تھی۔ (روح البیان)

ان حالات نے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی قربانی کو کتنا صبر آزما کر دیا ہے اس کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں۔

والد بزرگوار نے سعادت مند بیٹے سے مشورہ لیا تو وہ بھی خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے تھے، والد بزرگوار کا خواب سُن کر فرمایا:

يَآ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ.

"یعنی ابا جان آپ وہ کام کر گزریں جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، مجھے آپ انشاءاللہ تعالیٰ صابرین میں سے پائیں گے۔"

یہاں جس طرح حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے بڑھاپے میں اکلوتے اور ہونہار بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ایک انتہائی سخت امتحان تھا اسی طرح صاحبزادے کے لئے اطاعت شعاری میں جان کی بازی لگا دینا بھی کوئی معمولی بات نہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس پورے خاندان ہی کو اپنے لئے بنایا تھا، اُسی کے آثار ظاہر ہوئے۔

یہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا جذبۂ اطاعت تو قابلِ دید ہے ہی یہ بات بھی سبق آموز ہے کہ انہوں نے اپنے ارادے اور عزم وہمت پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے

سپرد کر کے انشاء اللہ فرمایا، اور پھر یہ نہیں کہا کہ میں صبر کروں گا بلکہ فرمایا کہ مجھے آپ صابرین میں سے پائیں گے، جو ایک تواضع کا عنوان ہے، کہ صبر و استقلال تنہا میرا کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہزاروں بندے صابر ہیں، میں بھی اُن میں داخل ہو جاؤں گا، اسی تفویض اور تواضع کی برکت تھی کہ اس دشوار گذار منزل کے کسی مرحلے میں بھی اُن کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی اور یہ یگانۂ روزگار باپ اور بیٹے طبعی تقاضوں اور زندگی کی اُمنگوں کو کچلتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کرنے اور کرانے کے لئے قربان گاہ کی طرف چل پڑے، خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے جو کٹھن منزل سامنے تھی فرمانبردار صاحبزادے کے اس جواب نے اس کو کسی قدر آسان کر دیا، اب یہ یگانۂ روزگار باپ اور بیٹے حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لئے گھر سے چل کھڑے ہوئے۔

شیطانی چالیں

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا یہ عظیم الشان مظاہرہ شیطان کس طرح دیکھ سکتا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ مقابلے پر اللہ تعالیٰ کے خلیل جیسے کوہِ استقامت ہیں اپنی تدبیروں سے باز نہ آیا۔ اوّل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ کے پاس ایک مہربان ہمدرد کی شکل میں آیا اور پوچھا کہ اسمٰعیل کہاں گئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے والد کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں چُننے کے لئے گئے ہیں، شیطان نے کہا کہ بات یہ نہیں، تم غفلت میں ہو، اُن کے باپ اُن کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے ہیں، حضرت ہاجرہؓ نے کہا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو ذبح کیا کرتا ہے؟ شیطان نے کہا کہ ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے، یہ سن کر اکلوتے بیٹے کی ماں نے بھی وہی جواب دیا جو خلیل اللہ کے گھرانے کے شایانِ شان تھا، کہ اگر واقعہ یہی ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر اُن کو اس کی تعمیل ہی کرنا چاہئے۔

شیطان یہاں سے مایوس ہو کر اب باپ اور بیٹے کے تعاقب میں لگ گیا، جو شہر مکّہ سے منیٰ کی طرف جا رہے تھے، اول ایک دوست کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

سامنے آکر اُن کو روکنا چاہا مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے تاڑ لیا، اس لئے آپ پر اثر انداز ہونے میں شیطان ناکام رہا، اس کے بعد جمرۂ عقبہ کے قریب ایک بڑے جثّے کی صورت میں آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا، ایک فرشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھا، اُس نے کہا کہ ابراہیم اس کو پتھر سے مارو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات (۷) کنکریاں ماریں اور ہر ایک کے ساتھ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا تو شیطان دفع ہوگیا، آگے بڑھ کر پھر جمرۂ وسطیٰ کے قریب سی طرح راستہ روک لیا، تو پھر حضرت خلیل علیہ السلام نے تکبیر کہہ کر سات کنکریاں ماریں، تو دفع ہوگیا، اسی طرح تیسری مرتبہ جمرۂ اُولیٰ کے پاس پہنچ کر راستہ گھیر لیا، حضرت خلیل علیہ السلام نے پھر وہی عمل کیا اور آگے بڑھ کر قربانی کی جگہ پر پہنچ گئے، (یہ واقعہ رُوح المعانی میں بروایت قتادہ رضی اللہ عنہ اور ابن کثیرؒ میں اس کا اکثر حصہ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ بحوالہ مسند احمدؒ منقول ہے)

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ

''یعنی جب باپ اور بیٹے اس عظیم قربانی کے لئے تیار ہوگئے اور باپ نے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے چہرہ کے بل کروٹ پر لٹا دیا، اس طرح گرانے میں تواضع بھی تھی اور یہ حکمت بھی کہ اکلوتے بیٹے کا چہرہ سامنے آکر کہیں ہاتھ میں غیر اختیاری لغزش نہ آجائے، بعض روایات میں ہے کہ خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے نزدیک ذبح کی تکمیل کے لئے پوری قوت سے چھری چلائی، لیکن قدرتِ خداوندی چھری کے عمل میں حائل ہوگئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ اس حالت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ابا جان آپ کے پاس میرے کفن کے لئے کوئی کپڑا نہیں اس لئے تکلیف ہوگی، بہتر یہ ہے کہ میرا کرتہ صاف وسفید ہے اُس کو اتار لیجئے تاکہ کفن کے کام میں آجائے، مقدس باپ کرتہ اُتارنے لگے، اُسی حالت میں غیبی آواز نے معاملے کی کایا پلٹ دی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے فدیہ میں دُنبے کی قربانی

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا

''یعنی ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم آپ نے خواب سچا کر دکھایا، اور اس کے ساتھ ہی ایک دُنبہ حضرت اسمٰعیل کے بجائے قربانی کے لئے نازل کر دیا گیا''۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ

''یعنی ہم نے اسمٰعیل کا فدیہ ایک عظیم قربانی بنا دیا''

اس کو عظیم اس لئے کہا گیا کہ اول تو یہ ایک عظیم الشان پیغمبر کا فدیہ تھی، دوسرے اس لئے کہ اس طرح کی قربانی کو قیامت تک جاری رکھنے کا قانونِ الٰہی بن گیا، (روح) اللہ تعالیٰ نے دُنبے کی قربانی کو اولاد کی قربانی کا بدل قرار دے دیا تو مقدّس باپ اور بیٹے کی شکر گزاری اور خوشی و مسرت کی حد نہ رہی۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ کہ صاحبزادے کے ذبح کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیداری کے بجائے خواب میں دیا گیا، اس میں کیا حکمت ہے؟ راز اس میں یہ ہے کہ اصل مقصودِ حق بیٹے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ باپ بیٹوں کا امتحان ہی مقصود تھا، اس لئے صریح الفاظ میں ذبح کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ خواب میں یہ دکھلایا گیا کہ وہ ذبح کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے وہ عمل مکمل کر دیا جس کو خواب میں دیکھا تھا تو غیبی نداء نے اُن کو امتحان میں کامیابی اور تعمیلِ حکم کی خوش خبری سنا دی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کر ڈالا ہے، بلکہ ذبح کی تیاری دکھلائی گئی تھی وہ پوری ہوگئی۔

اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ خواب میں دُنبہ کو بشکل اسمٰعیل علیہ السلام دکھلایا گیا ہو، جیسے علم کو دودھ کی شکل میں دکھلایا جاتا ہے، دُنبے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام میں معنوی مناسبت یہ تھی کہ دُنبہ ذبح کے لئے مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے، اس کی تخلیق کا منشاء ہی ذبح کر کے استعمال کرنا ہے، بخلاف گائے، بیل اور اُونٹ کے کہ اُن کی تخلیق کا اصل منشاء اُن سے سواری لینا اور بار برداری ہے، کبھی ذبح کر کے گوشت بھی کھالیا جاتا ہے، بخلاف مینڈھے، دُنبے وغیرہ کے کہ اُن کے وجود کا اصل مقصود ہی ذبح کر کے کھانا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اصل مقصود دُنبہ ہی کا ذبح کرنا تھا، مگر امتحان کے لئے اس کو اسمٰعیل علیہ السلام کی شکل میں دکھلایا گیا اور خواب کی اصل تعبیر کی طرف اسی امتحان کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذہن منتقل نہ ہوا، یہاں تک کہ امتحان کی تکمیل ہوگئی۔

ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ اُس دُنبے کے سینگ اور سر ابتداء اسلام تک بیت اللہ کے میزاب میں معلّق تھے، جس کو اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام یعنی قریشِ مکہ نے بطور تبرّک اور یادگار کے بیت اللہ میں محفوظ کر رکھا تھا، بعض حضرات کا بیان ہے کہ مینڈھے کا یہ سر اور سینگ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھے، فتنۂ حجاج میں جب بیت اللہ میں آگ لگی اُس وقت جل گئے۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جب قربانی کا دستور یہ تھا کہ آسمانی آگ اس کو جلا دیتی تھی تو اس مینڈھے کا یہ سر اور سینگ کیسے محفوظ رہے؟ تفسیر روح البیان میں ہے کہ بنی اسرائیل کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی قربانی کرتے تو اس کا عمدہ گوشت الگ کر کے ایک جگہ رکھ دیتے اور آسمانی آگ اس کو جلا دیتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کے جلا دینے کا مطلب یہی تھا کہ کھانے کے قابل عمدہ گوشت آسمانی آگ جلا دیتی تھی، سر، سینگ، سُم وغیرہ کا باقی رہ جانا مستبعد نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سب سے زیادہ سخت اور غالباً آخری امتحان تھا جس میں وہ کوہِ استقلال ثابت ہوئے، اس سے پہلے باپ کو اور اعزہ واحباب کو، وطن اور مکان کو اور عظیم الشان مال ودولت کو اللہ تعالیٰ کے لئے قربان کر چکے تھے اور خود ہی اپنی جان کو قربانی کے لئے پیش کر چکے تھے، اب لختِ جگر اکلوتے صاحبزادے کی قربانی میں انتہائی ثابت قدمی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو سچا کر دکھایا کہ میری موت اور حیات سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

سُنّتِ ابراہیمی علیہ السلام کی یادگار

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مقبول رسول اور خلیل اللہ کے ان اعمال وافعال کو پسند فرما کر قیامت تک اُن کی یادگار کو زندہ رکھنے کے لئے ان افعال واعمال کی نقل کرنے کو اپنی محبوب عبادت قرار دے کر اپنے بندوں پر لازم کر دیا، جس طرح واجباتِ حج میں تینوں جمعرات پر کنکریاں مارنا اسی خلیل الٰہی عمل کی یادگار ہے حجاج پر خصوصاً اور عام مسلمانوں پر عموماً جانور کی قربانی اسی یادگار کو زندہ رکھنے کے لئے لازم کی گئی ہے، جس طرح صفا مروہ کے درمیان دوڑنا اور سات (۷) چکر لگانا حضرت ہاجرہ کے ایک عمل کی یادگار ہے اس کو بھی واجباتِ حج میں داخل کر دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسولِ کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ قربانی کی کیا اصلیت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت و یادگار ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ پھر ہمارے لئے اس میں کیا ثواب ہے؟ فرمایا جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔ (مشکوٰۃ)

اسلامی یادگاریں

دنیا میں عظیم الشان کارناموں کی یادگاریں قائم کرنے کا دستور تو پرانا ہے، مگر عام طور پر اس کے لئے مجسّمے کھڑے کر دینے یا کوئی تعمیر کر دینے کو کافی سمجھا جاتا ہے، جس سے کارنامے کے انجام دینے والے کا اعزاز تو ہوتا ہی ہے اور کچھ دیر تک باقی بھی رہتا ہے، لیکن یادگار قائم کرنے کی اصلی روح اس سے زندہ نہیں رہتی، اسی لئے اسلام نے مجسّمات وتعمیرات کی قدیم رسم کو چھوڑ کر اُن کے افعال کی نقل کرنے کو عبادت بنا دیا، اور قیامت تک کے لئے لوگوں پر لازم کر دیا جس سے نہ صرف اُن اعمال کے کرنے والوں کی یاد ہر وقت زندہ رہتی ہے بلکہ اُن کے اس نیک عمل کا جذبہ بھی دلوں میں بیدار ہوتا ہے، مجسّمات وتعمیرات کتنی ہی مضبوط ہوں آخر کار حوادث کا شکار ہوں گی، لیکن یہ یادگار جس کو عملی طور پر

اُمت کے لئے لازم وواجب قرار دے دیا گیا اور اُن کے احکام قرآن وسنت میں محفوظ کردیئے گئے، رہتی دنیا تک جاری اور باقی ہیں وہ ہر زمانے اور ہر دور میں انسان کو یہ خلیل اللّٰہی سبق دیتی رہتی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردینا ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور اس پر بھی حقِ عبدیت سے سبکدوشی نہیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قربانی کی حقیقت

جب یہ معلوم ہوگیا کہ جانوروں کی قربانی جو ہر سال مسلمانوں پر لازم کی گئی ہے وہ ابراہیمی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جانور کی قیمت کا صدقہ کر دینا یا کسی دوسرے نیک کام میں لگا دینا اس فریضہ سے سبکدوش نہیں کرسکتا، جیسے روزہ کی جگہ نماز یا نماز کے بدل روزہ کافی نہیں، زکوٰۃ کے بدلے میں حج یا حج کے بدلے میں زکوٰۃ کافی نہیں، کوئی شخص اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردے تو ایک نماز کا فریضہ اس سے ادا نہیں ہوتا، اسی طرح صدقہ وخیرات کتنا ہی کرے وہ یادگار ابراہیم علیہ السلام کے قیام اور واجب قربانی کی ادائیگی نہیں ہوگی۔

قربانی کا حکم سب مسلمانوں کے لئے عام ہے حجّاج کے لئے مخصوص نہیں

خلیل اللّٰہی کارناموں میں سے جو چیزیں کسی خاص مقام کے ساتھ مخصوص تھیں وہ تو صرف حجاج پر لازم کی گئی ہیں جو اس مقام پر پہنچ کر انجام دیتے ہیں، جیسے منیٰ میں تینوں جمرات پر کنکریاں مارنا اور صفا ومروہ کے درمیان دوڑنا اور سات چکر لگانا، اور جو چیز اس خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتی ہر جگہ کی جاسکتی ہے، جیسے جانور کی قربانی اس کو تمام اُمت کے لئے حکم عام کے ساتھ واجب ولازم قرار دے دیا گیا، اور خود رسولِ کریم ﷺ اور تمام صحابہؓ

وتابعین اور پوری اُمت ہر خطے، ہر ملک اور ہر جگہ میں اس واجب کی تعمیل کرتے رہے اور اس کو نہ صرف واجباتِ اسلامی میں سے ایک واجب قرار دیا گیا بلکہ شعائرِ اسلام میں داخل سمجھا گیا۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ.

(سورۂ حج: ۳۶)

''یعنی قربانی کے اُونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ کی یادگار بنایا ہے''

اللہ تعالیٰ کی یادگار سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی یادگار ہے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ جو قربانی اُس خاص مقام میں کی جائے جہاں سے اس کا آغاز ہوا ہے یعنی منیٰ میں وہ زیادہ افضل اور موجبِ ثواب وبرکات ہے، اسی لئے رسولِ کریم ﷺ نے اپنے آخری حج میں سو (۱۰۰) اُونٹوں کی قربانی کی جن میں سے تریسٹھ اونٹوں کا نحر بنفس نفیس اپنے دستِ مبارک سے کیا، باقی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد فرمایا۔ (صحیح مسلم)

یہ اتنی بڑی تعداد اسی فضیلت کی وجہ سے کی گئی، ورنہ مدینہ طیبہ میں عام عادت دو دُنبے ذبح کرنے کی تھی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں دس سال قیام فرمایا ہر سال قربانی کرتے تھے (ترمذی) بلکہ بعض مرتبہ کسی سفر میں قربانی کے ایام آگئے تو وہاں پر بھی آپ ﷺ نے قربانی ترک نہیں فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ تھے، ہم نے سات آدمیوں کی طرف سے ایک گائے کی قربانی کی۔

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کا کوئی عمل قربانی سے زیادہ محبوب نہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم مدینہ طیبہ میں اپنی قربانیوں کو فربہ کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے اور سب مسلمانوں کی یہی عادت تھی۔ (صحیح بخاری، کتاب الاضحیہ)

مدینہ طیبہ میں رسولِ کریم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ عید کی نماز کے بعد عید گاہ ہی میں

قربانی کرتے تھے، تاکہ سب مسلمانوں کو اس حکمِ شرعی کی اطلاع بھی ہو جائے اور قربانی کے آداب بھی سیکھ لیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہو جائے کہ نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى. (بخاری)

''یعنی رسول اللہ ﷺ عید گاہ میں ہی قربانی کیا کرتے تھے''۔

غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ قرآنِ کریم میں جو قربانی کا حکم آیا ہے وہ اسی طرح آیا ہے پہلے نماز عید پھر قربانی کی جائے، سورۂ کوثر میں ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ یعنی آپ اپنے رب کے لئے نماز ادا کریں پھر قربانی کریں۔

ابن کثیرؒ نے مفسرین صحابہؓ وتابعینؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، مجاہد، عکرمہ، اور حسن رضی اللہ عنہم سے لفظ وَانْحَرْ کے معنی قربانی کرنے کے بیان کئے ہیں (ابن کثیر) اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، عطاء رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صَلِّ لِرَبِّكَ سے مراد نمازِ عید ہے اور وَانْحَرْ سے مراد قربانی ہے۔ (تفسیر مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ اس قرآنی حکم کے مطابق رسول کریم ﷺ نے اُمّت پر نماز عید و قربانی کو لازم وواجب قرار دیا، خواہ وہ مکّہ میں ہوں یا مدینہ میں یا دنیا کے کسی اور مقام میں، اور اشارۂ قرآنی کے ماتحت نمازِ عید کو مقدم اور قربانی کو اس کے بعد کرنے کا حکم جاری فرمایا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ عید الضحیٰ کے روز نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کو ساتھ لے کر مدینۂ طیبہ کے قبرستان بقیع کی طرف تشریف لے گئے، وہاں ایک میدان میں اول نماز عید ادا کی، پھر سب لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ آج کے دن ہمارا پہلا کام نماز عید ادا کرنا ہے، اس کے بعد قربانی کرنا، جس نے اس کے مطابق عمل کیا تو ہمارے طریقے کے موافق کیا اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کر دیا اس کی قربانی نہیں ہوئی، بلکہ وہ محض کھانے کا ایک گوشت ہو گیا، قربانی اور اس کے ثواب سے اس کا کوئی تعلق

نہیں، (یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اور اس واقعہ کا بقیع غرقد کے قریب ہونا احکام القرآن جصاص کی روایت میں مذکور ہے)

قرآن مجید کی آیات مذکورہ اور روایتِ حدیث اور صحابۂ کرام کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ قربانی کا عبادت ہونا تو عہدِ آدم علیہ السلام سے ثابت ہے، مگر عید الضحیٰ میں اس کا ضروری اور واجب ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کے طور پر جاری ہوا، اور قرآن وسُنت کی نصوص میں اس کو اسلامی واجبات میں ایک اہم واجب قرار دیا، جو ہر مُلک، ہر خطّے اور ہر زمانے میں ضروری ہے، رسولِ کریم ﷺ اور صحابۂ کرام نے ہمیشہ مدینہ طیبہ میں بھی قربانی کا فریضہ ادا کیا، اس زمانے کے بعض لوگوں نے جو قربانی کو مکّہ معظّمہ کے ساتھ مخصوص اور وہ بھی کسی عبادت کے طور پر نہیں بلکہ حجاج کی مہمانی کے طور پر سمجھا ہے وہ نہ صرف قرآن وحدیث سے بلکہ تمام شرائع انبیاء اور ان کی تاریخ سے بالکل ہی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر قربانی کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ مکّہ میں جمع ہونے والے حجاج کی مہمانی اس سے کی جائے تو پھر اس میں نمازِ عید سے پہلے اور بعد میں کیا فرق پڑتا ہے اور بارہ تاریخ کی شام کے بعد قربانی ممنوع ہو جانے کے کیا معنی ہوتے ہیں، کیا تیرہ تاریخ کو حجاج مکہ میں نہیں رہتے؟ اگر مہمانی اس کا مقصد تھا تو قربانی کے جانوروں کے لئے جو شرائط رسول کریم ﷺ نے عمر وغیرہ کے لحاظ سے بیان فرمائی ہیں اُن شرائط کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ نیز کیا مہمان کو صرف گوشت کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی؟ اگر مہمانی مقصود ہوتی تو قربانی کے ذریعے گوشت مہیا کرنے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسری اشیاء خوردنی جمع کرنے کا فریضہ عائد کیا جاتا، خصوصاً جب کہ مدینہ طیبہ میں بھی رسولِ کریم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ سے ہر سال قربانی کرنا ثابت ہے، تو پھر اس کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا اور اس کو اسلام میں ٹھونسنا بہت ہی بڑی جرأتِ رندانہ ہے۔

اقتصادی سوال

جب انسان روحانیت سے غافل ہو کر صرف مادی خواہشات کی بھول بھلیاں میں

پڑ جاتا ہے، مادہ و صورت ہی اس کا اوڑھنا بچھونا اور علم و ہنر کا مقصد بن جاتا ہے اور اللہ جلّ شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور اس کا عجیب و غریب نظام اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، تو اس کو ساری ہی عبادات بے جان رسوم محسوس ہونے لگتی ہیں، خصوصاً قربانی کا مسئلہ اس کو ایک اقتصادی مشکل بن کر سامنے آتا ہے، وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ قوم کا اتنا روپیہ جو جانوروں کے ذبیحہ پر ہر سال خرچ ہو جاتا ہے اور تین روز گوشت کھا لینے کے سوا اس کا کوئی مفاد نظر نہیں آتا، اگر اس سے رفاہی اور قومی کام چلائے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا، لیکن جس حقیقت شناس کے سامنے قوم کے اخلاق و اعمال کی اصلاح اس کا پیٹ پالنے اور اس کی نفسانی لذتوں کو پورا کرنے سے زیادہ مقدم ہے، بلکہ وہ بجا طور پر یہ بھی سمجھتا ہے کہ انسان کی روٹی اور پیٹ کا مسئلہ بھی امن و سکون کے ساتھ صحیح طور پر اسی وقت حل ہوسکتا ہے جب کہ انسان انسان بن جائے، انسان اخلاق سے آراستہ ہوں، ورنہ لوٹ مار، دھوکہ فریب، چوری و جیب تراشی کی وجہ سے کوئی شخص اپنی جگہ مامون و مطمئن نہیں رہے گا، چور بازاری کی وجہ سے سامانِ زندگی گراں ہو جائے گا، رشوت کی وجہ سے حق دار کو حق نہ ملے گا، وہ جس طرح قوم کی تعلیم پر خرچ کرنے کو اس کی دوسری ضروریات سے زیادہ اہمیت دے گا، اس سے بھی زیادہ اس خرچ کو اہمیت دے گا جس کے ذریعہ انسان کے اخلاق درست ہوں اور مشاہدہ و تجربہ شاہد ہیں کہ اخلاق و اعمال کی روشنی کے لئے خدا تعالیٰ کے خوف اور اس کی رضا جوئی سے بڑھ کر کوئی کامیاب نسخہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو اپنی خلوتوں میں بھی جرائم سے باز رکھتا ہے اور قربانی اس جذبے کو قوی کرنے میں خاص اثر رکھتی ہے۔

اس لئے قوم کی فلاح و بہبود اس میں نہیں کہ قربانی کو بند کر کے روپیہ بچانے اور جمع کرنے کی نفسانی خواہشات کو ہوا دی جائے، بلکہ اس کی حقیقی فلاح اس میں ہے کہ قوم میں جذبۂ ایثار و قربانی پیدا کرنے کے لئے اس خرچ کو شوق و محبت کے ساتھ قبول کیا جائے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قربانی کا مقصد گوشت کھانا یا کھلانا

ہرگز نہیں، بلکہ ایک حکم شرعی کی تعمیل اور سنتِ ابراہیمی کی یادگار کو تازہ کر کے جذبۂ ایثار و قربانی کی تحصیل ہے، قرآنِ کریم نے خود اس حقیقت کو اس طرح واضح فرما دیا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ.

"یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس اُن قربانیوں کے گوشت یا خون نہیں پہنچتے ہاں تمہارا تقویٰ یعنی جذبۂ اطاعت پہنچتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ قربانی کا گوشت پوست کوئی مقصد نہیں، یہی وجہ ہے کہ پچھلی اُمتوں کے لئے تو یہ گوشت حلال بھی نہ تھا، اس اُمت پر خصوصی طور پر حلال کر دیا گیا ہے، بلکہ اصل مقصد قربانی کا جذبۂ اطاعت پیدا کرنا ہے۔

قربانی پر دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ تین تاریخوں میں بیک وقت لاکھوں جانور ہلاک ہو جاتے ہیں تو اس کا مضر اثر قومی اقتصادیات پر یہ پڑنا بھی ناگزیر ہے کہ جانور کم ہو جائیں گے اور سال بھر لوگوں کو گوشت ملنے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی، لیکن یہ خیالات صرف اس وقت انسان کے ذہن پر مسلط ہوتے ہیں جب کہ وہ خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ اور اس کے نظامِ محکم کے مشاہدے سے بالکل غافل ہو جائے

نظامِ قدرت پورے عالم میں ہمیشہ سے یہ ہے کہ جب دنیا میں کسی چیز کی ضرورت بڑھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس چیز کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں اور جب ضرورت کم ہو جاتی ہے تو پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے، جیسے کوئی شخص کنویں کے پانی پر رحم کھا کر اس لئے نکالنا چھوڑ دے کہ کہیں ختم نہ ہو جائے، تو اس کے سوتے بند ہو جائیں گے اور کنواں پانی نہ دے گا اور جتنا زیادہ نکالتا چلا جائے گا اُتنا ہی کنویں سے پانی زیادہ ملے گا، اعداد و شمار کا حساب لگا کر دیکھیں تو پچھلے زمانے میں جتنی قربانی کی جاتی تھی اُتنی آج نہیں ہے، جس طرح آج تمام احکامِ دین نماز روزہ میں سُستی آ گئی، قربانی کے مسئلے میں اس سے زیادہ سستی برتی جاتی ہے، اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں قربانی کا عالم یہ تھا کہ ایک ایک آدمی سو سو اُونٹ کی قربانی کرتا تھا، خود رسولِ کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سو اُونٹ کی قربانی کی اور تریسٹھ کی قربانی کا فریضہ خود

اپنے دستِ مبارک سے انجام دیا، قربانی کی اس فراوانی اور زیادتی کے زمانے میں کسی جگہ یہ شکایت نہیں سُنی گئی کہ جانور نہیں ملتے یا گراں ملتے ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ نماز، روزہ اور دوسری عبادات کی طرح قربانی میں سخت غفلت برتی جارہی ہے، لاکھوں انسان جن کے ذمّے شرعاً قربانی لازم ہے قربانی نہیں کرتے تو اس وقت جانوروں کی کمی کو قربانی کا نتیجہ کہنا واقعات کے سراسر خلاف ہوگا، اس زمانے میں بھی بہت سے ملک ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی برائے نام ہے نہ وہاں قربانی ہوتی ہے نہ قربانی کی وجہ سے کوئی جانور کم ہوتا ہے، مگر جانور اور گوشت کی گرانی وہاں ہمارے ملکوں سے زیادہ نظر آتی ہے اور کسی کا ایسا ہی دل چاہے تو ایک سال کسی شہر یا کسی ملک میں قربانی بند کر کے دیکھ لے کہ قوم کی اقتصادیات میں اس کا کیا خوشگوار اثر ہوتا ہے ؟ اور جانور اور گوشت کی یا دودھ اور گھی کی کتنی ارزانی ہو جاتی ہے؟ کوئی مسلم ملک تو انشاء اللہ اس کا تجربہ کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا، ہمارا پڑوسی ملک بھارت موجود ہے جہاں گائے کی حد تک نہ صرف سالانہ قربانی بلکہ روزانہ گوشت خوری بھی بند ہے، لیکن کیا کسی نے دیکھا کہ وہاں گلی گلی گائے پھرتی ہے؟ یا دودھ کی ندیاں بہتی ہیں؟ یا گھی ارزاں ہوگیا ہے؟ مشترکہ ہندوستان میں جب کہ دس کروڑ مسلمان اور انگریزی فوج روزانہ لاکھوں گائے ذبح کیا کرتے تھے اور سالانہ قربانی بھی ہوتی تھی اور دودھ کا جو نرخ بھارت میں اُس وقت تھا آج شاید اس سے گراں تو ہو مگر ارزانی کا کہیں نام نہیں۔

اور قدرت کے دستور کے مطابق ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر وہاں گائے کا خرچ اسی طرح کم ہوتا چلا گیا تو کچھ عرصے میں وہاں گائے کی پیداوار نہ ہونے کے قریب ہو جائے گی اور کیا یہ مثال سارے جہاں کے سامنے نہیں کہ اب سے سو سال پہلے سارے سفر گھوڑوں پر طے کئے جاتے تھے اور ساری دنیا کی جنگیں صرف گھوڑوں کے ذریعے سر کی جاتی تھیں، فوج کے لئے لاتعداد گھوڑے پالے جاتے تھے، عصرِ حاضر میں جب گھوڑوں کی جگہ موٹروں اور ہوائی جہازوں نے لے لی تو کیا دنیا میں گھوڑے زیادہ اور سستے ہو گئے یا ان کی تعداد گھٹ گئی

اور قیمت بڑھ گئی؟

یہ قدرت کا کارخانہ، اس کا نظام انسانی فہم وادراک اور انسانی تجویزوں سے بہت بلند ہے، کاش! قربانی کی حقیقت سے ناآشنا مسلمان سوچیں اور غور کریں اور قربانی کو ایک رسم یا عید کی تفریح کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کی حقیقت کو سامنے رکھ کر سنتِ ابراہیمی کے اتباع کے طور پر ادا کریں تو ایمان وعمل میں قوت اور اخلاص کی برکات کا مشاہدہ ہونے لگے۔

ہر عبادت میں ثواب کے علاوہ کچھ مخصوص آثار بھی ودیعت رکھے گئے ہیں جیسے نماز میں تواضع وانکسار، زکوٰۃ میں حبِّ مال سے قلب کی صفائی، روزہ اور حج میں اللہ جلّ شانہٗ کی محبت میں ترقی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح قربانی سے ایمان واخلاص میں قوت، اعمالِ شاقہ کے لئے عزم وہمت پیدا ہوتی ہے۔

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ

احکامِ عید الاضحیٰ وقربانی

عشرہ ذی الحجہ کے فضائل

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے عشرہ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں، ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور ایک رات میں عبادت کرنا شبِ قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ (ترمذی وابن ماجہ)

قرآنِ مجید سورۃ الفجر میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول میں یہی عشرہ ذی الحجہ کی راتیں ہیں خصوصاً نویں تاریخ یعنی عرفہ کا دن اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات، ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں، عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہے اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

تکبیرِ تشریق

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ ط

عرفہ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرہویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز فرض کے بعد بآواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے، فتویٰ اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے

والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں، اسی طرح مرد وعورت دونوں پر واجب ہے، البتہ عورت بآواز بلند تکبیر نہ کہے آہستہ کہے۔ (شامی)

تنبیہ:

اس تکبیر کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے، بہت لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں پڑھتے ہی نہیں، یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

نمازِ عید

عید الاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں، صبح کو سویرے اُٹھنا، غسل ومسواک کرنا، پاک صاف عمدہ کپڑے جو اپنے پاس ہوں پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا، عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیرِ مذکور الصدر بآواز بلند پڑھنا۔

نماز عید دو رکعت ہیں مثل دوسری نمازوں کے، فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں، پہلی رکعت میں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے، ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اُٹھانا چاہئے، پہلی رکعت میں دو تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں، دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں، نماز عید کے بعد خطبہ سننا واجب ہے۔

قُربانی

قربانی ایک اہم عبادت اور شعائرِ اسلام میں سے ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے، اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بُتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں، سورۂ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ جس طرح

نماز اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی قربانی بھی اسی کے نام پر ہونا چاہئے، فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ کا یہی مفہوم ہے۔

دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (ابن کثیر)

رسول اللہ ﷺ نے بعد ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا ہر سال برابر قربانی کرتے تھے (جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظمہ کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ہر شخص پر ہر شہر میں بعد تحقیق شرائط واجب) (ترمذی) اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے، اسی لئے جمہور اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے۔ (شامی)

قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟

قربانی ہر مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم پر واجب ہوتی ہے جس کی ملک میں ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد موجود ہو، یہ مال خواہ سونا، چاندی یا اس کے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھریلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ۔ (شامی) قربانی کے معاملہ میں اس پر سال گذرنا بھی شرط نہیں۔

بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو بھی تو اس پر یا اس کی طرف سے اس کے ولی پر قربانی واجب نہیں، اسی طرح جو شخص شرعی قاعدے کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں۔ (شامی)

مسئلہ :...... جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اس کی قربانی واجب ہوگئی۔ (شامی)

قربانی کے دن

قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں، قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں تاریخیں ہیں، اِن میں جب چاہے قربانی کرسکتا ہے، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے۔

قربانی کے بدلے میں صدقہ وخیرات

اگر قربانی کے دن گذر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کرسکا تو قربانی کی قیمت فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانور کی قیمت صدقہ کردینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا، ہمیشہ گناہ رہے گا، کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے، جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ وخیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول کریم ﷺ کے اشادات اور تعامل اور تعاملِ صحابۂ کرامؓ اس پر شاہد ہیں۔

قربانی کا وقت

جن بستیوں، شہروں میں نمازِ جمعہ وعیدین جائز ہے وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں، اگر کسی نے نماز سے پہلے قربانی کردی تو اس کو دوبارہ قربانی لازم ہے البتہ چھوٹے گاؤں میں جہاں جمعہ وعیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں تو یہ لوگ دسویں تاریخ کو صبح صادق کے بعد قربانی کرسکتے ہیں، ایسے ہی اگر کسی کسی عذر کی وجہ سے نماز عید پہلے دن نہ ہوسکے تو نمازِ عید کا وقت گذر جانے کے بعد قربانی درست ہے۔

مسئلہ:...... قربانی رات کو بھی جائز ہے، مگر بہتر نہیں۔ (شامی)

قربانی کے جانور

بکرا، دُنبہ، بھیڑ کی ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے، گائے، بیل، بھینس، اُونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے، بشرطیکہ سب کی نیت ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔

مسئلہ:...... بکرا، بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیڑ اور دُنبہ اگر اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو وہ بھی جائز ہے، گائے، بیل، بھینس دو سال کی، اُونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ:...... اگر جانوروں کے فروخت کرنے والا عمر پوری بتاتا ہے اور ظاہری حالات میں اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی، اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:...... جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں، یا بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہو، اس کی قربانی درست ہے، ہاں سینگ جڑ سے اُکھڑ گیا ہو جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے تو اس کی قربانی درست نہیں۔ (شامی)

مسئلہ:...... خصّی (بدھیا) بکرے کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے۔ (شامی)

مسئلہ:...... اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں، اسی طرح ایسا مریض اور لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں سے نہ جا سکے اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔ (درمختار)

مسئلہ:...... جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دُم وغیرہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔ (شامی)

مسئلہ:...... جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں یا اکثر نہ ہوں اس کی قربانی جائز نہیں، (شامی ودرمختار) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ:......اگر جانور صحیح سالم خریدا تھا پھر اس میں کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہوگیا، تو اگر خریدنے والا غنی صاحبِ نصاب نہیں ہے تو اس کے لئے اسی عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے اور اگر یہ شخص غنی صاحبِ نصاب ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرے۔ (درمختار)

قربانی کا مسنون طریقہ

اپنی قربانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے، اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے، مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ:......قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ ذبح کرنے کے وقت بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا ضروری ہے، سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے رُو بقبلہ لٹائے تو یہ دُعا پڑھے:۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

اور ذبح کرنے کے بعد یہ دُعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْہُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ وَّ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ.

قربانی کا گوشت

۱)...... جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کر کے تقسیم کیا جائے اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔

۲)...... افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لئے رکھے، ایک حصہ احباب واعزّاء میں تقسیم کرے، ایک حصہ فقراء ومساکین میں تقسیم کرے اور جس شخص کا عیال زیادہ ہو وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔

۳)...... قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔

۴)...... ذبح کرنے والے کی اُجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں، اُجرت علیحدہ دینی چاہئے۔

قربانی کی کھال

(۱) قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا مثلاً مصلّٰے بنالیا جائے یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوالیا جائے یہ جائز ہے، لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں، بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدون نیت صدقہ کے جائز بھی نہیں۔ (عالمگیری)

(۲) قربانی کی کھال کسی کی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اسی لئے مسجد کے مؤذّن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر اُن کو کھال دینا درست نہیں۔

(۳) مدارس اسلامیہ کے غریب ونادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں، کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے اور احیائے علمِ دین کی خدمت بھی، مگر مدرّسین وملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں، واللہ الموفق والمعین:

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کراچی ۱۴

۲۷/ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسائل

چرمِ قُربانی

مرتبہ

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب صدر دار العلوم کراچی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

قربانی کی کھال فروخت نہ کی جائے تو شریعت نے قربانی کرنے والے کو اُس میں کئی طرح کا اختیار دیا ہے لیکن فروخت کرنے سے اکثر صورتوں میں قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، بعض صورتوں میں واجب نہیں ہوتا، یہاں ان سب مسائل کی ضروری تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

کھال کے احکام

۱) قربانی کی کھال اپنے اور اہل وعیال کے استعمال میں لانا جائز ہے مثلاً جائے نماز، کتابوں کی جلد، مشکیزہ، ڈول، دستر خوان، جُراب، جوتہ وغیرہ کوئی بھی چیز بنا کر استعمال کی جاسکتی ہے، بلا کراہت جائز ہے۔(ہدایہ ودرّ مختار)

لیکن ان چیزوں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، اگر دے دیں تو جو کرایہ ملے، اُس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔(شامی وعالمگیری)

۲) یہ بھی جائز کہ کھال یا اُس کی بنائی ہوئی چیز کسی کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دے دی جائے، جس کو دی جائے خواہ وہ سید اور مال دار ہو، یا اپنے ماں باپ اور اہل وعیال ہوں، اجنبی ہو یا رشتہ دار، کافر ہو یا مسلمان، بلا معاوضہ ہر ایک کو دینا جائز ہے۔(ہدایہ، عالمگیری، امداد الفتاویٰ)

۳) فقراء مساکین کو خیرات بھی دی جاسکتی ہے، مگر یہ مستحب ہے، واجب نہیں۔ (بحر، عالمگیری)

۴) قربانی کی کھال، گوشت، چربی، اُون، آنتیں وغیرہ، یعنی قربانی کے جانور کا کوئی جز کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اگر دے دیا تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہے۔(ہدایہ، عالمگیری، امداد الفتاویٰ)

۵) قربانی کے جانور کی جھول، رسّی اور ہار جو گلے میں پڑا ہو، وہ بھی کسی کی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، ان چیزوں کو خیرات کر دینا مستحب ہے۔ (شامی، عالمگیری، ہدایہ، عزیز الفتاویٰ)

قربانی کی کوئی چیز قصائی وغیرہ کو بھی اُس کی مزدوری میں دینا جائز نہیں، اس کی مزدوری الگ دینی چاہئے۔(ہدایہ، درّ مختار)

امام ومؤذّن کو بھی حق الخدمت کے طور پر دینا جائز نہیں، حق الخدمت اور معاوضے

کے بغیر ہر ایک کو دے سکتے ہیں، ان کو بھی دے سکتے ہیں۔

کھال کی قیمت کے احکام

۶) قربانی کی کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کو فروخت کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ روپے کے بدلے فروخت کی تو اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے، اسی طرح ایسی کسی اور چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں نہیں آتی، یعنی اُسے خرچ کئے بغیر اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور تیل، پٹرول، رنگ وروغن وغیرہ، تو ان اشیاء کا بھی صدقہ واجب ہے، یہ فقراء ومساکین کا حق ہے کسی اور مصرف میں لانا جائز نہیں۔

(ہدایہ، بدائع، امداد الفتاویٰ)

ان اشیاء کے بدلے قربانی کی کھال اس نیت سے فروخت کرنا کہ اپنے خرچ میں لے آئیں گے، مکروہ بھی ہے، صدقہ کرنے کی نیت سے فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن کسی بھی نیت سے فروخت کی ہو بیع نافذ ہو جائے گی اور ان اشیاء کا صدقہ بہر حال واجب ہوگا۔ (بحر، درمختار، عالمگیری)

اور اگر قربانی کی کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کسی ایسی چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں آتی ہے یعنی اسے خرچ کئے بغیر اُس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، مثلاً کپڑے، برتن، میز، کرسی، کتاب، قلم وغیرہ، تو ان اشیاء کا صدقہ واجب نہیں، بلکہ ان کا وہی حکم ہے جو پیچھے کھال کا بیان ہوا، کہ خود اپنے کام میں لانا، دوسرے کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دے دینا اور خیرات کرنا، سب جائز ہے۔

(ہدایہ، بدائع، درمختار، امداد الفتاویٰ)

پھر اگر ان اشیاء کو روپے یا کھانے پینے اور خرچ ہونے والی اشیاء کے بدلہ فروخت کر دیا تو حاصل ہونے والی قیمت کا صدقہ واجب ہوگا۔ (مدادالفتاویٰ ج ۳ ص ۵۷۳)

مَصْرَف؟

۷) اوپر اور آگے جن جن مسائل میں صدقہ کا واجب ہونا بیان کیا گیا ہے وہ صدقہ صرف انہی فقراء ومساکین کو دیا جاسکتا ہے جنہیں زکوٰۃ دینا درست ہے، جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اُنہیں یہ صدقہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔ تفصیل آگے مسائل میں آرہی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۶ وص ۵۶۶ ج ۳)

۸) جس کی ملکیت میں اتنا مال ہو کہ جس سے زکوٰۃ یا قربانی واجب ہو جاتی ہے، وہ شرعاً مال دار ہے اُسے یہ صدقہ دینا جائز نہیں، اور جس کے پاس اس سے کم مال ہو وہ شرعاً غریب اور مستحق زکوٰۃ ہے اُسے یہ صدقہ بھی دیا جاسکتا ہے۔

(درمختار ص ۹۹ ج ۲ و بحر ص ۲۶۳ ج ۲)

نابالغ بچوں کا باپ اگر مال دار ہو تو ان کو بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر اولاد بالغ ہو اور مال دار نہ ہو تو اُن کو دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مال دار کی بیوی اگر مال دار نہ ہو تو اُسے بھی دے سکتے ہیں۔ (ہدایہ)

اگر نابالغ بچوں کی ماں تو مالدار ہے، باپ مال دار نہیں، تو ان بچوں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (درمختار)

۹) سیّد اور بنو ہاشم کو (یعنی جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ، یا حضرت حارث رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں ہوں ان کو) یہ صدقہ دینا جائز نہیں۔ (شامی، ہدایہ، بحر، امداد الفتاویٰ)

۱۰) اپنے ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پردادا وغیرہ کو جن کی اولاد میں یہ خود ہیں، یہ صدقہ دینا درست نہیں۔ (ہدایہ ج ۱)

اسی طرح اولاد، پوتے، پوتی، نواسے، نواسی وغیرہ کہ جو اس کی اولاد میں داخل

ہیں، اُن کو دینے سے بھی یہ صدقہ ادا نہ ہوگا، شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ (ہدایہ ج۱)

باقی سب رشتہ داروں کو دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں، بلکہ اُن کو دینے میں دوگنا ثواب ہے، ایک خیرات کا اور دوسرا اپنے عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا۔ (شامی ج۲)

۱۱) فتویٰ اس پر ہے کہ یہ صدقہ کافر کو نہ دیا جائے۔

(شامی ص۹۲ ج۲ و در مختار ص۱۰۸ ج۲ و امداد المفتین ۴۶۴)

۱۲) کسی کی مزدوری یا حق الخدمت کے طور پر یہ صدقہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔

۱۳) زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کی طرح اس صدقہ کی ادائیگی کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ یہ کسی فقیر مسکین کو مالکانہ طور پر دے دیا جائے، جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضے کے بغیر یہ صدقہ بھی ادا نہ ہوگا۔

(دُرِّ مختار ص۱۸ ج۴ و امداد الفتاویٰ)

چنانچہ اسے مسجد، مدرسہ، شفاخانہ، کنویں، پُل، یا کسی اور رفاہی ادارے کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی لاوارث کے کفن دفن، یا میت کی طرف سے قرض ادا کرنے میں بھی اسے خرچ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہاں کسی فقیر کو مالک بنانا اور اس کے قبضے میں دینا نہیں پایا گیا۔ (کنز، بحر، ہدایہ)

کسی ایسے مدرسے یا انجمن وغیرہ میں دینا بھی کہ جہاں وہ غریبوں کو مالکانہ طور پر نہ دیا جاتا ہو، بلکہ ملازمین کی تنخواہوں، یا تعمیر اور فرنیچر وغیرہ انتظامی مصارف میں خرچ کر دیا جاتا ہو، جائز نہیں۔ البتہ اگر کسی ادارے میں غریب طلبہ یا دوسرے مسکینوں کو کھانا وغیرہ مفت دیا جاتا ہو تو وہاں یہ صدقہ دینا جائز ہے، لیکن یہ اُس وقت ادا ہوگا جب وہ رقم بعینہٖ، یا اس سے خریدی ہوئی اشیاء مثلاً کھانا، کتابیں، کپڑے، دوا وغیرہ اُن غریبوں کو مالکانہ طور پر مُفت دے دی جائیں۔ (امداد الفتاویٰ)

حیلۂ تملیک

البتہ اگر کھال کسی غریب یا مال دار کو یا کھال کی رقم کسی غریب کو مالکانہ طور پر قبضہ میں دے دی، اور صراحت کر دی کہ تم اس کے پوری طرح مالک ہو ہمیں اس میں کوئی اختیار نہیں، پھر وہ اپنی خوشی سے اس کی رقم مسجد، مدرسہ یا کسی بھی رفاہی ادارے کی تعمیر یا اُس کے ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ میں اپنی طرف سے لگا دے تو یہ جائز ہے مگر یاد رہے کہ ''حیلۂ تملیک'' کے نام سے جو کھیل عام طور سے کھیلا جاتا ہے اُس سے زکوۃ کی طرح یہ صدقہ بھی ادا نہیں ہوتا، کیونکہ عموماً جس کو یہ دیا جاتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مجھے اس مال کا کوئی اختیار نہیں، اگر اپنے پاس رکھ لوں گا تو لوگ ملامت کریں گے، اس خوف اور شرم سے بے چارہ یہ رقم چندہ میں دے دیتا ہے، یہ محض زبانی جمع خرچ ہے، اس طرح نہ وہ مالک ہوتا ہے نہ دینے والے کا صدقہ ادا ہوتا ہے اس حیلے سے یہ رقم مسجد یا مدرسہ وغیرہ کی تعمیر و انتظامی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۴ ج ۳)

متفرق مسائل

۱۴) بعض لوگ جانور کی کھال اس طرح اتارتے ہیں کہ اُس میں چھری لگ کر سوراخ ہو جاتے ہیں یا کھال پر گوشت لگا رہ جاتا ہے، جس سے کھال کو نقصان پہنچتا ہے بعض لوگ کھال اتارنے کے بعد اس کی حفاظت نہیں کرتے، سڑ کر بے کار یا بہت کم قیمت کی رہ جاتی ہے، یہ سب اُمور اسراف اور ''تبذیر'' (فضول خرچی) میں داخل ہیں، جس کی ممانعت قرآنِ کریم میں آئی ہے اس لئے کھال احتیاط سے اتار کر ضائع ہونے سے بچانا شرعاً ضروری ہے۔

۱۵) جس نے قربانی کی کھال خریدی وہ اس کا مالک ہو گیا اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے، خواہ اپنے پاس رکھے، یا فروخت کر کے قیمت اپنے خرچ میں لائے۔ (امداد الفتاویٰ)

۱۶) قربانی کی گائے میں جو لوگ شریک ہوں وہ کھال میں بھی اپنے اپنے حصے کے برابر شریک ہوں گے، کسی ایک شریک کو یہ کھال باقی شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے پاس رکھ لینا، یا کسی کو دے دینا جائز نہیں۔

۱۷) اگر ایک شریک باقی شرکاء سے اُن کے حصے جو کھال میں ہیں خرید لے تو اب پوری کھال اپنے استعمال میں لانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر اگر یہ شخص اس کھال کو روپے، یا کھانے پینے کی اشیاء کے بدلے فروخت کرے گا تو قیمت کا ساتواں حصہ جو اس کا اپنا تھا، اس کا تو صدقہ واجب ہوگا اور باقی چھ حصے جو شرکاء سے خریدے تھے ان کی قیمت کا صدقہ اس پر واجب نہیں، اُسے اپنے خرچ میں لا سکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۷۵ ج ۳)

۱۸) مذکورہ بالا سب مسائل میں جو احکام کھال کے ہیں وہی جانور ذبح کرنے کے بعد اس کی اُون اور بالوں کے ہیں اور اگر اُون اور بال فروخت کر دیئے تو جو تفصیل کھال کی قیمت کے متعلق بیان کی گئی وہی ان کی قیمت میں بھی ہوگی۔

مگر یاد رہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اُس کی اُون یا بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کاٹ لئے تو ان کا یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں۔ (ہدایہ، عالمگیری، بحر، شامی)

وَاللہ اعلم

قُربانی کی تاریخی

اور

شرعی حیثیت

از مولوی عبدالغفار ارکانی ...... اُستاذ دار العلوم کراچی

قربانی کا لفظ قربان بروزن سُلطان سے نکلا ہے، عربی زبان میں قربان اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کیا جائے، چنانچہ ابوالسّعودؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

القربان اسم لما يتقرب به الى الله تعالىٰ من نسك او صدقة.[1]

''قربان ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کیا جائے خواہ وہ ذبیحہ ہو یا صدقہ وخیرات۔''

بعینہٖ یہی بات امام راغب اصفہانیؒ نے المفردات ص ۴۰۸ میں بھی لکھی ہے اور امام ابوبکر جصاصؒ نے تو اس سے عام مراد لئے ہیں، چنانچہ وہ احکام قرآن میں لکھتے ہیں:

والقربان ما يقصد به القرب من رحمة الله تعالىٰ من اعمال البر.[2]

---

(۱)...... تفسیر ابی السعود، ص ۲۰ ج ۲ المطبعۃ المصریۃ ۱۳۴۷ھ

(۲)...... احکام القرآن للجصاص الحنفی ص ۴۸۷ ج ۲ المطبعۃ البہیۃ المصریۃ ۱۳۴۷ھ۔

''یعنی قربان ہر اس نیک کام کو کہا جاتا ہے جس سے مقصد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قرب حاصل کرنا ہو۔''

البتہ عرفِ عام میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے عموماً جانور کا ذبیحہ مراد ہوتا ہے، جیسا کہ امام راغبؒ نے تصریح کی ہے انہوں نے المفردات میں معنی لغوی بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

وصار فی التعارف اسمًا للنسکیة التی ھی الذبیحة. (۱)

''یعنی عرف میں یہ ذبیحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے''۔

لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس کے معنی لغوی کی رعایت کرتے ہوئے عام معنی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ فرید وجدی صاحب ''دائرۃ معارف القرآن'' میں رقمطراز ہیں۔

والقربان فی الاصطلاح الدینی ھو ما یبذله الانسان من الاشیاء او الحیوانات قاصدًا به التقرب الی اللّٰه (۲)

''اور قربان دین کی اصطلاح میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو انسان اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتا ہے، خواہ وہ کوئی حیوان ہو یا کوئی اور چیز۔''

قرآنِ کریم میں لفظ ''قربان'' کا استعمال تین مواقع پر ہوا ہے۔

(۱) سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ. (۳)

''وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک نہ لائے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے اُس کو آگ۔''

(۱)......المفردات للامام الراغب ص ۴۰۸، اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۰ھ

(۲)......دائرۃ معارف القرآن لمحمد فرید وجدی، ص ۳۶۷ ج ۷، مطبعۃ دائرۃ معارف القرآن العشرین بمصر ۱۳۵۷ھ

(۳)......آل عمران آیت ۱۸۳

(۲) سورۂ مائدہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں ہابیل و قابیل کے واقعہ میں ارشاد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْقَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ.(۱)

''اور سنا اُن کو حال آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نا مقبول ہوئی دوسرے کی''۔

(۳) سورۂ احقاف میں ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً (۲)

''سو خدا تعالیٰ کے سوا جن جن چیزوں کو انہوں نے خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، اُنہوں نے اُن کی مدد کیوں نہ کی۔''

پہلی دونوں آیتوں میں لفظ ''قربان'' اپنے معنی اصطلاحی میں استعمال ہوا ہے اور تیسری آیت میں ''قرباناً'' سے مراد تقرب حاصل کرنا ہے۔

عربی زبان میں قربانی کے لئے تین الفاظ اور مستعمل ہیں:

(۱) النسک، یہ متعدد معنی کے لئے آتا ہے، سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:

النسک مثلثة وبضمتين، العبادة والطاعة وكلّ ما تقرب به الى اللّٰه تعالى (۳)

''یعنی نُسک کا اطلاق عبادت، طاعت اور ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے۔''

منتہی الارب میں ہے: نسک، بضمتين وبالضم، قربانی۔(۴)

(۱)...... سورۂ مائدہ آیت ۲۷ (۲)...... سورۂ احقاف آیت ۲۸

(۳)...... تاج العروس للسید مرتضیٰ زبیدی، ص ۱۸۶ ج ۷

(۴)...... منتہی الارب، ص ۸۴۵ ج ۳ مطبع مصطفائی لاہور ۱۸۹۷ء

قرآنِ کریم میں لفظ ''نسک'' متعدد مقام پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، کہیں اس سے قربانی مراد لی گئی ہے، کہیں عبادت اور کہیں مطلق طاعت، لیکن مندرجہ ذیل آیتوں میں اس سے عموماً قربانی مراد لی گئی ہے۔

۱)......سورۂ بقرہ میں احکام حج بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ط[۱]

''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات یا قربانی۔''

۲)......سورۂ انعام میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط[۲]

''تو کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔''

۳)......سورۂ حج میں ارشاد ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (۳)

''اور ہر اُمت کے واسطے ہم نے مقرر کردی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ تعالیٰ کا نام ذبح پر چوپاؤں کے جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں۔''

(۲) دوسرا لفظ جو قربانی کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ النحر ہے، اس کا استعمال صرف سورۂ کوثر میں ہوا ہے، ارشاد ہے:

(۱)......سورۂ البقرہ آیت: ۱۹۶۔ (۲)......سورۂ الانعام آیت: ۱۶۲۔ (۳)......سورۂ الحج آیت: ۳۴

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ط

''پس نماز پڑھ اپنے رب کے واسطے اور قربانی کر''۔

اس جگہ پر عام مفسرین کی تصریح کے مطابق ''وانحر'' سے قربانی مراد ہے، مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

(۳) تیسرا لفظ الۡاَضۡحِیَة یا الضحیہ ہے ملاّ علی قاریؒ، علاّمہ طیبیؒ سے نقل کرتے ہیں:

قال الطیبی الاضحیة ما یذبح یوم النحر عَلٰی وجه القربة [۱]

''اضحیہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جو (ذی الحجہ کی) دسویں تاریخ کو عبادت کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔''

جمال الدین بن منظور افریقی فرماتے ہیں:

الضحیة الشاة التی تذبح ضحوة، [۲]

''ضحیہ اس بکری کو کہا جاتا ہے جو ضحیٰ (چاشت) کے وقت ذبح کی جاتی ہے۔''

منتہی الارب میں ہے۔

ضحیۃ کسفیۃ گوسپند [۳] قربانی　　ضحیۃ بروزن سفیہ قربانی کی بکری

البتہ اس لفظ کا استعمال قرآن میں کہیں نہیں ہوا، احادیث میں بکثرت اس کا استعمال ہوا ہے۔

(۱)......مرقات المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح لملاعلی قاری ص۳۰۲ ج ۳، مکتبہ امدادیہ ملتان۔
(۲)......لسان العرب لابن منظور الافریقی ص۲۱۱ ج۱۹، المطبعۃ المنیریۃ بولاق مصر ۱۳۰۳ھ
(۳)......منتہی الارب ص۱۰۸۰، ج۳۔

اُمم سابقہ اور قربانی

قربانی ان اسلامی شعائر میں سے ہے جن کا سلسلہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے رہا ہے اور اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام تک تقریباً ہر ملت و مذہب اس پر عمل پیرا رہا ہے، اس کی تصریح خود قرآنِ کریم نے کردی ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہابیل وقابیل کا مشہور واقعہ ذکر کر کے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اس کی مشروعیت کی طرف اشارہ کردیا اور ہر ملت کے عمل پیرا رہنے کی تصریح سورۂ حج میں کردی، چنانچہ ارشاد ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (۱)

"اور ہر اُمت کے واسطے ہم نے مقرر کردی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ تعالیٰ کے نام ذبح پر چوپائیوں کے جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے دیئے۔"

عام مفسرین کی تصریح کے مطابق اس جگہ پر "منسک" سے قربانی مراد ہے، چنانچہ امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يخبر تعالىٰ انه لم يزل ذبح المناسک واراقة الدماء علىٰ اسم الله مشروعاً في جميع الملل. (۲)

"(اس آیت میں) اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی کرنا اور خون بہانا تمام ملتوں میں مشروع رہا ہے۔"

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

لما ذكر تعالىٰ الذبائح بيّن انه لم يخل منها امة. (۳)

"اللہ تعالیٰ نے جب (حج میں) قربانی کا ذکر کیا تو یہ بھی بیان کردیا کہ کوئی

---

(۱)......سورۃ الحج، آیت: ۳۴۔ (۲)......تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۱ ج ۳، دار احیاء الکتب العربیۃ۔

(۳)......الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ص ۵۸ ج ۱۲، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ القاہرہ ۱۳۶۱ھ

اُمت اس سے محروم نہ رہی۔"

سید مرتضیٰ زبیدی لفظ "نسک" کے متعدد معنی بیان کرنے کے بعد امام زجاجؒ سے اس آیت کی تفسیر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقال الزجاج فی تفسیر قوله تعالیٰ جَعَلْنَا مَنْسَكًا النسک فی هٰذاالموضع یدل علٰی معنی النحر کانه قال جعلنا لکل اُمّة ان تتقرب بان تذبح الذبائح لله.(۱)

"امام زجاج اللہ تعالیٰ کے قول جعلنا منسکا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس مقام میں لفظ "نسک" قربانی پر دلالت کررہا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ہر اُمت کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جانور ذبح کرکے اس کا تقرّب حاصل کرے۔"

یہ تو قرآنِ کریم کی تصریح تھی، بعینہٖ یہی بات فرید وجدی ایک غیر مسلم سے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں

قال المسیوار یفیل ان اهداء الماء کولات الی الألهة عام فی کل الادیان وهی رکن من اکبرار کانها.(۲)

"موسیوار یفیل کہتا ہے کہ معبودوں کے لئے ماکولات کے ہدیہ دینے کا سلسلہ تمام ادیان میں رائج رہا اور ہر دین کا ایک اہم رُکن سمجھا جاتا رہا۔"

اس کے علاوہ موجودہ بائبل میں تحریف شدہ ہونے کے باوجود جس کثرت سے قربانی کا تذکرہ ملتا ہے اس سے اس کی اہمیّت کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں نمونے کے طور پر چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

۱) بائبل میں حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں ہابیل وقابیل کی قربانی کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے:

---

(۱)......تاج العروس ص ۱۸۷ ج ۷　　(۲)......دائرۃ معارف القرآن ص ۳۷ ج ۷۔

''چند روز بعد یوں ہوا کہ قائن (قابیل) اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا، اور ہابیل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابیل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا، پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا، اس لئے قائن نہایت غضبناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا۔(۱)

۲) محمد فرید وجدی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں قربانی کی مشروعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبنی نوح مذبحًا قرب فیه الی اللّٰه تعالیٰ حیوانات کثیرة ثم کان یحرقها علی المذبح.(۲)

''حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مذبح بنایا تھا، اس میں بہت سارے حیوانات کو اللہ تعالیٰ کے نام پیش کرتے پھر اُن کو جلا دیتے تھے۔''

۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں قربانی کا ذکر کرتے ہوئے فرید وجدی اسرائیلیوں سے نقل کرتے ہیں:

وروی الاسرائیلیون ان ابراهیم کان یتقرب الی اللّٰه بالخبز والخمر ولما امره اللّٰه تعالیٰ ان یذبح ذبح له عجلة وعنزا وکبشا وحمامة ویمامة وامره ایضاً ان یفتدیٔ ابنه اسماعیل او اسحٰق بکبش.(۳)

''اسرائیلی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نام پر روٹی اور شراب کی قربانی کرتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر ایک بچھڑا، ایک بھیڑ، ایک دُنبہ، ایک کبوتر اور ایک فاختہ ذبح کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا حکم دیا

(۱)...... کتاب پیدائش باب ۴ آیت ۳، ۴، ۵، پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور ۱۹۶۲ء
(۲)...... دائرۃ معارف القرآن ۳۶ ج ۷۔ (۳)...... حوالہ بالا۔

کہ اپنے بیٹے اسمٰعیل یا اسحٰق کے بدلہ میں ایک دُنبہ کا فدیہ دیں۔"

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اسمٰعیل علیہ السلام کا واقعہ پیش آنے سے پہلے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام قربانی کیا کرتے تھے، اس کی تائید موجودہ بائبل (۱) کی متعدد روایات سے ہوتی ہے، جن میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس جگہ قیام فرمایا وہاں ضرور قربان گاہ بنائی۔

۴) بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کی قربانی دینے کا واقعہ اس طرح ملتا ہے:

"وہاں ابراہام (ابراہیم) نے قربان گاہ بنائی اور اُس پر لکڑیاں چُنیں اور اپنے بیٹے اضحاق (اسحاق ۲) کو باندھا اور اُسے قربان گاہ پر لکڑیوں پر رکھا۔ (۳)

۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قربانی کو کیا اہمیت حاصل رہی اور اس پر اُمت موسویہ کا کیا عمل رہا؟ اس کا اندازہ بائبل کی کتاب خروج اور احبار کے مطالعہ سے ہوتا ہے ان دونوں کتابوں میں قربانی کا تذکرہ جس کثرت سے ملتا ہے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید شریعت موسویہ میں کسی اور عبادت کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو قربانی کو حاصل ہے شاید یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں مقیم یہودیوں کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو وہ یوں کہتے:

(۱)......اس کے لئے سفر پیدائش کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں باب ۱۲ آیت ۷ اور آیت ۸ باب ۱۳، آیت ۱۳، اس کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے تذکرہ میں مندرجہ ذیل آیات میں قربانی کرنے اور قربان گاہ بنانے کا تذکرہ ملتا ہے، باب ۳۱ آیت ۵۴، باب ۳۵ آیت ۱ و ۷، باب ۴۶ آیت ۱۔

(۲)......اسرائیلیوں کا کہنا یہ ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں، بعض علماء اسلام بھی اسی کے قائل رہے ہیں، لیکن جمہور اہل اسلام کی رائے یہی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام، اور یہی بات قرین تحقیق بھی ہے، ان مقامات پر بائبل کی عبارتوں میں تحریف کے متعدد شواہد موجود ہیں۔

(۳)......سفر پیدائش، باب ۲۲ آیت ۹۔

اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَا اَنْ لَا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ. (۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ کہہ رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لاوے جس کو آگ کھا جائے۔''

یعنی ہمارے ایمان لانے کا مدار اس معجزہ کے ظہور پر ہے، گو یہ بات ان کی فی نفسہ سفید جھوٹ تھی اور قرآن نے اس کی تردید بھی کردی، تاہم اس سے اس عبادت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، بہرکیف! ہم یہاں مثال کے طور پر خروج کی دو آیتیں پیش کرتے ہیں:

''اور تو ہر روز سدا ایک ایک برس کے دو بکرے قربان گاہ پر چڑھایا کرنا''(۲)

''ایسی ہی سوختنی قربانی تمہاری پشت در پشت خیمۂ اجتماع کے دروازے پر خداوند کے آگے ہمیشہ ہوا کرے، وہاں میں تم سے ملوں گا اور تجھ سے باتیں کروں گا۔'' (۳)

ان دونوں آیتوں میں ''ہمیشہ قربانی کرنے'' کی تلقین کی گئی ہے یہی نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص خطا یا جُرم کا مرتکب ہوا تو اس کو اس جُرم کی تلافی کرنے کے لئے قربانی کا حکم ہے، چنانچہ کتاب احبار میں ہے:

''اور جُرم کی قربانی کے بارے میں شرع یہ ہے کہ وہ نہایت مقدس ہے''۔ (۴)

''اور بنی اسرائیل سے کہہ کہ تم خطا کی قربانی کے لئے ایک بکرا اور سوختنی قربانی کے لئے ایک بچھڑا اور ایک برّہ جو یک سالہ اور بے عیب ہو''۔ (۵)

(۱)......سورۂ آلِ عمران آیت ۱۸۳

(۲)......خروج، باب ۲۹ آیت ۳۸

(۳)......خروج، باب ۲۹ آیت ۴۲۔

(۴)......احبار، باب ۷ آیت ۱

(۵)......احبار باب ۹ آیت ۳

آسمانی شریعتوں کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی قربانی کو عبادت قرار دیا گیا ہے، البتہ اس کی صورتیں عموماً بگڑ گئی ہیں، یہاں تک کہ بعض اقوام میں انسانوں کی قربانی کا دستور بھی رہا ہے، فرید وجدی صاحب لکھتے ہیں:

وقد بالغ كثير من الامم في امر القربان فاخذوا يقربون الذبائح البشرية كالفرس والرومانيين والمصريين والفنيقيين والكنعانيين وغيرهم وما زالت هذه العادة في اوروبا الى القرن السابع للميلاد حيث صدر امر من مجلس الشيوخ الروماني بابطالها۔ (۱)

''امم سابقہ کی ایک بڑی تعداد نے قربانی کے معاملہ میں بہت مبالغہ سے کام لیا، حتیٰ کہ وہ انسانی ذبیحوں کی قربانی بھی دینے لگیں، جیسا کہ اہل فارس، اہلِ روما، اہلِ مصر، فینقیوں اور کنعانیوں وغیرہم کا یہی طریقہ رہا ہے، اور یہ سلسلہ یورپ میں ساتویں صدی عیسوی تک جاری رہا یہاں تک کہ روحانی شیوخ کی کمیٹی کی طرف سے اس کے ابطال کا حکم صادر کرنا پڑا۔''

ائمۂ اربعہ کے مذاہب میں قربانی کی حیثیت

اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام میں بھی قربانی کو ایک جلیل القدر عبادت قرار دیا گیا ہے، اس کا وجوب قرآن وسنت کے جن دلائل سے ہوا ہے ان کی تفصیل آگے آرہی ہے، پہلے اس سلسلہ میں مسلمانوں کے بڑے بڑے فقہی مکاتب فکر کی آراء سُن لیجئے کہ اُن کے نزدیک یہ عبادت کس درجہ کی ہے؟

قربانی کی مشروعیت پر تو پوری اُمت کا اتفاق رہا ہے البتہ اس کے واجب یا سنت

(۱)...... دائرۃ المعارف ص۷۳۶، ج۷

ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہوا ہے، ہم ذیل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کو اُن کی معتبر کتابوں سے نقل کرتے ہیں:۔

حنفیہ کا مذہب

قدوری میں ہے:

الاضحية واجبة علٰى كلّ حر مسلم مقيم موسر فى يوم الاضحىٰ عن نفسه وعن ولده الصغار.

''قربانی واجب ہے ہر مسلمان، حُر، مقیم، مال دار پر قربانی کے دن اپنی طرف سے بھی دے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی۔''

اس کے تحت صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

امّا الوجوب فقول ابی حنیفةؒ ومحمدؒ وزفرؒ والحسنؒ واحد الروايتين عن ابى يوسفؒ رحمهم الله وعنه انها سنة ذكره فى الجوامع وهو قول الشافعى وذكر الطحاوى ان علٰى قول ابى حنيفة واجبة و علٰى قول ابى يوسف ومحمد سنة مؤكدة وهٰكذا ذكر بعض المشائخ الاختلاف. (۱)

''وجوب کا قول امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، زفرؒ، اور حسنؒ کا ہے اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت بھی یہی ہے، اُن کی دوسری روایت سنت ہونے کی ہے، جس کو جوامع میں ذکر کیا گیا ہے اور امام شافعیؒ کا قول بھی یہی ہے، لیکن امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ کے نزدیک سنت مؤکدہ۔''

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے بارے میں اگرچہ مختلف روایتیں ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ

(۱)...... ہدایہ، ص۴۴۳ ج۴ قرآن محل، کراچی

سے صرف وجوب ہی کی روایت ہے، اسی کو اکثر فقہاء احناف نے اختیار کیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، اس لئے کہ قرآن وحدیث کی رُو سے بھی اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

شافعیہ کا مذہب

امام شافعیؒ کتاب الأم میں فرماتے ہیں:

الضّحایا سنّة لا احبّ ترکها(۱)

''قربانی سنت ہے اس کے چھوڑنے کو میں پسند نہیں کرتا۔''

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:

وهی عند الشافعیة والجمهور سنّة مؤکدة علی الکفایة وفی وجه للشافعیة من فروض الکفایة وعن ابی حنیفة تجب علی المقیم الموسر وعن مالک مثلهٗ فی روایة لکن لم یقید المقیم ونقل عن الاوزاعی وربیعة واللیث مثله. وقال احمد یکره ترکها مع القدرة وعنه واجبة.(۲)

''قربانی امام شافعیؒ اور جمہور کے نزدیک سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، شافعیہ کی ایک روایت فرض کفایہ ہونے کی ہے، امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ مقیم اور مال دار پر واجب ہے، یہی ایک روایت ہے امام مالکؒ کی، البتہ انہوں نے مقیم کے ساتھ مقید نہیں کی اور امام اوزاعی، ربیعہ اور لیث سے بھی اسی طرح (وجوب) منقول ہے اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قدرت ہوتے ہوئے چھوڑنا مکروہ ہے اور ان سے ایک روایت وجوب کی بھی ہے۔''

مالکیہ کا مذہب

المدونۃ الکبریٰ میں ہے:

---

(۱)...... کتاب الأم للامام الشافعی، ص ۲۲۱ ج ۲ مکتبۃ الکلیات الازہریۃ

(۲)...... فتح الباری لابن حجر العسقلانی، ص ۲ ج ۱۰ المطبعۃ البہیۃ المصریۃ ۱۳۴۸ھ

قال مالک لا احبّ لمن کان یقدر ان یضحی ان یترک ذٰلک.(۱)

''امام مالکؒ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی قربانی کی قدرت رکھتے ہوئے اسے چھوڑ دے، (یعنی قربانی نہ کرے)''

ابنِ رشد مالکیؒ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء فی الاضحیة هل هی واجبة ام هی سنة؟ فذهب مالکؒ والشافعیؒ الٰی انها من السنن المؤکدة ورخص مالک للحاج فی ترکها بمنی ولم یفرق الشافعی فی ذٰلک بین الحاج وغیره.(۲)

''قربانی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ واجب ہے یا سنت، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سنن مؤکدہ میں سے ہے، البتہ امام مالکؒ نے حاجیوں کے لئے منیٰ میں نہ کرنے کی بھی اجازت دی ہے اور امام شافعیؒ نے اس میں حاجی اور غیر حاجی کا کوئی فرق نہیں کیا۔''

امام مالکؒ قربانی کے سنت ہونے میں تو جمہور کے ساتھ ہیں البتہ آگے جمہور سے ایک مسئلہ میں اختلاف کیا ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک ایک بکری صرف ایک شخص کی طرف سے ہو سکتی ہے، اور امام مالکؒ کے نزدیک سب گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کافی ہوتی ہے، البتہ ہر ایک کی طرف سے ایک ایک بکری اولیٰ ہے۔

قال مالک ولٰکن ان کان یقدر فاحب الٰی ان یذبح عن کل نفس شاة وان ذبح شاة واحدة عن جمیعهم اجزاه.(۳)

(۱)...... المدونة الکبریٰ للفقہ المالکی بروایت سحنون بن سعید عن عبد الرحمٰن بن قاسم عن الامام مالک ص ۷۰ ج ۳

(۲)...... بدایة المجتہد لابن رشد القرطبی المالکی ص ۴۲۹ ج ا مطبعة مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر ۱۹۷۹ھ۔

(۳)...... المدونة الکبریٰ للفقہ المالکی بروایة سحنون بن سعید عن عبد الرحمٰن بن قاسم عن الامام مالک، ص ۷۰ ج ۳۔

''امام مالکؒ نے فرمایا کہ اگر قدرت ہو تو بہتر یہ ہے کہ ہر نفس کی جانب سے ایک ایک بکری ہو اور اگر سب کی طرف سے ایک ہی بکری ذبح کی تو یہ بھی کافی ہے۔''

حنابلہ کا مسلک

ابنِ قدامہؒ لکھتے ہیں:

اکثر اهل العلم یرون الاضحیة سُنة مؤکدة غیر واجبة وقال ربیعة ومالک والثوری والاوزاعی واللیث وابو حنیفة هی واجبة.(۱)

''اکثر اہل علم کے نزدیک قربانی سنت مؤکدہ ہے، واجب نہیں ہے، اور امام ربیعہؒ، مالکؒ، ثوریؒ، اوزاعی، لیثؒ، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ واجب ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

والاضحیة افضل من الصدقة بقیمتها نص علیه احمد وبهذا قال ربیعة وابو الزناد.(۲)

''قربانی کا پیسہ صدقہ کرنے سے قربانی کرنا افضل ہے جیسا کہ امام احمد نے تصریح کی ہے، اور یہی قول ہے ربیعہ اور ابوالزناد کا۔''

قرآنِ حکیم اور قربانی

عہدِ رسالت ﷺ سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک قربانی کی مشروعیت اور اس کے ایک مستقل عبادت ہونے پر پوری اُمت کا اجماع رہا ہے، نیز اس پر بھی اتفاق رہا ہے

(۱)...... المغنی لابن قدامۃ الحنبلی ص ۶۱۷ ج ۸ دارالمنار مصر ۱۳۶۷ھ
(۲)...... ایضاً ص ۶۱۸

کہ اس کی مشروعیت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اس پر بغیر کسی نکیر اور کسی اختلاف کے پوری اُمت کا عمل رہا ہے، لیکن چودھویں صدی کے بعد اسلام کی بیخ کنی کے لئے جو فتنے پیدا ہوئے انہوں نے اسلام کے بہت سے ایسے اجماعی مسلّمات کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے جو ابتدائے اسلام سے متفق علیہ چلے آرہے تھے، اُنہی میں سے ایک قربانی کا مسئلہ بھی ہے، چنانچہ ہمارے زمانے میں منکرینِ حجیتِ حدیث کے سرگروہ پرویز صاحب نے اسلام کی اس عبادت کو غیر ضروری، مُضر بلکہ اضاعتِ مال قرار دینے کے لئے پروپیگنڈے کا ایک دفتر کھول رکھا ہے، اس لئے یہاں ہمارا مقصد قربانی کے بارے میں قرآنی آیات کی صحیح تفسیر اور صحیح مطلب بیان کرنا اور ان تاریخی حقائق کو اجاگر کرنا ہے جنہیں نظر انداز کر کے پرویز صاحب نے لوگوں کو غلط تأثر دینے کی کوشش کی ہے، جو حضرات حقائق کے طالب ہیں اور مسئلہ کی حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں، ہماری اُن سے گزارش ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور پرویز صاحب کی بات کے وزن کو دیکھیں انشاء اللہ حقیقت کُھل کر سامنے آجائے گی۔

قربانی کے سلسلے میں اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> ''قرآن میں جانور ذبح کرنے کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے۔ (۱) سارے قرآن میں ایک جگہ بھی نہیں لکھا کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جائے گی (۲) واضح رہے کہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ قربانی کا مقام بیت العتیق (کعبہ) ہے اور اس کے سوا کہیں نہیں، یہ جو ہم ہر قریہ اور ہر بستی میں عید کے موقع پر جانور ذبح کرتے ہیں اس کے لئے خدا تعالیٰ نے کہیں حکم نہیں دیا۔ (۳)

ان سب کا خلاصہ دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ قرآن میں جانور ذبح کرنے کا ذکر صرف حج کے ضمن میں آیا ہے، دوسری یہ کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ قربانی کرنے کا حکم قرآن میں

(۱)...... قرآنی فیصلے صفحہ ۵۵۔　(۲)...... ایضاً ص ۴۳۔　(۳)...... ایضاً ص ۷۶

نہیں ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں، پہلی بات تو اس لئے غلط ہے کہ قرآنِ حکیم میں کئی آیتیں ایسی ہیں جن میں جانور ذبح کرنے کا ذکر تو ہے لیکن حج کا کوئی ذکر نہیں مثلاً:

۱)......سورۂ مائدہ میں ہابیل وقابیل کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ.

"اور سنا اُن کو حال واقعی آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا، جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز تو مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی۔"

۲)......سورۂ انعام میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط

"تو کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔"

۳)......سورۂ کوثر میں ارشاد ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ط

"پس نماز پڑھ اپنے رب کے واسطے اور قربانی کر"۔

مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں کہیں قربانی کرنے کا واقعہ مذکور ہے، اور کہیں قربانی کا حکم، لیکن یہ حج کے ضمن میں تو کیا ہوتے اُن کے آس پاس بھی کہیں حج کا ذکر نہیں، پھر۔

۴)......خود سورۂ صافات میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا جو واقعہ مذکور ہے جس میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلے میں جانور ذبح کرنے کا ذکر ہے اس سے تو بات اور صاف ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہ واقعہ بناء کعبہ اور فرضیتِ حج کے اعلان سے پہلے کا ہے، اس لئے اس کا حج کے ضمن میں ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اتنی

ساری آیتوں کے ہوتے ہوئے پھر یہ کہنا کہ جانور ذبح کرنے کا ذکر صرف حج کے ضمن میں آیا ہے کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

حج کے موقع کے علاوہ قربانی کا حکم قرآن میں

اب دوسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن میں مکّہ کے علاوہ کہیں اور قربانی کرنے کا حکم نہیں، سو یہ بات بھی باطل اور مردود ہے قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیتوں سے مکّہ کے علاوہ بھی مطلق قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے، مثلاً:

سورۂ انعام کی مذکورہ بالا آیت:

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

''تو کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے۔''

یہاں لفظ ''نسک'' عام ہے اس میں نہ مکہ کا ذکر ہے اور نہ حج کا، اگرچہ اس لفظ کے متعدد معنی آتے ہیں، لیکن محققین کے قول کے مطابق یہاں ذبیحہ ہی مراد ہے، چنانچہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ اور ضحاکؒ وغیرہ سے یہاں ''نسک'' کے یہی معنی نقل کئے ہیں۔ (۱)

دوسری طرف امام رازیؒ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت ''نسک'' کے متعدد معانی نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

الا انّ الغالب علیه فی العرف الذبح. (۲)

''یعنی لفظ ''نسک'' عرف میں عموماً ذبح کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔''

---

(۱)..... تفسیر ابن جریر ص ۶۷ ج ۸، المطبعة المیمنیة بمصر۔

(۲)..... تفسیر کبیر للامام الرازی ص ۶۷ اج ۴، المطبعة العامرة الشرفیة۔

بعینہ یہی بات امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن جلد ۳ صفحہ ۳۰۵ میں بھی لکھی ہے جس سے یہاں ''نسک'' کے معنی قربانی کے متعین ہو جاتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ عربی لغت کے قاعدے کے مطابق جب کوئی لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو خواہ لغت میں اس لفظ کے متعدد معانی ہوں، لیکن ان میں سے صرف وہی معنی مراد لئے جاتے ہیں جو کثیر الاستعمال اور متبادر الی الذہن ہوں، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو یہاں بھی لفظ ''نسک'' مطلق ہے اور اس کے معنی متبادر الی الذہن قربانی کرنا ہے اور یہ معنی مراد لینے میں کوئی رُکاوٹ اور اس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے، اس لئے یہاں بھی یہی معنی مراد ہوں گے، اگر ہم حدیث کو تاریخی حیثیت سے بھی دیکھیں گے تو اس سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، اس لئے کہ حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت یہ آیت پڑھی ہے، ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا تعلق قربانی سے نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے کیوں پڑھا؟ اور حضرت فاطمہؓ کو پڑھنے کا حکم کیوں دیا؟

بہر کیف! اس بحث سے مطلق قربانی کی مشروعیت اس آیت سے ثابت ہو ہی جاتی ہے، بلکہ امام ابوبکر جصاصؒ نے تو اس آیت سے قربانی کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے، چنانچہ وہ احکام القرآن میں اس آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> واما قرن النسک الی الصلٰوۃ دل علٰی ان المراد صلٰوۃ العید والا ضحیۃ وھذا یدل علی وجوب الاضحیۃ لقولہ تعالٰی (وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ) والا مر یقتضی الوجوب.(۱)
>
> ''یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ''نسک'' کو ''صلٰوۃ'' کے ساتھ ملا کر بیان کیا تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں صلٰوۃ عید اور قربانی مراد ہے اور اس سے قربانی کا وجوب بھی ثابت ہوا، کیونکہ آگے (وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ)

(۱)......احکام القرآن صفحہ ۳۴ جلد ۳

موجود ہے اور امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔“

اگر یہاں صلوٰۃ سے صلاۃِ عید مراد نہ ہو بلکہ مطلق صلوٰۃ مراد ہو تب بھی استدلال درست ہے، اس لئے کہ اس صورت میں مطلقِ صلوٰۃ اور مطلقِ قربانی مراد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے مطلقِ صلوٰۃ اور مطلق قربانی کا حکم دیا گیا کہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کے واسطے ادا کروں، دونوں صورتوں میں استدلال کا مدار اس پر ہے کہ بِذٰلِکَ کا مشار الیہ نسک اور صلوٰۃ ہے، بعض حضرات نے اس کا مشار الیہ رَبِّ الْعٰلَمِیْن کے مفہوم یعنی اخلاص کو قرار دیا ہے، احتمال دونوں کا موجود ہے، اس لئے قرائن سے کسی ایک احتمال کو ترجیح دے کر اس کے وجوب پر استدلال کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

۲)......سورۂ حج میں ارشاد ہے:

لِکُلِ (۱) اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا ھُمْ نَاسِکُوْہُ فَلَا یُنَازِ عُنَّکَ فِی الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ اِنَّکَ لَعَلٰی ھُدًی مُّسْتَقِیْم (۲)

”ہم نے ہر اُمّت کے واسطے ذبح کرنے کا طریقہ مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریقہ پر ذبح کرتے تھے، تو لوگوں کو چاہئے کہ اس امر میں آپ سے جھگڑا نہ کریں آپ اپنے رب کی طرف بلاتے رہئے، آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں“

(۱)......اس کی ایک مشابہ آیت پہلے گذری ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں: ولکلّ اُمّۃ جعلنا منسکًا لیذکروا اسم اللّٰہ علٰی مارزقھم من بھیمۃ الانعام الخ اور دونوں آیتیں سورۂ حج کی ہیں بعض حضرات مفسرین نے دونوں آیتوں سے ایک ہی مفہوم مراد لیا ہے اور بعض حضرات نے دونوں میں فرق کیا ہے، اگر ہم دونوں آیتوں کا مقصد جدا تسلیم کرلیں پھر بھی اس آیت میں آگے جو الفاظ ہیں، یعنی لیذکروا اسم اللّٰہ علٰی ما رزقھم من بھیمۃ الا نعام، ان الفاظ سے اس آیت کا مصداق قربانی ہی قرار پاتی ہے اس لئے اس آیت سے مطلق قربانی کی مشروعیت پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے وہ اس طرح کہ اس آیت کی تصریح کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اُمّت محمدیہ علٰی صاحبہا السلام تک ہر اُمّت کے لئے قربانی کا حکم تھا اور حج کی فرضیت عامہ قرآن کے اعلان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہوئی، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلی اُمّتوں میں قربانی کا حکم حج کے ضمن میں نہ تھا، بلکہ عام حکم تھا، لہٰذا پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن میں اس کا ذکر صرف حج کے ضمن میں آیا ہے، اس آیت سے بھی مردود قرار پاتا ہے۔

(۲)......سورۂ الحج، آیت ۶۷

امام ابوبکر جصاصؒ نے اس آیت سے بھی وجوبِ قربانی پر استدلال کیا ہے چنانچہ وہ اس آیت کے تحت لفظ نسک کے متعدد معانی نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

الا انّ الا ظهر الا غلب فی العادة عند الاطلاق الذبح علٰی وجه القربة قال اللّٰه تعالٰی (فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ) وليس يمتنع ان يكون المراد جميع العبادات ويكون الذبح احدما اريد بالآية فيوجب ذٰلك ان يكونوا مامورين بالذبح لقوله تعالٰی (فلاينازعنّك فی الأمر) واذا كنّامامورين بالذّبح ساغ الاحتجاج به فی ايجاب الاضحية لوقوعها عامة فی الموسرين كالزكٰوة.(۱)

''لفظ نسک جب مطلق بولا جاتا ہے تو عادۃً اظہر اور اغلب یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے ذبح کرنا مراد ہوتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے (ففدية من صيام او صدقة او نسک) یہاں نسک سے باتفاق ذبح مراد ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے تمام عبادات مراد ہوں، اس صورت میں ذبح بھی آیت کا ایک مصداق ہوگا، جس سے اُمت کا مامور بالذبح ہونا ثابت ہو جائے گا اس لئے کہ آگے ارشاد ہے (فلا ينازعنک فی الامر جس میں مخالفت سے منع کیا گیا ہے) جب ہم مامور بالذبح ہو گئے تو اس سے وجوب اضحیہ پر استدلال کی بھی گنجائش ہو گئی، کیونکہ یہ عام طور پر مالکِ نصاب پر واجب ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ۔

۳).....سورۂ کوثر میں ارشاد ہے:

(۱).....احکام القرآن ص ۳۰۵ ج ۳

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ط

''پس نماز پڑھ اپنے رب کے واسطے اور قربانی کر''۔

اس آیت میں نحر سے کیا مراد ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں لیکن اکثر مفسرین اور محققین کے نزدیک اس سے یہاں قربانی مراد ہے، چنانچہ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

وفی قوله وانحر قولا ن الاوّل وهو قول عامة المفسرين ان المراد هو نحر البدن.(۱)

''وانحر میں دو قول ہیں، پہلا قول جسے عام مفسرین نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ مراد اس سے قربانی ہے''۔

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

ويحتج له (اى لمن يوجب الا ضحية) بقوله تعالىٰ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ط وقد روى انه اراد صلوٰة العيد وبالنحر الا ضحية.(۲)

''جو حضرات قربانی کو واجب کہتے ہیں ان کی ایک دلیل ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ'' ہے، جیسا کہ مروی ہے کہ صَلِّ سے صلاۃ عید اور انحر سے قربانی مراد ہے۔''

امام ابن کثیرؒ اس آیت کے تحت لفظ نحر کے مختلف معانی نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والصحيح القول الاوّل ان المراد بالنحر ذبح المناسک ولهذا كان رسول الله ﷺ يصلى العيد ثم ينحر نسکه.(۳)

---

(۱)...... تفسیر کبیر ص ۵۰۲ ج ۸

(۲)...... احکام القرآن ص ۳۰۶ ج ۳ (۳)...... تفسیر ابن کثیر ص ۵۵۹ ج ۴

''یعنی پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ نحر سے مراد قربانی کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پہلے عید کی نماز پڑھتے پھر قربانی کرتے۔''

علامہ ابن قدامہؒ المغنی میں لکھتے ہیں:

الا صل فی مشروعية الا ضحية الكتاب والسنة والاجماع اماالكتاب فقول الله سبحانهٗ فصل لربک وانحر قال بعض اهل التفسير المرادبه الا ضحية بعد صلوٰة العيد. (۱)

''قربانی کی مشروعیت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع اُمت سے ہے، کتاب اللہ میں اس کی دلیل ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ'' ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت سے مراد صلوٰۃ عید کے بعد قربانی ہے۔''

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بصریؒ، عکرمہؒ، حکمؒ، عطارؒ، قتادہؒ، اور سعید بن جبیرؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے، کہ اس آیت میں نحر سے قربانی مراد ہے۔ (۲)

جمہور کی مذکورہ بالا تصریحات اور آیت کے ظاہر سے قربانی کا ثبوت بالکل واضح اور صریح ہے، لیکن جب پرویز صاحب کا نظریہ اس سے جوڑ نہیں کھاتا تو جمہور صحابہ وتابعین لاکھ کسی بات پر متفق ہوں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، چنانچہ یہاں بھی اُنہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس غیر مشتبہ استدلال کو رکیک اعتراضات کے ذریعہ مشکوک بنانے کی ناکام سعی کی، اور اس میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اس لئے ہم یہاں اُن اعتراضات کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں، پہلے وہ سورۂ کوثر کے وقتِ نزول پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱)...... المغنی لابن قدامہ ص ۶۱۷ ج ۸ دار المنار لاصحابہا ۱۳۶۷ھ۔
(۲)...... تفسیر ابن جریر ص ۱۸۴ و ۱۸۳ ج ۳۰۔

عام روایات کے مطابق سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اس وقت نہ عید اور بقر عید کی نماز تھی (حتیٰ کہ جمعہ کی نماز بھی نہیں) اور نہ ہی قربانی کا کوئی سوال تھا۔"(۱)

اس سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف رہا ہے. جمہور کے نزدیک یہ مکی ہے اور قتادہؒ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، اور حسن بصریؒ کے نزدیک مدنی ہے (تفسیر حقانی) ان دونوں اقوال میں سے جس قول کو بھی اختیار کیا جائے بہرصورت قربانی کی مشروعیت اس سورۃ سے ثابت ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ہم اس کو مدنی مان لیں جیسا کہ حسن بصریؒ وغیرہ کا قول ہے تو اس صورت میں تو اس اعتراض کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، بلکہ اس قول کی بناء پر صَلِّ سے عید کی نماز اور انْحَرْ سے قربانی مراد لینے کی نہ صرف یہ کہ پوری گنجائش موجود ہے بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے اس کی یہ تفسیر تقریباً متعین ہو جاتی ہے، ابن جریر نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

عن انس بن مالک قال کان النبی ﷺ ینحر قبل ان یصلّی فامر ان یصلی ثم ینحر.(۲)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نماز سے پہلے جانور ذبح کرتے تھے، پھر آپ کو حکم ہوا کہ پہلے نماز پڑھیں پھر ذبح کریں۔"

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ سورۃ پوری تو مدنی نہیں ہے، البتہ

"فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر"

والی آیت مدنی ہے جیسا کہ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی مدظلہ نے "سیرۃ المصطفٰی ﷺ" میں دوسری ہجری نبوی ﷺ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور اُسی سال بقر عید کی نماز اور قربانی کا حکم ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی،

---

(۱)......قرآنی فیصلے ص ۵۷۔

(۲)......ابن جریر ص ۸۴،۱۸۳ ج ۳۰

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر .(۱)

اس تاریخی روایت اور حضرت انس ﷺ کے مذکورہ اثر سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر '' سے صلوٰۃ عید اور قربانی کی مشروعیت کو بیان کرنا مقصود ہے اسی لئے امام ابوبکر جصاصؒ نے اس آیت سے قربانی کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور ان کا یہ استدلال مذکورہ بالا دونوں روایتوں کی رُو سے بالکل درست اور بجا ہے۔

اور اگر جمہور کے قول کے مطابق اس سورہ کو ہم مکی تسلیم کر لیں تب بھی اس سورۃ سے قربانی کی مشروعیت پر استدلال میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ اس قول کی بناء پر آیت کا مقصد مطلق نماز اور مطلقِ قربانی کا حکم اور ان میں اخلاص کی تاکید بیان کرنا ہے، نہ صلوٰۃ عید کی مشروعیت بیان کرنا، صَلِّ سے صلوٰۃ عید وہی حضرات مراد لیتے ہیں جو اس سورۃ کو یا آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر کو مدنی کہتے ہیں اور جو حضرات اُسے مکی مانتے ہیں وہ اس کو اپنے اطلاق پر چھوڑتے ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے جیسا کہ ابوحیانؔ نے بحرؔ محیط میں نقل کیا ہے۔

الظاھر ان فصل امر بالصلوٰۃ یدخل فیھا المکتوبات والنوافل والنحر: نحر الھدی والنسک والضحایاقاله الجمھور .(۲)

ظاہر یہی ہے کہ فَصَلِّ میں مطلق نماز کا حکم ہے جس میں فرائض ونوافل سب داخل ہیں اور نحر سے مراد قربانی اور ہدی کے جانور ذبح کرنا ہے، یہی جمہور کا قول ہے، اس کی تائید محمد بن کعب قرظیؒ کے ایک اثر سے ہوتی ہے جس کی تخریجؔ ابن جریر نے کی ہے:

عن محمد بن کعب القرظی انه کان یقول فی ھٰذہ الأیة اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرُ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرُ .یقول ان ناسًا

(۱)......سیرۃ المصطفیٰ ﷺ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۳۹۵ ج ۱، مطبع انشاء پریس لاہور ۱۳۷۵ھ
(۲)......البحر المحیط لابی حیان الاندلسی ص ۵۲۰ ج ۸

كانوا يصلون لغير الله وينحرون لغير الله فاذا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرْ يا محمد ﷺ فلا تكن صلوٰتك ونحرك اِلَّا لِي .(۱)

''محمد بن کعب قرظیؒ اس آیت اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرْ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے متعلق فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ غیر اللہ کے لئے نماز پڑھتے تھے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) اے محمد! جب ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے تو آپ کی نماز اور قربانی صرف میرے لئے ہونی چاہئے۔''

جمہور کے اس قول کو ابن جریر نے بھی ترجیح دی ہے اور انہوں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔(۲)

بہر حال چاہے ہم اس سورت کو مکی کہیں یا مدنی، دونوں صورتوں میں قربانی کی مشروعیت اس سے بالکل واضح ہے، رہی یہ بات کہ جمہور کے قول کے مطابق جب قربانی کی مشروعیت مکہ میں ہوئی تو آپ ﷺ نے مکہ میں قربانی کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کا حکم مکہ میں نازل ہوا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس پر عمل بھی مکہ میں ہو، اس لئے کہ بعض دفعہ کوئی حکم تو نازل ہوتا ہے، لیکن اس کی تفصیل بعد میں آتی ہے، اس کی مثال زکوٰۃ ہے، کہ محققین کے قول کے مطابق اس کا حکم مکہ میں نازل ہوا، لیکن اس کے تفصیلی احکام مدینے میں نازل ہوئے ممکن ہے کہ قربانی میں بھی یہی طریقہ رہا ہو۔

سورۂ کوثر کے شانِ نزول پر لمبی چوڑی تقریر کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ جانا تھا وہاں یہود کا بڑا زور تھا، دنیاوی ڈپلومیسی پر نگاہ رکھنے والوں کو خیال آ سکتا تھا کہ قریشِ مکہ سے انتقام کی خاطر یہود مدینہ سے سمجھوتہ کیا جائے گا، قرآن نے اس کی نفی ایک لفظ میں فرما دی، یہود کے ہاں اونٹ حرام تھا، اُن کے ساتھ سمجھوتہ کی صورت میں

(۱)...... تفسیر ابن جریر ص۱۸۴ ج ۳۔
(۲)...... ایضاً ص۱۸۵ ج ۳۔

اُن کے جذبات کا احترام ضروری تھا، لیکن قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ان سے دَب کر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا، اُن کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا، یعنی وہاں بھی غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔ (۱)

پرویز صاحب کی اس دماغی اُپج کی داد دیجئے کہ کسی آیت کی تفسیر میں جو شانِ نزول مستند روایات واحادیث سے ثابت ہو جس سے حدیث اور تفسیر کی کتابیں بھری ہوئی ہوں اور جس پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا ہو، اگر وہ اُن کے مزاج کے مطابق نہ ہو تو بیک جنبشِ قلم ''عجمی سازش'' قرار پا جاتی ہے، لیکن جب قرآنی آیات میں اپنی مرضی کی کھینچ تان کی خاطر خود اُن کا ذہن کوئی قیاس تراشتا ہے تو اسے ایسے یقین کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں جیسے یہ وحی منزل من اللہ ہے، سورۂ کوثر کا یہ پسِ منظر بھی اسی تکنیک کا شاخسانہ ہے، مندرجہ ذیل نکات سے اس کی وضاحت ہو سکے گی:

(۱)...... کتبِ تفسیر سے لے کر کتبِ تاریخ تک کسی کتاب میں بھی کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے پرویز صاحب کے اس خود ساختہ شانِ نزول کی تائید ہو سکتی ہو۔

(۲)...... کسی سے سمجھوتہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ اس کی عداوت ودشمنی کھل کر سامنے آجائے اور اس کا معاندانہ رویہ اپنے مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ ہو، اس کے برخلاف یہودیوں کی اسلام دشمنی اور سازش اب تک کھل کر سامنے کیا آتی ان سے اب تک آنحضرت ﷺ کی گفتگو بھی نہ ہوئی تھی، ایسی صورت میں سمجھوتہ کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۳)...... اگر یہ سورت اس سمجھوتہ کی شان میں نازل ہوئی تو پھر انْحَرْ کا فَصَلِّ سے کیا جوڑ ہے، کیا نماز کے متعلق بھی مسلمانوں کو یہودیوں سے خطرہ تھا۔

(۴)...... بقول پرویز صاحب جب قربانی مکہ کے علاوہ اور کسی جگہ کرنے کا حکم نہیں تو پھر مکہ

۱...... قرآنی فیصلے ص ۴۷

میں اُونٹ ذبح کرنے سے یہودیوں کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کو ان سے سمجھوتہ کے وقت ان کے جذبات کے احترام کا خیال پیدا ہو۔

آخر اس مقام پر پرویز صاحب کے قلم کی نوک سے نادانستہ طور پر حق بات نکل گئی اس لئے کہ یہودیوں کا اعتراض اور ان کے جذبات کے احترام کا سوال اس وقت پیدا ہوگا جب اُونٹ اُن کے سامنے مدینہ میں ذبح کیا جائے جس کا لازمی نتیجہ قربانی کے عموم کو تسلیم کرنا ہے۔

لفظ نحر کے متعدد معانی نقل کرنے کے بعد پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''اب ان تمام مختلف معانی میں سے اگر نحر کے معنی اُونٹ ذبح کرنا ہے لے لئے جائیں تو بھی اس سے قربانی کرنا وہ بھی ہر گلی کوچہ میں قربانی کرنا کس طرح ثابت ہوسکتا ہے (۱)؟ نحر کے معنی متعدد ہیں، اُونٹ ذبح کرنا، اس کے مرادی معنی ہیں۔'' (۲)

یہ درست ہے کہ لفظ نحر کے مختلف معانی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ سب معانی یہاں مراد نہیں ہوسکتے لامحالہ کسی ایک معنی کو ترجیح دے پڑے گا، مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر یہاں اس کے معنی قربانی کے متعین ہیں:۔

۱) جمہور اُمت نے اس معنی کو اختیار کیا، اس کی تفصیل پیچھے گذر گئی۔

۲) قرآن عرب کے محاورہ پر نازل ہوا اس محاورہ کا لحاظ ضرور رکھنا ہوگا اور اس محاورہ میں سے نحر سے قربانی مراد ہوتی ہے، چنانچہ مولانا عبدالحق حقانی تفسیر فتح المنان میں لکھتے ہیں کہ ''انحر کا لفظ عرب کے محاورہ میں قربانی کے لئے مستعمل ہے اور معنی پیدا کرنا لغت تراشی ہے۔ (۳)

---

(۱)...... قرآنی فیصلے ص ۷۳۔

(۲)...... ایضاً ص ۷۵۔

(۳)...... تفسیر حقانی لمولا عبدالحق حقانی ص ۲۵۵ پارہ عم، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند۔

۳) عربی قواعد کے اعتبار سے جب ایک لفظ کے متعدد معنی ہوں تو جب تک اس کو اس کے معنی متبادر پر حمل کیا جا سکتا ہو اس پر حمل کیا جائے گا دوسرے معنی کا اعتبار نہ ہوگا، یہاں لفظ نحر کے معنی متبادر جانور ذبح کرنا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص اس کے مختلف معانی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وتاویل من تأوله علیٰ حقیقة نحر البدن اولیٰ لانه.... حقیقة اللفظ ولانه لا یعقل باطلاق اللفظ غیره۔(۱)

”جن لوگوں نے اس کے معنی جانور ذبح کرنا بیان کئے وہ زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ وہ اس کے حقیقی معنیٰ ہیں اور اطلاق کی صورت میں وہی معنی سمجھ میں آتے ہیں۔“

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ اُونٹ ذبح کرنا صرف اس کے مرادی معنی نہیں بلکہ اس کے حقیقی معنی ہیں جب پرویز صاحب نے نحر کے معنی اُونٹ ذبح کرنا تسلیم کر لئے خواہ یہ اس کے مرادی معنی ہیں یا حقیقی معنی، پھر اُن کا یہ کہنا کہ ”تو بھی اس سے قربانی کرنا اور وہ بھی ہر گلی کوچہ میں قربانی کرنا کس طرح ثابت ہوسکتا ہے“؟ کس قدر مضحکہ خیز ہے اس لئے کہ نفس اونٹ ذبح کرنا کوئی عبادت نہیں، جب شریعت نے اُونٹ ذبح کرنے کا حکم دیا تو یہ حکم عبادت کی حیثیت سے دیا گیا اور عبادت کی حیثیت سے اُونٹ ذبح کرنا قربانی میں ہوتا ہے، نیز بقول پرویز صاحب جب قرآن میں جانور ذبح کرنے کا حکم صرف حج کے ضمن میں آیا ہے تو یہاں اُن کے قول کے مطابق بھی قربانی مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

آگے لفظ نحر پر بحث کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

”اگر وانحر سے مراد قربانی ہے تو اس حکم کے مطابق قربانی صرف اُونٹ کی دی جانی چاہئے نہ کہ بھیڑ، بکری، اور گائے بیل کی نحر کا لفظ اُونٹ ذبح کرنے کے لئے خاص ہے، اور جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے یہ لفظ

---

(۱)..... احکام القرآن ص ۳۸۵ ج ۳۔

نہیں بولا جاتا۔‘‘(۱)

یہ اعتراض وہی شخص کرسکتا ہے جو عربی قواعد اور عربی زبان کے محاورہ سے بالکل نابلد ہو، بلکہ اپنی زبان سے بھی پوری طرح باخبر نہ ہو، اس لئے کہ یہ قاعدہ ہر زبان میں مسلم ہے کہ بعض الفاظ کے لغوی معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور عرف میں اس کا استعمال کسی اور معنی میں ہوتا ہے عربی زبان میں اس کی بیسیوں مثالیں ہیں۔

مثلاً لفظ صلوٰۃ ہے اس کے معنی دعا کے ہیں لیکن عرف اور محاورہ میں اس سے نماز مراد ہوتی ہے، اسی طرح لفظ نحر کے معنی بھی اگرچہ لغوی اعتبار سے اُونٹ ذبح کرنے کے ہیں، لیکن محاورہ میں اُن سے مراد قربانی ہوتی ہے، بقول مُلّا جیوَن کے نحر کا لفظ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اونٹ اہلِ عرب کے ہاں اشرف الاموال شمار ہوتا ہے، ورنہ مراد مطلق قربانی ہے، خواہ وہ اُونٹ کی ہو یا بھیڑ بکری کی اور گائے بیل وغیرہ کی، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے انحر کے معنی یہ منقول ہے کہ ’’النحر، النّسک والذبح یوم الاضحٰی‘‘ حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے ’’انْحَرْ قال اذبح‘‘ عکرمہؒ فرماتے ہیں ’’انحر، النسک‘‘ یہ سب اقوال ابنِ جریر نے اپنی تفسیر (۲) میں نقل کئے ہیں اور اوپر ہم صاحب تفسیر حقانی سے نقل کرآئے ہیں کہ نحر کا لفظ عرب کے محاورہ میں قربانی کے لئے مستعمل ہے۔

پرویز صاحب آگے مزید لکھتے ہیں:

> ’’آخر میں یہ کہ اگر تمام بحث کو چھوڑ کر اسے فرض بھی کرلیا جائے کہ وَانْحَرْ سے مراد قربانی ہے تو جب قرآن نے قربانی کا مقام متعین کردیا (یعنی مکہ) تو وَانْحَر کے معنی بھی انہی اُونٹوں کی قربانی ہوگی جو حج میں ذبح کئے جاتے ہیں۔‘‘ (۳)

---

(۱)...... قرآنی فیصلے ص ۷۵

(۲)...... احکام القرآن ص ۴۸۱ ج ۳

(۳)...... قرآنی فیصلے ص ۷۶

بوالعجبی ملاحظہ کیجئے، ایک طرف تو پرویز صاحب یہ کہتے ہیں کہ سورۂ کوثر ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، دوسری طرف اس کے معترف ہیں کہ حج ۹ھ میں فرض ہوا، تیسری طرف اس پر مصر ہیں کہ قربانی کا حکم حج کے ضمن میں آیا ہے اور مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ اس کا حکم نہیں، اب یہاں یہ کہہ رہے ہیں کہ انحر سے مراد حج کے موسم میں قربانی کرنا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حج فرض ہونے سے دس سال پہلے قربانی کا حکم نازل ہو چکا تھا، کیا کوئی ہوش منداس بات کو تسلیم کرسکتا ہے کہ حج فرض ہونے سے دس سال پہلے اس کی ایک ضمنی چیز کا حکم نازل ہو چکا ہو؟ اگر پرویز صاحب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وَانْحَرْ سے مراد قربانی ہے تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے مطلقِ قربانی مراد ہے نہ کہ حج کے ضمن میں ہونے والی قربانی، اس لئے کہ اس میں حج کی طرف کوئی معمولی اشارہ تک نہیں۔

آگے قربانی کو ایک غیر شرعی رسم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> (۳) قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں، یہ ایک رسم ہے جو ہم میں متوارث چلی آرہی ہے،(۱) "یہ کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔" (۲)

جہاں تک قرآن میں قربانی کا تعلق ہے اس کا تفصیلی جواب ہم پیچھے دے چکے ہیں اور ہم یہ بھی نقل کر آئے ہیں کہ عہد رسالت سے چودھویں صدی تک بغیر کسی اختلاف کے اس پر عمل ہوتا آیا ہے اس لئے یہ کہنا کہ "یہ کچھ ہزار برس سے ہوتا آرہا ہے" بالکل خلاف حقیقت ہے تاریخ سے اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اس کی تفصیل آگے آئے گی، رہا یہ کہنا "کہ یہ ایک رسم ہے جو ہم میں متوارث چلی آرہی ہے" حقائق پوشی کی بدترین مثال ہے ہم ماقبل میں اس کا مستقل عبادت ہونا اور شرعی حکم ہونا ثابت کر آئے ہیں۔

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ چودھویں صدی تک پوری اُمت قرآن سے اس کو

---

(۱)..... قرآنی فیصلے ص ۵۷

(۲)..... ص ۶۳۔

مشروع مانتی آئی ہو اور آج ایک شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں اس کا حکم نہیں، آخر ہم کس کی بات مانیں؟ پوری اُمت کی یا اس ایک شخص کی؟ کیا ایک شخص کے قول پر پوری اُمت کے قول کو قربان کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کا کیا فیصلہ ہے، اس کو سنئے سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ م بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَ تْ مَصِيْرًا .(۱)

''اور جو کوئی مخالفت کرے رسول ﷺ کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سب مسلمانوں کے راستے کے خلاف، تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی، اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا۔''

دیکھئے قرآن نے کس طرح صراحت کردی ہے کہ جو مؤمنین کی راہ کے علاوہ دوسری راہ اختیار کرے گا وہی جہنمی ہوگا، اس آیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے پرویز صاحب کے متبعین فیصلہ کریں کہ ہم کس کی بات مانیں؟ پرویز صاحب کی یا پوری اُمت کی؟ آخر وہ کون سی عقل ہے جو اس بات کا فیصلہ دے کہ ہم پوری اُمت کی مدلّل بات کو چھوڑ کر پرویز صاحب کی اس بے بنیاد بات پر ایمان لائیں جس کی کوئی حقیقت نہیں اور جس کے دلائل تارِ عنکبوت سے بھی کمزور ہیں۔

اب تک ہم پرویز صاحب کے دوسرے اعتراض کا جواب دے رہے تھے، جس میں اُنہوں نے قربانی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کے ضمن میں سورۂ کوثر کی آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ سے قربانی کی مشروعیت پر استدلال کے سلسلہ میں انہوں نے جو اعتراضات کئے تھے اُن کے جوابات بھی آگئے اب آگے مزید سنئے:

---

(۱)...... سورۂ النساء آیت ۱۱۵

(۴) حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لہٰذا ہر جگہ قربانی دینا نہ حکم خداوندی ہے نہ سنت ابراہیمی اور نہ سنتِ محمدی ہے'' (۱)

ہر جگہ قربانی کا حکمِ خداوندی ہونا تو ہم قرآن حکیم کی متعدّد آیات سے ثابت کر چکے ہیں سنت محمدی ہونے سے انکار دراصل انکار حدیث پر مبنی ہے حالانکہ اگر پرویز صاحب کو احادیث سے بَیر ہے، تب بھی جب قرآن سے ہر جگہ قربانی کرنے کا حکم ثابت ہوگیا، خصوصاً جب سورۂ کوثر میں آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے اس کا حکم دیا گیا تو اس سے اس کا سنت محمدی ہونا بھی ثابت ہوگیا، پھر حدیث اور تاریخ سے آنحضرت ﷺ کا مدینہ میں ہر سال قربانی کرنا بھی ثابت ہے جس کی تفصیل عنقریب آئے گی۔

رہی سنت ابراہیمی ہونے کی نفی، سو اُس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سنت ابراہیمی کا کیا مطلب ہے؟ لفظ سنت کے معنی طریقہ کے ہیں کسی فعل کو کسی شخص کی طرف منسوب کر کے یہ کہنا کہ یہ فلاں شخص کی سنت ہے، اس کے دو مطلب ہوتے ہیں ایک یہ کہ وہ فعل صرف اسی شخص نے کیا ہے اس سے پہلے کسی سے اس فعل کا صدور نہیں ہوا، دوسرے یہ کہ وہ فعل صرف اس نے تو نہیں کیا بلکہ اس سے پہلے لوگوں سے بھی اس کا صدور ہوا ہے لیکن اس نے اس فعل کو ایک خاص وقت میں ایک خاص کیفیت وشان سے ادا کیا ہے جس کی وجہ سے اس فعل کو اس شخص کی سنت قرار دیا گیا، لہٰذا اگر کوئی دوسرا شخص اس فعل کو اسی خاص وقت میں، اسی خاص کیفیت وشان سے ادا کرتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی سنت (طریقہ) اپنایا ہے، اس دوسرے معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ ہم جس مہینہ اور جس دن، جس شان وشوکت سے قربانی کرتے ہیں کیا وہ وہی مہینہ اور وہی دن نہیں ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی شان وشوکت سے قربانی کی تھی؟ اگر ہے اور بے شک ہے تو پھر اسے سنتِ ابراہیمی کہنے پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ اور قربانی کو سنتِ ابراہیمی اس دوسرے

---

(۱)..... قرآنی فیصلے ص ۶۵

معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم نے اپنے رسالہ ''تاریخِ قربانی''میں اس کو دوسرے انداز میں بیان فرمایا ہے، اُنہوں نے قربانی کے سنت ابراہیمی ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ [1] نے اپنے اس مقبول رسول اور خلیل اللہ کے ان اعمال وافعال کو پسند فرما کر قیامت تک اُن کی یادگار کو زندہ رکھنے کے لئے ان افعال واعمال کی نقل کرنے کو اپنی محبوب عبادت قرار دے کر اسے اپنے بندوں پر لازم کردیا، جس طرح واجبات حج میں تینوں جمرات پر کنکریاں مارنا اسی خلیل الٰہی عمل کی یاد ہے، حجاج پر خصوصاً اور عام مسلمانوں پر عموماً جانور کی قربانی اس یادگار کو زندہ رکھنے کے لئے لازم کی گئی ہے. جس طرح صفا ومروہ کے درمیان دوڑنا اور سات چکر لگانا حضرت ہاجرہ کے عمل کی ایک یادگار ہے اس کو بھی واجبات حج میں داخل کردیا گیا۔''

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خلیل الٰہی کارناموں میں سے صرف قربانی ہی ایک ایسا کارنامہ ہے جسے قرآن حکیم نے شعائر اللہ میں سے ہونے کا اعلان کیا، جیسا کہ سورۂ حج میں ارشاد ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ

باقی کارناموں کو شعائر اللہ میں شمار نہیں کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ قربانی کے علاوہ باقی کارنامے زمان ومکان دونوں کے ساتھ مخصوص ہیں ہر مکان میں اس کو انجام نہیں دیا جاسکتا، اس کے برخلاف قربانی صرف اس مخصوص زمان کے ساتھ مخصوص ہے مکان کے ساتھ نہیں، اس لئے اس کو صرف اس مخصوص زمان میں ہر مکان میں انجام دیا جاسکتا ہے، اسی لئے اس کو شعائر اللہ میں سے شمار کیا، لہٰذا قربانی کو جو شعائر اللہ میں سے ہے اور جو درحقیقت خلیل

---

(۱)......تاریخ قربانی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم، مطبع ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی ۱۴

الٰہی کارنامہ کی یادگار ہے سنتِ ابراہیمی نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

(۵) اب تک تو پرویزؔ صاحب نے قرآنی حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس پر بس نہیں کیا، بلکہ آگے تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی ناکام کوشش کی، اس سلسلہ میں اُن کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

''تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرم نے بھی مدینہ میں قربانی نہیں کی، بلکہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں جا کر قربانی کی۔'' (۱)

اس مقام پر پرویزؔ صاحب نے حقائق پوشی کی وہ مثال قائم کر دی جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ بھی عاجز ہے، تاریخ کی جن کتابوں میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا حج کے لئے تشریف لے جانے اور وہاں جا کر قربانی کرنے کا ذکر ہے اُن کتابوں میں اس کا بھی ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ میں بھی قربانی کی۔ (۲)

ذیل میں ہم اس کی صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱)...... ابن اثیر، تاریخ الکامل دوسری ہجری کے واقعات میں سے غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم انصرف رسول اللّٰہ ﷺ ا وحضر الاضحٰی وخرج الی المصلّٰی وصلی بالمسلمین وھو اوّل صلوٰۃ عید صلّاھا وضحی فیہ رسول اللّٰہ ﷺ بشاتین وقیل بشاۃ وکان اوّل اضحی راہ المسلمون وضحی معہ ذوالیسار. (۳)

''پھر آنحضرت ﷺ (غزوۂ بنی قینقاع سے) واپس ہوئے اور قربانی کا زمانہ بھی آپہنچا، آپ ﷺ عیدگاہ کی طرف نکلے اور مسلمانوں کو (عید کی) نماز پڑھائی اور یہ عید کی پہلی نماز تھی، جو پڑھی گئی، اس میں آنحضرت ﷺ نے

(۱)...... قرآنی فیصلے ص ۵۵

(۲)...... البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۳ ص ۲۵۶، مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظۃ، مصر ۱۹۳۲ء

(۳)...... الکامل لابن الاثیر الجزری، ص ۵۲ ج ۲

(ایک روایت کے مطابق) دو بکریوں کی اور دوسری روایت کے مطابق ایک کی قربانی دی اور یہ سب سے پہلی قربانی تھی، جسے مسلمانوں نے دیکھا اور آپ ﷺ کے ساتھ مال دار لوگوں نے بھی قربانی کی۔"

۲)...... بلکہ طبقات ابن سعد میں اس کی بھی صراحت ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر لوگوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا:

وصلّٰی العید یوم الاضحی وامر بالاضحیة واقام بالمدینة عشر سنین یضحی کلّ عام. (۱)

"اور یوم الضحٰی کے دن عید کی نماز پڑھی اور (لوگوں کو) قربانی کا حکم دیا اور آپ ﷺ دس سال مدینہ میں رہے اور ہر سال قربانی بھی کرتے رہے"۔

ان کے علاوہ ابن خلدون نے اپنی (۲) تاریخ میں اور علامہ نور الدین سمہودی نے اپنی کتاب "وفاء (۳) الوفاء باخبار دار المصطفٰی" اور مُلّا علی قاری نے مرقات (۴) شرح مشکوٰۃ میں بھی یہی تصریح کی ہے کہ آپ ﷺ نے ۲ھ میں عید کی نماز پڑھی اور قربانی بھی کی۔

ہم نے یہاں صرف چند کتابوں کا حوالہ دیا ہے ورنہ تاریخ کی چھوٹی بڑی کوئی کتاب اس سے خالی نہیں، تاریخ کی اس طرح بے غبار اور واضح تصریحات کی موجودگی میں پرویز صاحب کا یہ دعوٰی کہ تاریخ سے آپ ﷺ کا مدینہ میں قربانی کرنے کا ذکر نہیں ملتا، یا تو اس پر مبنی ہے کہ اُنہوں نے یہ بات تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر کہی ہے یا ان کا مقصد تاریخی حقائق کو چھپانے کی ناپاک کوشش ہے۔

تمت بالخیر

---

(۱)...... الطبقات الکبرٰی لابن سعد ص ۱۳ ج ۲ مطبعۃ لجنۃ نشر الثقافۃ الاسلامیۃ بالقاہرہ ۱۳۵۸ھ۔

(۲)...... تاریخ ابن خلدون ص ۷۵۹ ج ۲ دار الکتب اللبنانی ۱۹۵۶ء

(۳)...... وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰی ﷺ لنور الدین السمہودی ص ۲۷۹ ج ۱، المکتبۃ العلمیۃ بالمدینۃ المنورۃ ۱۳۷۴ھ

(۴)...... مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، مُلّا علی قاری ص ۲۸۴ ج ۳ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

۹۰

احکام عید الاضحیٰ وقربانی

تاریخ تالیف ______ شعبہ نشر و اشاعت جامعہ دارالعلوم کراچی
مقامِ تالیف ______ کراچی

ایک مختصر رسالہ جو عوام الناس کے فائدے کے لئے جامعہ دارالعلوم کی
طرف سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر مفت تقسیم ہوتا رہا
ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے عشرۂ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں، ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور ایک رات میں عبادت کرنا شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔

(ترمذی وابن ماجہ)

قرآن مجید سورۂ والفجر میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول میں یہی عشرۂ ذی الحجہ کی راتیں ہیں، خصوصاً نویں تاریخ یعنی عرفہ کا دن، اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں، عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہے، اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

تکبیر تشریق

اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر وَ لِلّٰہِ الْحَمْد۔

عرفہ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے، فتویٰ اس پر ہے کہ با جماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں، اسی طرح مرد وعورت دونوں پر واجب ہے، البتہ عورت بآواز بلند تکبیر نہ کہے، آہستہ کہے۔ (شامی)

تنبیہ

اس تکبیر کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے، بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، پڑھتے ہی نہیں، یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

نمازِ عید

عید الاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں، صبح کو سویرے اٹھنا، غسل ومسواک کرنا، پاک وصاف عمدہ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا، عید گاہ کو جاتے ہوئے تکبیر مذکور الصدر بآواز بلند پڑھنا، نماز عید دو رکعت ہیں، مثل دوسری نمازوں، کے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں۔

پہلی رکعت میں **سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ** الخ پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قراءت کے بعد رکوع سے پہلے ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا چاہئے، پہلی رکعت میں دو تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں، دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں، نماز عید کے بعد خطبہ سننا سنت ہے۔

قربانی

قربانی ایک اہم عبادت ہے، اور شعائر اسلام میں سے ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے، اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ سورۂ اِنَّا اَعْطَیْنَاکَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہئے۔ (فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انْحَرْ) کا یہی مفہوم ہے، دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے، جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظّمہ کے لئے مخصوص نہیں، ہر شخص پر، ہر شہر میں بعد تحققِ شرائط واجب ہے، (ترمذی) اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے، اسی لئے جمہورِ اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے۔ (شامی)

قُربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟

قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ مقیم پر واجب ہوتی ہے، جس کی ملک میں ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجات اصلیہ سے زائد موجود ہو، یہ مال خواہ سونا، چاندی یا اس کے زیورات ہوں، یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھریلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ ہو۔ (شامی)

قربانی کے معاملہ میں اس مال پر سال بھر گزرنا بھی شرط نہیں، بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو، تو بھی اس پر اس کی طرف سے اس کے ولی پر قربانی واجب نہیں، اسی طرح جو شخص شرعی قاعدے کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں۔ (شامی)

مسئلہ:...... جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی، اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا، تو اس کی قربانی واجب ہوگئی۔ (شامی)

قربانی کے دن

قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں، قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخیں ہیں، اس میں جب چاہے قربانی کر سکتا ہے، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے۔

قربانی کے بدلے میں صدقہ وخیرات

اگر قربانی کے دن گزر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کر سکا، تو قربانی کی قیمت فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کر دینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا، ہمیشہ گناہگار رہے گا، کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے، جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعامل صحابہ اس پر شاہد ہیں۔

قربانی کا وقت

جن بستیوں یا شہروں میں نماز جمعہ وعیدین جائز ہے، وہاں نماز عید سے پہلے

قربانی جائز نہیں، اگر کسی نے نماز سے پہلے قربانی کر دی، تو اس پر دوبارہ قربانی لازم ہے، البتہ چھوٹے گاؤں جہاں جمعہ و عیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں، یہ لوگ دسویں تاریخ کی صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں، ایسے ہی اگر کسی عذر کی وجہ سے نماز عید پہلے دن نہ ہو سکے، تو نماز عید کا وقت گزر جانے کے بعد قربانی درست ہے۔

(درمختار)

مسئلہ:.....قربانی رات کو بھی جائز ہے، مگر بہتر نہیں۔ (شامی)

قربانی کے جانور

بکرا، دنبہ، بھیڑ، ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کیا جا سکتا ہے، گائے، بیل، بھینس، اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے، بشرطیکہ سب کی نیت ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔

مسئلہ:.....بکرا، بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو، تو وہ بھی جائز ہے، گائے، بیل، بھینس دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ:.....اگر جانوروں کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتاتا ہے، اور ظاہری حالات سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی، تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:.....جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں، یا بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہو، اس کی قربانی جائز ہے، ہاں سینگ جڑ سے اکھڑ گیا ہو، جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے، تو اس کی قربانی درست نہیں۔ (شامی)

مسئلہ:.....خصی (بدھیا) بکرے کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے۔ (شامی)

مسئلہ:...... اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں، اسی طرح ایسا مریض اور لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں نہ جا سکے، اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:...... جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دُم وغیرہ کٹی ہوئی ہو، اس کی قربانی جائز نہیں۔ (شامی)

مسئلہ:...... جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں، یا اکثر نہ ہوں، اس کی قربانی جائز نہیں، (شامی، درمختار) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں، اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ:...... اگر جانور صحیح سالم خریدا تھا، پھر اس میں کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہو گیا، تو اگر خریدنے والا غنی صاحب نصاب نہیں ہے، تو اس کے لئے اس عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے، اور اگر یہ شخص غنی صاحب نصاب ہے، تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرے۔

(درمختار وغیرہ)

قربانی کا مسنون طریقہ

اپنی قربانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے، اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا، تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے، مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ:...... قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں، البتہ ذبح کرنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے روبہ قبلہ لٹائے، تو یہ آیت پڑھے:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے: اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْہُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ وَ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ۔

آداب قربانی

قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے۔

مسئلہ:...... قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا، یا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کرلیا، تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (بدائع)

مسئلہ:...... قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرے، اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرے، اور ذبح کے بعد کھال اتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے، جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

متفرق مسائل

عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں، لیکن جس شہر میں کئی جگہ نماز عید ہوتی ہو تو شہر میں کسی جگہ بھی نماز عید ہو گئی، تو پورے شہر میں قربانی جائز ہو جاتی ہے۔

(بدائع)

مسئلہ:...... قربانی کے جانور کے اگر ذبح سے پہلے بچہ پیدا ہو گیا، یا ذبح کے وقت اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکل آیا، تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہئے۔ (بدائع)

جس شخص پر قربانی واجب تھی، اگر اس نے قربانی کا جانور خرید لیا، پھر وہ گم ہو گیا، یا چوری ہو گیا، یا مر گیا، تو واجب ہے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے۔ اگر دوسری قربانی کے بعد پہلا جانور مل جائے، تو بہتر یہ ہے کہ اس کی بھی قربانی کر دے، لیکن اس کی قربانی اس پر واجب نہیں، اگر یہ شخص غریب ہے، جس پر پہلے سے قربانی واجب نہ تھی، نفلی طور پر اس نے قربانی کے لئے جانور خرید لیا، پھر وہ مر گیا، یا گم ہو گیا، تو اس کے ذمہ دوسری قربانی واجب نہیں، ہاں اگر گم شدہ جانور قربانی کے دنوں میں مل جائے، تو اس کی قربانی کرنا واجب ہے۔ اور ایام قربانی کے بعد ملے، تو اس جانور یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (بدائع)

قربانی کا گوشت

۱:...... جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کر کے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔

۲:...... افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لئے رکھے، ایک حصہ احباب و اعزہ میں تقسیم کرے، ایک حصہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرے، اور جس شخص کا عیال زیادہ ہو، وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔

۳:...... قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔

۴:...... ذبح کرنے والے کی اجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں، اجرت علیحدہ دینی چاہئے۔

قربانی کی کھال

۱:......قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا، مثلاً مصلیٰ بنالیا جائے، یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوالیا جائے، یہ جائز ہے، لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں، بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے، اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدوں نیت صدقہ کے جائز بھی نہیں۔ (عالمگیری)

۲:......قربانی کی کھال کسی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، اسی لئے مسجد کے مؤذن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر ان کو کھال دینا درست نہیں۔

۳:......مدارس اسلامیہ کے غریب اور نادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے، احیائے علم دین کی خدمت بھی، مگر مدرسین و ملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں۔ واللہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کراچی نمبرا

۹۱

رَفع التَّلاحی عن جُلود الأضَاحِیُ

چرمِ قُربانی کے احکام

تاریخ تالیف ــــــــــ ۱۳۵۰ھ (مطابق ۱۹۳۱ء)

مقامِ تالیف ــــــــــ دیوبند

اشاعت اول دارالاشاعت دیوبند

قربانی کا گوشت یا اس کی کھال تو مالدار کو بھی بطور ہدیہ دی جا سکتی ہے لیکن کھال بیچنے کے بعد اس کی رقم کا مصرف صرف فقراء ہیں۔ رقم مالدار کو نہیں دی جا سکتی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ چرم قربانی کے متعلق بعض علماء بریلی فرماتے ہیں، کہ قربانی کرنے والا یا بعینہ یا قیمت چرم کارِ خیر میں دینے کی نیت سے بیچ کر مہتمم مدرسہ یا متولی مسجد کو دیدے، اور چرم قربانی وصول ہونے کی صورت میں مہتمم ومتولی بیچ کر مدرسہ ومسجد میں خواہ تنخواہ ہو، یا غیر تنخواہ صرف کرے، سب جائز ہے، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟ اگر نہیں تو مدلل ارشاد فرمایا جاوے، تا کہ مخالف پر حجت قائم ہو سکے، اور قوم گمراہی سے محفوظ رہے۔ بینوا توجروا فقط

الجواب

ا:......فی العالمگیریة یتصدق بجلدها او یعمل منه نحو غربال و جراب (الی قوله) و لا یبیعه بالدارهم لینفق الدراهم علی نفسه و عیاله و اللحم بمنزلة الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعه بما لاینتفع

به الا بعد استهلاكه و لو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز لانه قربة كالتصدق كذا فى التبيين و هكذا فى الهداية و الكافى

(عالمگیری کتاب الاضحیة باب :۷،ص:۳۱۳،ج:۵)

۲:......و فى الهداية لو باع الجلد او اللحم بالدراهم او بما لاينتفع به الا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لان القربة انتقلت الى بدله ص: ۴۳۴ ، ج: ۲ و فى حواشى الهداية من الكافى، انتقلت القربة اليه فوجب التصدق.

۳:......و فى الدرالمختار فان بيع اللحم او الجلد به اى بمستهلك او بدراهم تصدق بثمنه و مفاده صحة البيع مع الكراهة و أقره الشامى. ص: ۲۲۸، ج:۵۔

۴:......و فى البدائع لا يحل بيع جلدها وشحمها و لحمها (الى قوله) من الدراهم و الدنانير و الماكولات و المشروبات و لا ان يعطى اجر الجزار و الذابح منها لما روى عن رسول الله صلى الله عليه و سلم انه قال من باع جلد اضحية فلااضحية له (الى قوله) فان باع شيئا من ذالك نفذ بيعه عند ابى حنيفة و محمدؒ و عند ابى يوسفؒ لاينفذ لما ذكرنا فيما قبل الذبح و يتصدق بثمنه

لان القربة ذهبت عنه فيتصدق به و لانه استفاده بسبب محظور هو البيع فلايخلو عن خبث فكان سبيله التصدق (البدائع ص: ۸۱، ج: ۵)

۵: ...... و فى الخلاصة و لاباس ببيعه بالدراهم ليتصدقها و ليس له ان يبيعه بالدارهم لينفقها على نفسه و لوفعل ذالک يتصدق بثمنه (خلاصة الفتاویٰ ص: ۳۲۲، ج: ۴)

۶: ......و فى البحر و ياكل من لحم الاضحية و يوكل و يدخر (الى قوله) ولما جاز ان يأكل منه و هو غنى فالاولیٰ ان يجوز له اطعام غيره و ان كان غنيا انتهیٰ ثم قال و لا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه و عياله(الى قوله) و لو باعها بالدراهم ليتصدقها جاز لانه قربة كالتصدق بالجلود و اللحم و قوله عليه السلام من باع جلد اضحية فلااضحية له يفيد كراهية البيع و اما البيع فجائز لوجود الملک و القدرة على التسليم.

(بحر ص: ۱۷۸ ج: ۸)

عبارات مذکورہ بالا سے قربانی کے چمڑے اور گوشت کے متعلق احکام ذیل ثابت ہوئے۔

الف: ...... گوشت اور چمڑا جب تک خود موجود ہے، اس میں قربانی کرنے والے کو تین

قسم کے اختیار شرعاً حاصل ہیں۔

ا:......خود کھانا اور استعمال کرنا۔

۲:......دوسرے احباب اغنیاء کو کھلانا اور استعمال کرانا۔

۳:......فقراء اور مساکین پر صدقہ کر دینا جیسا کہ عبارت بحر مندرجہ نمبر ۶ سے معلوم ہوا نیز آیت قرآنی میں منصوص ہے، **فکلوا منها و اطعموا البائس الفقیر**۔

ب:......اور اگر قربانی کا چمڑا یا گوشت (علی القول المختار) نقد روپیہ کے عوض یا کسی ایسی چیز کے عوض فروخت کر دیا، جس سے نفع اٹھانا اس کی اصل کے قائم رہتے ہوئے ممکن نہ ہو، جیسے کھانے پینے کی چیزیں، تو اس صورت میں صرف تیسری صورت متعین ہو جاتی ہے، یعنی صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، خود کھانا یا اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں رہتا، خواہ صدقہ کرنے ہی کی نیت سے فروخت کیا ہو، یا اپنے کھانے پینے کے لئے، بہر حال صدقہ کرنا اس کا واجب ہو جاتا ہے، جیسا کہ تمام عبارات مذکورۃ الصدر میں اس کی تصریح ہے، بالخصوص عبارت خلاصہ مندرجہ نمبر ۵ و عبارت بحر نمبر ۶ میں بوضاحت مذکور ہے۔

ج:......یہ بھی معلوم ہوا کہ فروخت کرنا قربانی کے گوشت یا چمڑے کا اگر صدقہ کرنے کی نیت سے ہو، تو جائز ہے، اور اگر اپنے کھانے پینے کی غرض سے ہو، تو گناہ ہے۔ لیکن بیع صحیح ہو جاتی ہے، جیسا کہ ہدایہ اور بدائع میں اس کی تصریح ہے، رہا بعض کا یہ شبہ کہ جب گناہ اور ناجائز ہے، تو بیع کیسے صحیح ہو جائے گی؟ سو یہ محض عامیانہ شبہ ہے، جس شخص کو فقہ حنفی سے کوئی مناسبت ہے، وہ ایسا شبہ نہیں کر سکتا، کیونکہ فقہ حنفی میں سینکڑوں نظائر اس کے موجود ہیں

کہ باوجود فعل ناجائز ہونے کے عقد جائز ہو جاتا ہے، جیسے جمعہ کی اذان کے بعد بیع وشراء ناجائز اور گناہ ہے، لیکن اگر کسی نے کر لی، باوجود گناہ گار ہونے کے بیع نافذ ہو جاتی ہے، اور مبیع اس کی ملک میں آجاتی ہے، اس کے علاوہ اور سینکڑوں نظائر اس کے فقہ میں موجود ہیں، ایسا شبہ وہی کر سکتا ہے، جو یا تو فقہ سے بالکل ناواقف ہو، یا منکر ہو۔

خلاصہ یہ کہ اگر اپنے استعمال کی نیت سے فروخت کر دیا، تو باوجود گناہ گار ہونے کے بیع نافذ ہو گئی، اور صدقہ کرنا اس کی قیمت کا بہر دو صورت واجب ہو جاتا ہے، جیسا کہ عبارت خلاصہ و بحر مندرجہ نمبر ۵ و نمبر ۶ سے واضح ہو چکا، اور اس تفصیل کی بناء پر عبارات فقہاء اور حدیث ممانعت بیع کا ظاہری تعارض بھی رفع ہو گیا، کیونکہ ممانعت حدیث اس شخص کے لئے ہے، جو اپنے کھانے پینے کے لئے فروخت کرتا ہے، اور جو فقراء پر صدقہ کرنے کے لئے فروخت کرے، وہ اس میں داخل نہیں۔ اور جب عبارات مذکورہ سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، خواہ بہ نیت صدقہ ہی فروخت کی ہو، یا اپنی ہی ضرورت میں خرچ کرنے کے لئے، تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین وغیرہ ہیں، اغنیاء نہیں۔

لما فی الخلاصة و فی مجموع النوازل قوله علیه الصلوٰة و السلام لاتحل الصدقة لغنی و لالفقیر بنی هاشم محمول علی الصدقة الواجبة (الی قوله) اما اذا اطلق لفظ الصدقة فهی صدقة واجبة (خلاصة الفتاویٰ ص: ۲۴۵ ج: ۱) و فی رد المحتار و هو (یعنی مصرف الزکاة) مصرف ایضاً لصدقة الفطر و الکفارة و النذر

وغیر ذالک من الصدقات الواجبة کما فی القهستانی۔

(شامی ص:۶۳، ج:۳)

تحریر مذکور سے یہ واضح ہو گیا کہ چرم قربانی کو اگر فروخت کر دیا جاوے، تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہو جاتا ہے، اور مصرف اس کا صرف فقراء و مساکین ہوئے، اغنیاء کو نہیں دیا جا سکتا، اور اسی طرح مدرسین وغیرہ کی تنخواہوں میں بھی صرف نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مسکین کو بدوں کسی معاوضہ کے دیا جاوے۔ اگر تنخواہوں میں دیا گیا، تو اجرت ہو جاوے گی، اور اگر غنی کو دیا گیا، تو حقیقتاً ہبہ ہوگا، گو لفظاً صدقہ کہا جاوے۔

ہاں گوشت و پوست جب کہ خود موجود ہوں، تو ان کا خود کھانا اور استعمال کرنا یا کسی غنی کو دے دینا، اس کو شریعت نے جائز رکھا ہے، وہ بھی اس حیثیت سے کہ بنص حدیث یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی مہمانی ہے، اور ظاہر ہے کہ مہمان کو کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے، فروخت کر دینے کی نہیں، اسی مضمون کو بدائع میں بالفاظ ذیل ذکر فرمایا ہے:

و لانها من ضيافة اللّٰه تعالیٰ عز شانه اللتی اضاف بها عباده و ليس للضيف ان يبيع من طعام الضيافة شيئا. (بدائع ص:۸۱، ج:۵)

اور بریلوی فتویٰ میں جس قدر عبارتیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سے کسی ایک لفظ سے بھی ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چرم قربانی فروخت کر دینے کے بعد بھی اغنیاء کو دینا جائز ہے، بلکہ ان سب عبارتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا گوشت اور چمڑا بعینہٖ اغنیاء

کو بھی دینا جائز ہے، جس میں کسی کو خلاف نہیں۔

اور حدیث ابوداؤد فکلوا و ادخروا و ائتجروا میں اگر (اتجروا) بالتاء المشددۃ کی روایت بھی تسلیم کی جاوے، تو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی اجازت اس سے ثابت ہوگی، پھر قیمت کا حکم اس میں مذکور نہیں۔ ثانیاً وائتجروا کے معنی بھی علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں صدقہ دینا بیان کئے ہیں، ولفظہ و حدیث الاضاحی کلوا و ادخروا و ائتجروا ای تصدقوا طالبین الاجر۔ نیز دوسری روایت حدیث اسی معنی کی تائید کرتی ہے، جو مسلم میں بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے، کلوا و ادخروا و تصدقوا (از تخریج ہدایہ ص:۲۷۸ ج:۲) اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ابی داؤد میں صحیح روایت و ائتجروا بالہمزہ کی ہے۔

خلاصہ جواب

یہ ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے سے پہلے تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے، اور اغنیاء کو ہدیۃً بھی دے سکتا ہے، اور فقراء اور مساکین پر صدقہ بھی کرسکتا ہے، لیکن اگر روپیہ پیسوں کے عوض فروخت کر دیا، تو خواہ کسی نیت سے فروخت کیا ہو، اس کا صدقہ کر دینا واجب ہو جاتا ہے، اور اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں، اور اغنیاء کو دینا یا ملازمین و مدرسین کی تنخواہوں میں دینا جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ

احقر محمد شفیع غفرلہ

خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۳۵۰ھ

۹۲

تحفة الاخوان فی تحقیق معنی الضَّأن

قرآن کریم میں موجود لفظ ''ضأن'' کی تحقیق

تاریخ تالیف ——— ۱۸؍صفر ۱۳۶۲ھ (مطابق ۱۹۴۳ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

اشاعت اول دیوبند ضلع سہارنپور

قرآن مجید میں لفظ ''ضأن'' کا کیا مفہوم ہے؟ کیا یہ لفظ دُنبا، دُنبی، بھیڑ مذکر، بھیڑ مونث سب کو شامل ہے؟ ان جانوروں کی قربانی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں یہ فقہی رسالہ تحریر کیا گیا۔

تحفة الاخوان
فی
تحقیق معنی الضّأن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفےٰ

اما بعد :

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے متعلق؟ جس طرح کہ دنبہ دنبی ششماہی کی قربانی جائز ہے بھیڑ بھیڑا (چھترا) شش ماہی کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ متون فقہ کی کتاب الاضحیہ میں بیان اسنان کے ماتحت " ویجزی عن ذلک کلہ الثنی فصاعدا الاالضان فان الجذع منہ یجزی" (او مثل ھذہ) میں ضان سے کیا مراد ہے؟ کیا ضان اسے نہیں کہتے کہ جس کے الیہ ہو؟ جیسا کہ شامی نے لکھا ہے۔ اور حضرت تھانوی نے بہشتی زیور "مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند" کے منہیہ میں تردد ظاہر کیا ہے؟ حضرت مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے قطعی فیصلہ کیا ہے کہ ضان وہی ہے جس کے الیہ ہو۔ پس بھیڑ بھیڑا ششماہی کی قربانی ناجائز ہوگی۔ اگر (جدا نہ کردہ) بھیڑ بھیڑا بھی دنبہ دنبی ہی کی حیثیت رکھتے ہیں تو فتویٰ کے جواز کے

ساتھ لفظ ضأن کی تعیین مراد مدلل ہونی چاہئے کہ اہل قسم کے شبہات رفع ہو جائیں۔ قطعی فیصلہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ تردد کا شائبہ نہ ہو کہ ازدیاد خلجان کا باعث ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

قرآن مجید میں لفظ ضان کو معز کا مقابل قرار دیا ہے قال تعالیٰ" ومن الضان اثنین ومن المعز اثنین "امام بغوی نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے والضان النعاج وھی ذوات الصوف من الغنم (الی) والمعز والمعزیٰ جمع لا واحد له من لفظه وھی ذوات الشعر من الغنم (تفسیر معالم التنزیل) نیز تفسیر مظہری میں ہے الضان اسم جنس وھی ذات الصوف من الغنم (الی قوله) والمعز وھی ذات الشعر من الغنم (مظھری ص ٤٤ جز پارہ ٨) جس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً اون والی غنم کو ضان کہا جاتا ہے۔ خواہ چکدی والا ہو یعنی دنبہ یا بلا چکدی یعنی بھیڑ۔

اسی طرح حدیث میں جذعہ ضان کو جذعہ معز کے مقابل قرار دے کر جذعہ کو جائز قرار دیا ہے (کمافی روایۃ مسلم) اور جذعہ معز کی اجازت صرف ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر عنایت فرمائی اور دوسروں کے لئے فرمایا کہ لا نجزی عن احد بعدک کما اخرجه البخاری اور نہایہ ابن اثیر میں ایک حدیث کے الفاظ میں خود لفظ ضان کی شرح مطلق ذوات الصوف سے منقول ہے۔ قال (فی حدیث شقیق) مثل قراء ھذا الزمان کمثل غنم ضوائن ذات صوف عجاف الضوائن جمع ضائنة وھی الشاة من الغنم خلاف المعز (نہایہ

ج ۳ ص ۱۱) اور ابن اثیر نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ۔ضان معز کا مقابل ہے ۔نیز حدیث میں یجزی جذ ع من الضان عما یجزی فیه الثنی من المعز (بدائع ص ۷۰) اسی طرح عام شراح حدیث نے ضان کو معز کا مقابل قرار دے کر جذعه ضان کو مطلقاً جائز اور جذعه معز کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔عمدۃ القاری شرح بخاری میں ہے ھی جذعة معز کانت لا یجوز واما الجذعة من الضان فیجوز (ج ا ص ۱۱) اور مجمع البحار میں بھی حدیث شقیق نقل کر کے لکھا ہے هو جمع ضائنة وهی الشاة من الغنم خلاف المعز (ص ۲۷۷ ج ۲) نہایہ مجمع البحار کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حدیث میں لفظ ضان سے مراد وہ ہے جو ذات الشعر نہ ہو۔ بلکہ ذات الصوف یعنی اون والے ہوں خواہ دنبہ ہو یا بھیڑ۔اسی طرح فقہاء کی تصریحات بھی اسی کے موافق ہیں۔شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط میں ہے:۔

ثم الثنی من الغنم وهو الذی تم له سنتان عند اهل الادب وعند اهل الفقه الذی تمت له سنة (الی قوله) وهکذا من الغنم عند اهل الادب وعنداهل الفقه اذا تم له سبعة اشهر فهو جذ ع بعد ذلک ولا خلاف ان الجذ ع من المعز لا یجوز وانما ذلک من الضان خاصة (مبسوط ص ۱۰ ج ۱۲)

مبسوط کی عبارت سے بھی یہی مستفاد ہوا کہ معز کے خلاف ہر ذات الصوف ضان میں داخل ہے اور ہدایہ میں ہے۔والجذ ع من الضان مما تمت له ستة اشهر فی مذهب الفقهاء وذکر الزعفرانی انه ابن سبعة اشهر والثنی منها و من المعز ابن سنة (ومثله فی مجمع الانهر ص ۵۱۹ ج ۲) ہدایہ کی عبارت میں بھی ضان کا معز کو مقابل قرار دینے سے معنی مذکوہ کی تائید مستفاد ہوتی

ہے اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔ ویجوز من الابل والبقر والمعز الثنیان ولا یجوز الجذعان الاالجذع العظیم من الضان (ص ۳۳۱ ج ۴)

وفی شرح النقایة للعلامة الشمنی وصح الجذع من الضان وهو عندالفقهاء ماتم له ستة اشهر و ذکر الزعفرانی انه ابن سبعة والثنی فصاعداً من غیره وهو ای الثنی ابن حول من الضان والمعز وابن حولین من البقر (شمنی قلمی ص ۴۱۶) اورعینی شرح ہدایہ میں ہے وبقولنا قال مالک واحمد وقال شافعیؒ لا یجزی من الضان الا اللتی فی السنة الثانیة ومن الا اللتی فی السنة الثانیة (ثم قال العینی)فیجوز فی الاضحیة (الی قوله) واما المعز لا یجوز الا ماتمت له سنة وطعنت فی الثانیه (ص ۱۴۶) فی شرح ملا مسکین علی الکنز وجاز الثنی من الکل والجذع من الضان الغنم اسم جنس یطلق علی الذکر والانثی من الضان والمعز والضائن خلاف المعز والجذع من الضان الذی اتی علیه اکثر الحول ص ۲۹۷ طبع مصر۔ ملا مسکین کی تصریح سے معلوم ہوا۔ کہ معز یعنی ذات الشعر کے خلاف یعنی ہر اون والی غنم ضان میں داخل ہے۔ خواہ دنبہ ہو یا بھیڑ۔ اور عینی شرح کنز میں ہے عن الا زهری الجذع من المعز لستة اشهر ومن الضان لثمانية اشهر . و مثله فی الکفایة شرح الهدایة۔

اور جامع الرموز میں ہے۔ وانماقال من الضان لا نه لا یجوز

من المعز وغیرہ بلا خلاف کما فی المبسوط ولکن فی الخلاصۃ العتود من المعز کالجذع من الضان .

(ص ۱۵۲ نو لکشور)

اور فتاویٰ سراجیہ میں ہے یجوز التضحیۃ بالجذع العظیم من الضان وھو ما اتی علیہ اکثر السنۃ وما دون ذلک لا یجوز ویشترط فی المعز ان یکون ثنیا وھو الذی اتت علیہ سنۃ (ص ۳۲۹)

حضرات فقہا کی مذکورہ بالا تصریحات میں کہیں تو ضان کو معز کا مقابل قرار دے کر اور کہیں بتصریح الضان خلاف المعز فرما کر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر ذات الصوف کو ضان کہا جاتا ہے ذات الالیہ ہونا شرط نہیں۔

اور ارباب لغت کی تصریحات اس سے زیادہ اس بارہ میں واضح ہیں قاموس اور اس کی شرح تاج العروس میں ہے۔

والضائن خلاف الماعز من الغنم والجمع ضان ومنہ حدیث شقیق مثل قرّاء ھذا الزمان کمثل ضوائن ذات صوف عجاف (تاج جلد نہم) وقال فی لفظ المعز . فالمعز ذوات الشعور منھا والضائن ذوات الصوف قال اللہ تعالیٰ ومن المعز اثنین . (تاج العروس ص ۸۲ ج ۴)

اور مغرب میں ہے قال الخطابی ولذلک لم تجز اذا کان لا یجزی من المعز اقل من الثنی واما الضان فالجذع منھا یجزی (مغرب ۸۷ ج ۱) اور مخصص میں ہے والضائنۃ منھا ذات الصوف (الی) والماعزۃ ذات العز (ابو عبید) اضان القوم وامعزوا اکثر ضأنھم ۔

اور لسان العرب میں ہے **الضائن من الغنم ذوات الصوف ویوصف به یقال کبش ضائن والانثی ضائنة والضائن خلاف الماعز اه ومثله فی الصحاح والجوهری۔**

اور علماء ہندوستان میں بھی اجلہ علماء نے ضان کا ترجمہ دنبہ اور بھیڑ کو شامل قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلوی نے مظاہر حق میں حدیث مسلم کے ترجمہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

پس ان سب اقسام میں مسنہ ہونا شرط ہے قربانی کے لئے۔ مگر دنبہ اور بھیڑ کا اگر جذعہ بھی ہو تو درست ہے اور جذعہ اس کو کہتے ہیں کہ چھ مہینہ سے زیادہ ہو۔ اور برس روز سے کم۔ مظاہر حق ص۴۹۱ ج۱

اور اشعۃ اللمعات میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اسی حدیث کی شرح میں فرمایا ہے۔

غنم دو صنف است معز کہ آں را بز گویند وضان کہ آں را میش گویند

(ص۶۴۹ جلد اول)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے آیت "ومن الضان اثنین ومن المعز اثنین" کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ از گوسپند دو قسم واز بز دو قسم۔

اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے نر اور مادہ بھیڑ میں سے دو۔ اور بکری میں سے دو۔

اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے اس آیت کے ترجمہ میں فرمایا ہے بھیڑ میں سے دو بکری میں سے دو۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ترجمہ کنز احسن المسائل میں فرمایا ہے ہاں مینڈھا چھ مہینہ سے زیادہ کا قربانی میں درست ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسا ہونہار یا تیار ہو کہ بڑی بھیڑوں میں ملتا ہو (ص ۲۹۰)

اور شیخ نصر اللہ بن محمد ازدی کرمانی نے کنز کے ترجمہ فارسی میں فرمایا ہے واز میش شش ماہ بدہد۔

اور اشراق نوری ترجمہ قدوری میں ہے مگر بھیڑوں میں کہ اس کا جذعہ بھی کافی ہو جائے گا۔

ف فقہاء کے نزدیک جذعہ اس بھیڑ کے بچہ کو کہا جاتا ہے جو چھ ماہ کا ہو ص ۲۱۳۔

عبارات مرقومہ بالا سے واضح ہو گیا کہ ضان کے معنی میں فقہاء اور اہل لغت میں، کوئی اختلاف نہیں بلکہ مفسرین، محدثین، فقہاء، اہل لغت عامۃً اس پر متفق ہیں کہ ضان مطلقاً ذوات الصوف (اون والی) کو کہا جاتا ہے خواہ ذوات الیہ ہوں جس کو اردو میں دنبہ کہتے ہیں یا غیر ذوات الیہ ہوں جس کو بھیڑ یا مینڈھا کہا جاتا ہے۔ البتہ جذعہ کے معنی میں خود اہل لغت کے اقوال مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک قول فقہاء نے لے لیا ہے اس لئے صورت اختلاف کی پیدا ہو گئی۔ اور خود حضرات فقہاء نے اس اختلاف فقہاء اور اہل لغت کو بتصریح بیان فرما دیا۔ جیسا کہ مبسوط وغیرہ کی عبارات مذکورہ میں تصریح موجود ہے۔ بخلاف ضان کے کہ کسی فقیہہ نے کہیں نہیں کہا کہ اس میں فقہاء کے نزدیک اہل لغت کے خلاف کوئی معنی مراد ہیں۔ بلکہ ان کی مطابقت کے الفاظ بہت سے فقہاء سے منقول ہیں (کمافی شرح کنز لملا مسکین وغیرہ) مذکور الصدر تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ صدر الشریعہ نے جو شرح وقایہ میں ”فالضان ما تکون لھا

الیہ'' فرمایا یا علامہ شامی نے بحوالہ منح الغفار ''الضان مالہ الیہ ''فرمایا یہ تفسیر ببعض اقسام توسعاً کی گئی ہے اس کا مفہوم مخالف مراد نہیں ہے۔

کہ جو ذوات الالیہ نہ ہوں وہ ضان میں داخل نہیں۔ اور یہی عبارات شرح وقایہ وشامی کے بعض علماء عصر کے لئے اشتباہ کا سبب ہوگئی۔ جیسے غایۃ الاوتار اور مجموعۃ الفتاویٰ وغیرہ میں ہے۔

ورنہ اگر فقہاء متقدمین کی عبارات اور جمہور محدثین و مفسرین واہل لغت کی تصریحات کے ساتھ ان کو دیکھا جاوے تو عبارات مذکورہ کی توجیہ مذکور متعین معلوم ہوتی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہ

العبد الضّعیف

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۸ر صفر ۱۳۶۲ھ

۹۳

اِسلام میں مشورہ کی اہمیت

تاریخ تالیف ______ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ (مطابق ۱۹۷۶ء)
مقامِ تالیف ______ دارالعلوم کراچی

اسلام میں مشورہ کی بہت اہمیت ہے اس موضوع پر یہ کتاب کئی مرتبہ طبع ہوئی اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ صفحہ نمبر ۳۵۳ تا صفحہ ۴۵۴ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تحریر فرمودہ ہے اور دوسرا حصہ جو صفحہ نمبر ۴۵۵ سے شروع ہو کر آخر صفحہ نمبر ۴۹۴ تک گیا ہے اُسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا ہے۔

آخر میں رسالہ ''استخارہ کی حقیقت'' شامل ہے یہ رسالہ بھی حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب قدس سرہٗ کا تحریر کردہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام میں مشورہ کی اہمیّت

حصّہ اوّل

تحریر: حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

الحمد اللہ الذی ھدانا لھذا وما کنّا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللّٰہ والصّلوٰۃ والسّلام الاتمان الاکملان علیٰ خیر خلقہ وصفوۃ رسلہ خاتم النبیین وقائد الغرّ العالمین سید نا و مولانا محمدو اٰلہٖ وصحبہ اجمعین. اما بعد

آج ہم ایک ایسے مسئلہ سے ابتداء کرتے ہیں جس سے ذوی العقول کے تمام افراد کو بہ فرقِ مراتب سابقہ پڑتا ہے امور خانہ داری سے معاملات مہمۂ سلطنت تک اس سے مستغنی نہیں ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ مشورہ محمود، اور اس کا کاربند ہونا ہلاکت و پشیمانی سے نجات دینے والا طریق صواب کو منکشف کر کے فوز وفلاح تک پہنچانے والا ہے۔ کامیابی اور حصول مقاصد کی کنجی یہی ہے اسی طرح استبداد و استقلال وخودداری کے مضر ومہلک نتائج اور اس کے مزموم وقبیح ہونے سے کونسا مرد ناواقف ہے بالخصوص یہ زمانہ جس کو باصطلاح خود اجتماع ومدنیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس میں تو مشورہ کو اس حد تک پہنچا دیا گیا ہے جس کو دیکھ کر بعض مواقع میں حد سے تجاوز کرنے افراط میں مبتلا ہونے کا حکم لگا دیا جا سکتا ہے۔

عقلاء زمانہ نے اس مسئلہ میں موشگافیاں کر کے اس کے تمام پہلوؤں کو منظر عام پر

لا کر رکھدیا ہے اور اس کے لئے وہ قواعد وضوابط مدون کر دیئے ہیں جن کے بعد اب غالباً اسکا کوئی پہلو قابل بحث وتفتیش نہیں رہا، اور اس اعتبار سے اس مسئلہ پر ہمارا قلم اٹھانا شدید بے سود ہوتا اور تحصیل حاصل سے زیادہ وقعت نہ رکھتا۔

لیکن جب مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ دین اسلام نے تمام مکارم اخلاق اور ملکات فاضلہ کی تعلیم وتلقین کی ہے نوع انسانی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس کے متعلق شریعت غراء نے جامع ومانع مفصل ومشرح دستور العمل بنا کر ہمیں نہ دیا ہو تو ضرورت ہوئی کہ ہم سب سے اول اسی مسئلہ پر قلم اٹھائیں جو ہر ایک بہتری کی کنجی، اور سعادت ونجات کی ضمانت ہے، اور دکھلا دیں کہ شریعت کی جامع تعلیم نے اس نہایت ضروری اہم اور عام مسئلہ کے اصول کی ہم کو کس حد تک تعلیم دی۔ حکماءِ امت نے اس کی جزئیات میں کہاں تک موشگافیاں کیں، اور اہل فہم وادراک نے اس کی کہاں تک پابندی کی ہے۔

ہمارا بیان اس مسئلہ میں تین حصوں اور ایک ضمیمہ پر منقسم ہوگا حصہ اول میں لفظ مشورہ اور شوریٰ کے لغوی معنی اور اس کے اشتقاق کو بیان کریں گے جس سے لغت عرب کی خوبی اور وسعت اس کے الفاظ ومعنی کے باہمی تناسب کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا، اور معلوم ہو جائے گا کہ زبان عرب کے متعلق اہل اسلام کا یہ دعویٰ کہ فصاحت وبلاغت اس کا حصہ ہے کہاں تک مطابق واقع ہے، حصہ دوم میں شوریٰ کی غرض وغایت، منافع ونتائج، قرآن وحدیث سے مشورہ کا حکم اور اس کی فضیلت، مشورہ کے شرائط، امور مشورہ، طلب کی تقسیم وتفصیل سلف کے اقوال سے، استبداد وخود رائی کے نقصان ومفاسد بیان کئے جائیں گے، اور یہ بھی دکھلایا جائے گا کہ درصورت اختلاف صورت فیصلہ کیا ہونی چاہیئے۔ حصہ سوم میں حکماء امت اور عقلاء متقدمین کے اقوال اور اس کے پہلوؤں کی تنقیح وتوضیح اور خلفاء اسلام وسلاطین کے مشاورات کے چند واقعات ذکر کئے جائیں گے۔ ضمیمہ میں استخارہ مسنونہ کی بحث کی جائے گی۔

حصہ اوّل

زبان عرب میں چند الفاظ کا استعمال اس بارہ میں ہوتا ہے۔

۱)......مشورہ۔

۲)......شوریٰ۔رائے دینا۔

۳)......مشاورة باہم رائے زنی کرنا۔

۴)......اِسْتِشَارَہ۔

رائے طلب کرنا یہ الفاظ ہیں جو خاص طور پر اور رائے زنی کے موقع میں بولے جاتے ہیں ایک لفظ اور بھی ہے جس کا استعمال مخصوص اس بارہ میں نہیں ہے بلکہ صلہ کے بدلنے سے اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔اور وہ لفظ اشارہ کے صلہ میں الیٰ آتا ہے تو اس کے معنی محض کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے ہوتے ہیں اور اگر علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی مشورہ دینے کے ہوجاتے ہیں، رہی وجہ اس کی کہ اشارہ کے بعد الیٰ یا علیٰ کے آنے سے اس کے معنی کیوں بدلتے ہیں تو اس کو ہم آگے بیان کریں گے۔ یہ پانچوں الفاظ اگرچہ باعتبار صیغوں اور باب کے مختلف ہیں۔مگر ماخذ اور موضعِ اشتقاق ان کا ایک ہے ان سب کی اصل شور ہے۔

ارباب فہم ودانش یہ معلوم کرکے بہت ہی مسرور ہوں گے کے مشورہ مشاورہ سے جو اصلی غرض ہے کہ چند مختلف ضعیف وقوی، صحیح ومنتج رائے اور قول مخلصانہ وغیر مخلصانہ اقوال اور ایوان سے ایک عمدہ منتج رائے اور قول حاصل ہوجاوے۔اور وہ صحیح رائے ذریعہ خرابیوں اور تباہیوں سے محفوظ رہنے اور مقاصد میں کامیابی وفلاح کا بن جائے اس کالحاظ ان الفاظ کے اشتقاق اور ترکیب میں پوراپورا ملحوظ ہے۔

شَودر۔چھتہ میں سے شہد نکالنے کو کہتے ہیں۔شَارَیَشُور اس کا ماضی مضارع

آتا ہے کہتے ہیں شُرتُ العَسَل میں نے شہد کو نکالا مشوارہ اور شورہ آلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے شہد نکالا جاتا ہے۔ مشورہ اور شورہ اس موقع کو کہتے ہیں جہاں شہد کی مکھیاں شہد جمع کرتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ شہد جو ایک شیریں مفید اور نافع چیز ہے جس کو باری تعالیٰ نے شفاء للناس (وہ لوگوں کے لئے شفاء امراض ہے) فرمایا ہے جو دواء وغذا ہونے کی حیثیت سے تمام دنیا میں محبوب ومطلوب اور محتاج الیہ ہے مکھیوں کے چھتہ میں ان کے زہر آلود ڈنکوں میں گھرا ہوتا ہے اور شہد کے نکالنے والے ان تکالیف کا مقابلہ کر کے اس کو بمشکل نکالتے ہیں لفظ شور سے ہی شَارہ وشوُرہ نکلے ہیں اور ان کے معنی حسن صورت عمدگی اور اچھی ہیئت ووضع کے ہیں حدیث میں آیا ہے

ان رجلا اتاہ وعلیہ شَارَۃٌ حَسَنَۃٌ

ایک شخص آپ کی خدمت میں بدیں حال حاضر ہوا کہ اس کا لباس اچھا تھا اس کی ہیأت وحالت اچھی تھی) عرب میں بولتے ہیں فلان حسن شورہ فلاں شخص اچھی ہیبت والا ہے فلان حسن شورہ (فلاں شخص اچھے لباس والا ہے)۔

گھوڑے وغیرہ جانوروں کو فروخت کے لئے خریداروں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور خریدار اس کو آگے پیچھے سے اوپر نیچے سے اچھی طرح دیکھتا اور اس کے ایک ایک عضو کو ٹٹولتا ہے اس کو بھی شور کہتے ہیں۔ فوجی گھوڑے آزمائش اور امتحان کے لئے میدان میں جمع کئے جائیں اس کو بھی شور کہتے ہیں اور جس جگہ یا جس میدان میں گھوڑے وغیرہ فروخت یا آزمائش کے لئے پیش کئے جائیں اس کو مشوار کہتے ہیں۔

غرض شَوْرا اور اس سے جو الفاظ بنائے گئے ہیں ان میں شیرینی، حسن، اور انتخاب کے معنی ہر جگہ موجود ہیں انتخاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہتر سے بہتر چیز کو جس میں ایسے عیب نہ ہوں جن کی وجہ سے چھوڑ دینے کے قابل سمجھی جائے پسند کیا جاتا ہے۔

مشورہ ۔ شوری ۔ استشارہ ۔ مشاورہ ۔سب الفاظ شور سے بنائے گئے ہیں ۔اوران میں اصل معنی مصدر اوراس کے تمام استعمالات جس قدر ہیں ملحوظ رکھے گئے ہیں ظاہر ہے مشورہ کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اچھی بری صحیح اور غلط کاریوں سے بہترین اور مثمر اور منتج رائے کا انتخاب کرلیا جائے ۔اورظاہر ہے کہ جورائے ہر قسم کی رایوں سے منتخب کی جائے گی محبوب ومرغوب طبع حسن اور پسندیدہ ہوتی ہے اور جیسا کہ شہد تمام امراض سے شفاء کا کام دیتا ہے ۔اچھی اور نیک رائے بھی مہلکات سے نجات دینے والی منزل مقصود تک پہنچانے والی اور ندامت وافسوس سے محفوظ رکھنے والی ہوتی ہے۔

ناظرین ہمارے اس مختصر بیان سے زبان عرب کی وسعت اس کی لطافت وخوبی، الفاظ ومعنی کی مناسبتوں کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں ۔یہی وہ خصوصیت ہے کہ دنیا کی کوئی زبان، کسی قوم کا لغت اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

رہا لفظ اشارہ جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔اس کا استعمال کسی شے کے بتلانے اور رائے دینا دونوں معنی میں آتا ہے ۔مگر لغت عرب کے واضع نے اس میں بھی اسی باریکی اور لطافت سے کام لیا ہے جو زبان عربی کا خاصہ ہے ۔حروف میں سے حرف الی کے معنی منزل مقصود تک پہنچا دینے یا متوجہ کر دینے یا کسی چیز کو بتلا دینے کے ہیں ۔اور علیٰ کے معنے لازم وواجب کر دینے کے آتے ہیں ۔عربی زبان میں اگر **اشار الیہ** بولتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ فلاں چیز کی طرف اشارہ کر دیا اس میں وجوب عمل کی طرف ایماء نہیں ہوتا برخلاف اشارہ علیہ (اس کو مشورہ دیا) اس میں یہ معنی ضرور ملحوظ ہیں کہ جس کو مشورہ دیا گیا ہے اس کو عمل کرنا ایک حد تک ضروری اور لازم قرار دیا گیا ہے ۔حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب قاتل ہرمزان کے بارہ میں مشورہ طلب کیا تو ارشاد فرمایا:۔

اشیر واعلی فی هذاالرجل الذی فتق فی الاسلام مافتق

(مجھے اس شخص کے بارہ میں جس نے اسلام کے اندر اتنا بڑا رخنہ ڈالا مشورہ دو)

الفاظ بتارہے ہیں کہ آپ ایسی رائے طلب کرتے تھے جس پر عمل فرمادیں۔ اور ظاہر ہے کہ جبکہ ایک جماعت سے کسی معاملہ میں رائے طلب کی جاتی ہے تو ہر شخص اپنی رائے کو واجب العمل سمجھ کر پیش کرتا ہے اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ اکثر وبیشتر اس رائے پر عمل نہ کرنے سے مشیر کو ملال یا کبیدگی ضرور ہوتی ہے۔ گو عقل ونقل کے قاعدہ سے اس کبیدگی یا ملال کے اظہار یا اس پر جمود کا کوئی حق نہیں ہے۔ لغتہ کی تحقیق میں جس قدر لکھ دیا گیا ہمارے نفسِ مدعا کے لئے کافی ہے اس سے زیادہ کی اس موقع میں گنجائش نہیں۔

حصّہ دوم ۲

مشورہ کا حکم اس کی ضرورت غرض وغایت نتائج وفوائد

مشورہ کی غرض وغایت انسان کو مہلک اور برباد کرنے والی غلطیوں سے محفوظ رکھنا معاملات کی اصلاح اور نظام عالم کو ایسی ترتیب پر قائم رکھنا ہے جو مختلف القویٰ، متفاوت العقول کے باہم اجتماع کے مناسب ہو جبکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ انسان کے تمام افراد باعتبار عقل کے مساوی نہیں ہیں بلکہ ان کی عقول میں اس قدر تفاوت ہے کہ ایک اگر اپنی مافوق الفطرۃ عقل وتمیز اور ادراک وشعور کی وجہ سے ابناء جنس میں حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو دوسرا اس درجہ نیچے گرا ہوا ہے جس کو بمشکل حیوانات اور غیر ذوی العقول سے جدا کرسکتے ہیں۔ ان کے افعال واطوار اور بہائم کے طبعی وخلقی افعال میں بہت ہی کم فرق محسوس ہوتا ہے۔

اور یہ بھی مسلم ہے کہ عقل انسانی باعتبار اصل فطرۃ کتنی ہی بلند واقع ہوئی ہو مگر اس کا نشو ونما اس کی ترقی اور ارتقاء کا آلہ حقیقی تجربہ اور ممارستہ معاملات ہے دانشمند سے دانشمند بھی بلا تجربہ ناقص اور اس کی رائے غیر قابل قبول ہوتی ہے۔ وہ اپنی عقل سے خطاء وصواب کے راستے بے شک بتلاتا ہے لیکن جو باتیں تجربہ کے متعلق ہوتی ہیں وہ بغیر عالم

کے تغیرات اور واقعات وحالات پر فلسفیانہ وحکیمانہ نظر ڈالے حاصل نہیں ہوتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک خود مبتلا ہو کر سرد وگرم سے واقف نہ ہو جاوے ہرگز اس کی رائے صائب نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک نہایت دانشمند وزیرک فنون جنگ کی کتابوں کا عالم وحافظ بلکہ کسی مکتب حربیہ کا پروفیسر یا پرنسپل میدان جنگ سے دور دراز بیٹھے ہوئے معرکہ آرائی کی تدبیریں بتلاتا ہے اور ہر ایک نشیب وفراز سے آگاہ کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جو دانائی وفراست، علم ومطالعہ کتب میں اس کا ہم پلّہ نہیں ہے مگر عمر بھر اس کی میدان جنگ میں گزری، ادنیٰ سپاہی سے جرنیل کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہزاروں معرکوں کا مشاہدہ کیا۔ کبھی محصور ہوا، کبھی محاصرہ کیا، کبھی حملے کئے، کبھی مدافعانہ قوت دکھلائی کبھی وسیع میدانوں میں کوچ کیا کبھی تنگ پیچ دار گھاٹیوں سے لشکر کو صحیح وسالم نکال کرلے گیا۔ کبھی دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر ہلاکت کے کنارہ پہنچ گیا۔ ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ گو اول الذکر شخص دانش وعقل میں کتنا ہی بڑھا ہوا ہے اور اس فن کے مصنفات میں کتنی کچھ تدابیر ہر موقع کی موجود ہوں جس کا وہ حافظ اور نکتہ شناس ہے۔ مگر اس کی تدبیر ورائے کو اس دوسرے شخص کی رائے وتدبیر کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں ہو سکتی اور نہ ویسی قدر وقیمت۔ ایک ہی صورت کی تدبیر مختلف ہوتی ہیں لیکن موقع کی اہمیت کا اندازہ اور پھر اس کی مناسب تدابیر کا اختیار کرنا صرف تجربہ کے متعلق ہے اور اگرچہ فن کی تصنیفات بھی انہیں آزمودہ کاروں کے برسوں کے تجربات کا مجموعہ ہے لیکن پھر بھی تجربہ ہمیشہ نئی نئی صورتیں دکھلاتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں علم بغیر عمل کے یقیناً ناقص ونا تمام رہتا ہے، یہی وہ مضمون ہے جس کو حضرت رسول کریم علیہ افضل الصلوٰت والتسلیم نے اپنے جوامع الکلام میں ارشاد فرمایا ہے۔

لاحليم الاذو عثرة ولاحكيم الا ذو تجربة

(دانشمند وبردبار وہی ہے جس نے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہوں۔ اور حکیم وہی شخص

ہے جس نے بہت سے تجربہ کئے ہوں) لفظ حلیم حِلم بکسر الحاء بمعنی دانش وعقل سے مشتق ہے آپ کا حصر کے ساتھ ارشاد فرمانا کہ دانشمند صرف وہی ہے جس نے تجربے کئے ہوں، ٹھوکریں کھائی ہوں صاف بتلاتا ہے کہ بغیر لغزشوں کے آدمی پختہ کار نہیں ہوتا اس کے اخلاق وملکات ناقص ونا تمام رہتے ہیں۔ اور اگر حِلم کو تحمل وبردباری کے معنی میں لیا جائے تب اس ارشاد میں ایک دوسرا مدعیٰ ثابت ہوگا جو اپنی اہمیت وصحت میں معنی اول کے ہم سنگ اور جس سے آپ کے ارشادات کا جوامع الکلام ہونا اور روشن ہو جائے گا یعنی کسی شخص میں اصل فطرۃ سے اگر چہ حلم وبروباری موجود ہو لیکن اس کو ایسے مواقع اور واقعات سے سابقہ نہیں پڑا جن سے ان کے تحمل کے عمق اور بردباری کی تہ کا اندازہ ہو سکے ایسے شخص کو حلیم اور بردبار نہ کہنا چاہیئے۔ حلیم وہی شخص ہوسکتا ہے جو کڑی سے کڑی بات پر بھی جنبش نہ کرے چیں بجبیں نہ ہو۔ اور درحقیقت یہ حالت بغیر تجربہ اور ٹھوکریں کھائے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بہت سے شخص دیکھنے میں کوہِ وقار معلوم ہوتے ہیں لیکن چھوٹے سے خلاف طبع کا تحمل انھیں وشوار ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو بڑے سے بڑے معاملہ میں تحمل کر لیتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی چھوٹے اور غیر معتد بہ امر میں اپنی حالت سے نکل جاتے ہیں پھر معاملات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اس لئے تجربہ ایسی چیز ہے جو حلیم کو حقیقی حلیم بناتا ہے

حضرت [1] امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حلم وعفو میں مشہور ہیں آپ فرمایا کرتے ہیں مجھے شرم آتی ہے کہ دنیا میں کوئی قصور ایسا ہو جس کو میرا حلم شامل ومحیط نہ ہو سکے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ اور افتخار غالباً قابل التفات وتصدیق نہ ہوتا اگر انھیں پر بعض واقعاتِ عظیمہ نہ گزرتے جن سے ان کی کوہ وقاری کا تجربہ ہوا ایک مرتبہ امیر معاویہ اور حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں ناخوشی کی گفتگو ہوگئی حضرت عقیل کبیدہ خاطر ہو کر اُٹھ

(۱)..... مستطرف جلد اوّل صفحہ ۱۲،۶۸

گئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معذرت میں خط لکھا جن کا حاصل یہ تھا کہ تم قصی بن کلاب (جد اعلیٰ قریش مکہ) کی شاخیں عبد مناف (ہاشم کے والد ماجد) کے جوہر اور مغز ہاشم (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا) کے برگزیدہ فرزند ہو تمہارے کوہ وقار اخلاق اور بلند فطرت عقلیں کیا ہوئیں۔ مجھے اس بات کا بہت ملال ہے جو معاملات باہم پیش آئے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ قبر میں دفن ہونے تک کبھی ایسی بات پیش نہ آئے گی اس کے جواب میں حضرت عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دو شعر لکھ کر بھیج دیئے۔

صدقت وقلت حقا غير انّي ارى ان لااراك ولاترانى
ولست اقول سوءً في صديقي ولكنّي اصدُّ اذاجفا نى

تم نے بالکل سچ کہا مگر میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ نہ میں تمہاری صورت دیکھوں نہ تم میری۔ میں اپنے دوست کی کوئی برائی کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں جب وہ میرے ساتھ جفا کرتا ہے تو میں اعراض کر کے بیٹھ رہتا ہوں۔

ان اشعار کو دیکھتے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچے اور جس قدر ممکن تھا معذرت و ملاطفت کی اور قسمیں دیں کہ آپ اپنے اس خیال کو چھوڑ کر اصلی حالت پر آجائیں انجام یہی ہونا تھا کہ وہ راضی ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ لغزش نہ ہوتی اور وہ دوستانہ انداز میں نہ کہ بر بناء زعم سلطنت ناگوار کلمہ نہ کہہ گزرتے تو آئندہ ایسے امور سے محترز رہنے کی تنبیہ ان کو نہ ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی کچھ زمین ایک موقع پر تھی اور اس کے متصل ہی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھی تھی۔ امیر معاویہ کے ملازموں اور کار پردازوں نے غالباً قوت خلافت کے بھروسہ ان کی زمین پر تصرف کرنا شروع کر دیا۔ جس پر ناراض ہو کر انھوں نے ایک خط امیر معاویہ کو بدیں مضمون لکھا کہ آپ اپنے نوکروں کو منع کر دیجئے کہ میری زمین پر تصرف نہ کریں۔

والا کا ن لی و لک شان

نہیں تو جو کچھ میرے آپ کے درمیان پیش آئے گا معلوم ہو جائے گا۔ یہ تہدید آمیز خط ایسا نہ تھا جس میں کسی صاحب سلطنت وقدرت کو غیظ وغضب نہ آتا چنانچہ آپ نے اپنے بیٹے یزید کو دکھلا کر مشورہ کیا تو اس نے کہا میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ایسا عظیم الشان لشکر بھیجیں جس کا ایک سرا ان تک ہو تو دوسرا آپ کے پاس اور حکم دیجئے کہ ان کا سر اتار کر لائیں بیٹے کی یہ رائے سن کر بردبار باپ نے کہا نہیں بیٹا ایک اور بات اس سے بھی بہتر ہے۔ پھر قلم اور کاغذ اٹھا کر جوابِ خط لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا میں نے حواری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کا خط دیکھا جس کو دیکھ کر مجھے اسی قدر صدمہ ہوا جتنا ان کو آپ کی رضامندی کے مقابلہ میں ساری دنیا کی حقیقت بھی میرے نزدیک کچھ نہیں۔ میں نے اپنی زمین کو بالکل چھوڑ دیا وہ بھی آپ ہی کی ہے۔ اس جواب کے پہنچتے ہی عبداللہ بن زبیر کا غیظ وغضب یک لخت بدل گیا اور بجواب اس کے لکھا امیر المؤمنین کے جواب پر مطلع ہوا۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک باقی رکھے۔ اور جن اوصاف نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے وہ زائل نہ ہوں۔ آپ نے یہ خط پڑھ کر یزید کو دیا اور فرمایا جو شخص عفو کا خوگر ہوتا ہے سردار بن جاتا ہے اور جو بردباری کرتا ہے اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور جو درگذر کرتا ہے لوگ اس کی طرف جھک جاتے ہیں۔ تم کو جب ایسی مشکلات میں مبتلا ہونے کی نوبت آئے۔ تو اس کی یہی تدبیر ہے۔

ظاہر ہے کہ عبداللہ بن زبیر میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ دوسری جانب ایسا سامان موجود تھا کہ اشارہ میں کام تمام ہو جاتا۔ سارے جھگڑے مٹ جاتے۔ مگر ایسے ہی وقت ثابت قدم رہنا عقل و بردباری کا ثبوت دے سکتا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ عبداللہ بن زبیر باوجود اس سخت منافرت اور خلاف کے نرم ہو گئے۔

(۱)...... مستطرف جلد اوّل صفحہ ۱۶۸۔۱۲

احنف (۱) بن قیس حلم و برباری میں ضرب المثل ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھے تکلیف پہنچاتا ہے یا سب وشتم سے پیش آتا ہے تو میں اس کے بارے میں غور کرتا ہوں اگر اس کا مرتبہ مجھ سے بڑا ہے تو اس کی بزرگی جواب سے مانع ہوتی ہے، اگر ہم رتبہ ہے تو اس پر مہربانی کرتا ہوں۔ اگر کم درجہ ہے تو اس کے مقابلہ کو اپنی حقارت سمجھتا ہوں۔

ایک مرتبہ وہ ہنڈیا پکار ہے تھے، ایک شخص نے کہا کہ یہ ہنڈیا بندر کی ہتھیلی کے برابر ہے نہ کسی مانگنے والے کو عاریتاً دی جاتی ہے نہ جو اس میں سے کھائے اس کو چکناہٹ حاصل ہوتی ہے احنف نے سن کر کہا اگر یہ شخص چاہتا تو اس سے اچھی بات کہہ سکتا تھا۔

احنف کا مقولہ ہے کہ حلم و بردباری میں جو ذلت مجھے پہنچتی ہے اس کے مقابلہ میں اگر سرخ اونٹ (سرخ اونٹ عرب میں نہایت عزیز تھے) مل جائیں تو مجھے ہرگز پسند نہیں ہے۔

احنف سے کسی نے پوچھا کہ تم نے حلم و برباری کو کس سے حاصل کیا کہا قیس بن عاصم سے، ہم ان سے حلم و بردباری سیکھنے اس طرح جاتے تھے جس طرح علماء کی خدمت میں فقہ حاصل کرنے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم ان کی خدمت میں حاضر تھے کہ لوگ ان کے بھائی کو مشکیں باندھے ہوئے لائے اور کہا اس نے اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ قیس کچھ بات کر رہے تھے۔ یہ سن کر نہ سلسلہ کلام منقطع کیا، نہ چہرہ پر تغیر ہوا، جس طرح بیٹھے تھے اسی وقار سے بیٹھے رہے اور جب گفتگو ختم کر چکے تو فرمایا۔ تم نے میرے بھائی کو خوف زدہ کر دیا۔ اور پھر اپنے دوسرے بیٹے کو بلا کر کہا کہ بھائی اپنے چچا کو کھول دو۔ اپنے بھائی کو دفن کر دو۔ اور مقتول کی والدہ کو دیت میں سو اونٹ دیدو۔ وہ غریب الوطن ہے شاید اسی طرح اس کو تسلی ہو جائے۔

حلم بردباری کرنا سہل ہے۔ معمولی مجرموں سے درگذر بھی آسان ہے تھوڑا بہت نقصان گوارا کر لینا بھی دشوار نہیں ہے۔ مگر امتحان کا وقت یہی تھا کہ لخت جگر قتل کر دیا جائے۔ اس کی لاش سامنے لا کر ڈالی جائے اور پھر عقل وحواس بجا رہیں۔ غضب و جوش انتقام کو حرکت نہ ہو۔ قیس کو معاف کر دینے کا حق شرعاً حاصل تھا، مگر جہاں ایک طرف بھائی

کے ساتھ سلوک کیا تو دوسری طرف غریب ماں کی دلجوئی میں بھی کمی نہ کی اور اپنے مال سے سو اونٹ دیت کے دیدیئے۔ یہ ہیں وہ اخلاق اور ملکات جن پر کوئی قوم فخر کرسکتی ہے۔

یہاں تک ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کے ایک حصہ **لاحلیم الاذو عثرۃ** کے ایک پہلو کو واضح کرنے کے لئے استطرادًا یہ چند واقعات نقل کردیئے ہیں کیونکہ وہ ناظرین کے واسطے دلچسپی سے بھی خالی نہ تھے۔ اب ہم ارشاد مبارک کے دوسرے حصہ **لا حکیم الاذو تجربۃ** کی طرف بالخصوص متوجہ ہوتے ہیں یہ دوسرا جملہ صاف بتلارہا ہے کہ صاحب عقل سلیم وفطرت بلند ورائے صائب بلا تجربہ کے حکیم کا رتبہ نہیں پاسکتا۔ حکیم وہی شخص ہوسکتا ہے جو عاقل کامل کے ساتھ تجربہ کار اور سرد وگرم چشیدہ ہو اور یہی ہمارا مدعا تھا کہ عقل کے ارتقاء کا حقیقی آلہ تجربہ ہے۔

جملہ اولیٰ **لا حلیم الا ذو عثرۃ** میں جو دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ جملہ ثانیہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ ان میں سے حلم کو بمعنی بردباری وتحمل لینا زیادہ موزوں ہے۔

اور یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ تمدن کا مدار تعاون تناصر (باہم امداد ومعاونت یا مددگاری) پر ہے۔ وحشی اور تمدن کے درمیان فرق ہے تو یہی ہے کہ وحشی جیسا کہ خود اپنے تمدن واسباب معیشت میں دوسرے کے کام میں بھی کم آتا۔ بہائم حقیقی وحشی ہیں ان میں بہت کم رابطہ انس وتعلقات ہوتے ہیں۔ اور جو ہوتا ہے وہ بھی طبعی ہوتا ہے عقلی واختیاری نہیں۔ انسان کو بہائم سے تمیز ہے تو یہی ہے کہ اس میں فطرۃً انس ومحبت امداد واستمداد کا مادہ ودیعت رکھا گیا ہے۔ اور یہ جو امداد واستمداد کا مادہ ودیعت رکھا گیا ہے معاش ومعاد میں داخل ہے۔ دنیا میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ رعیت اور عالِم سے لے کر جاہل کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو دوسرے کی احتیاج نہ ہو۔ بلکہ جس قدر بڑے رتبہ کا ہوتا ہے اتنا ہی دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ مخلوق میں انسان سب سے زیادہ محتاج اور دست نگر ہے۔ انسان کے طبقات میں جو سب سے اعلیٰ شمار ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ مقید اور محتاج ہیں۔ انسان کے تمام اچھے اور برے حالات ومعاملات اس کی نیک نامی وبدنامی، آبادی

و بربادی، نجات و ہلاکت، افعال اور اقوال پر ہے۔ دنیا میں بہت ہی کم ایسے نادان وکودن ہیں جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو تباہی و بربادی میں ڈالیں یا جو اپنے لئے بہبودی اور فلاح کی فکر نہ کریں۔ لیکن باوجود اس کے کہ آدمی اپنے نفس کا ساری دنیا سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ پھر اس سے با اختیار خود ایسے افعال کیوں صادر ہوتے ہیں۔ جن کے انجام جان و مال، عزت و آبرو کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تباہ و برباد ہوتا ہے۔ ندامت و پشیمانی۔ ذلت و رسوائی جدا حاصل ہوتی ہے۔ صرف رائے کی غلطی سے کبھی مضر و مفید کے انتخاب میں غلطی ہوتی ہے۔ کبھی واقعات کے اسباب میں اشتباہ پڑ جاتا ہے۔ کبھی صحیح تدبیر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ کبھی ایک ہی واقعہ کے بہت سے اسباب اور ایک ہی معاملہ کی بہت سی تدابیر ہوتی ہیں اور سب بجائے خود صحیح و منتج بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی خاص تدبیر کو اختیار کرنے میں اشکال پیش آتا ہے۔ خود باوجود دانشمند، زیرک ہونے کے متحیر ہو جاتا ہے غرض بہت سے وجوہ پیش آتے کہ ہیں تنہا اس کی رائے فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اگر ایسے مواقع میں اپنی رائے پر اعتماد کر کے کچھ کر بیٹھتا ہے تو ناکام ہوتا ہے۔ ہم چشموں میں ذلت ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی بڑے یا چھوٹے کام کو شروع کرنے سے پہلے رائے صحیح کا منقح کر لینا نہایت ضروری امر ہے۔ متنبی کہتا ہے۔

الرّأی قَبْلَ شَجَاعَةِ الشُجْعَانِ هُوَاَ وّلٌ وَ هِيَ الْمحلُّ الثانِيُ

رائے بہادروں کی شجاعت سے بھی پہلے ہے اس کا درجہ اول ہے اور شجاعت کا درجہ بعد میں۔

یہ شاعر بتلاتا ہے کہ شجاعت جو حقیقت میں اعضاء کے متعلق ہے اور جس میں تہور، دلیری اور ناعاقبت اندیشی سے کام چلتا ہے اس کا مدار بھی رائے پر ہے اگر کم عقلی اور بے تدبیری سے کوئی شخص اپنے کو دشمنوں کے نرغے میں پھنسا دے۔ اور گو اس وقت وہ داد شجاعت دیکر جان دیدے یا سب سے جان لیکر سالم بچ جائے لیکن اس کو حقیقی شجاعت نہیں کہتے اصل شجاعت یہی ہے کہ مشغول کارزار ہونے سے پہلے دشمن کو اپنی تدبیر و حیلہ سے

شجاعت دے اور عین معرکہ میں وہ تدبیر اختیار کرے جو سیف و سنان سے زیادہ مؤثر کار گر ہوں الحرب خدعۃ اور جیسا کہ انسان کو اپنے تمام معاملات میں دوسروں سے امداد و استمداد کی حاجت ہے رائے میں دوسروں سے امداد کا محتاج ہوتا ہے اور جبکہ مشورہ اور تبادلہ خیالات سے ایک معاملہ کے تمام پہلو روشن واضح ہو گئے۔ اس کے متعلق تمام تدابیر کا علم ہو گیا اور پھر باہمی مشورہ سے وہ تدبیر بھی متعین کر دی گئی جس کا استعمال اس وقت مناسب ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسی حالت میں بہت کم ان غلطیوں میں مبتلا ہوتا ہے جو ناکامی کا سبب بن جاتی ہیں۔ بلکہ اکثر بیشتر یہ شخص اپنے مدعا میں پورا پورا کامیاب اور فائز المرام ہوتا ہے۔ اور اگر احیاناً باوجود بہتر سے بہتر تدبیر کرنے کے حصول مدعا میں کامیاب نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بہت سے ذوی العقل بھی مل کر صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں۔ انسان کتنا ہی زیرک دانشمند تجربہ کار سرد گرم چشیدہ ہو مگر علم غیب اسکو نہیں ہے جس سے وہ یقیناً کسی نتیجہ کے وقوع پذیر ہونے کا حکم لگا سکے۔ (معہذا) انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے عقل رسا اور تجربۂ تام کی وجہ سے معاملہ کے صحیح اسباب بتا دیئے مگر ہر سبب کا منتج ہونا خود یقینی نہیں ہے۔ باوجود ناکامیاب ہونے کے بھی یہ شخص اس ندامت و پشیمانی سے محفوظ رہتا ہے جو خودرائی کے بعد ہو سکتی ہے۔ اور اس قسم کے طعن و تشنیع کی زد سے بالکل بچ جاتا ہے جس کا درصورت عدم مشورہ ابناء زمانہ کی طرف سے پیش آنا ضروری تھا۔ سب سے بڑھ کر کہ جن دانشمند بزرگوں اور ہوشمند تجربہ کاروں کے مشورہ پر کاربند ہو کر کام کیا تھا۔ غیر کامیابی کی صورت میں وہ اس کے بہت زیادہ ممد و معاون بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی ممکن سے ممکن کوشش اس کے کامیاب کرنے میں صرف کر ڈالتے ہیں اور اگر اس معاملہ خاص میں آخر تک ناکامی رہے تو جبر نقصان کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں گویا اس شخص نے محض اپنی فلاح و بہبودی کے لئے مشورہ کر کے ایک بھاری لشکر اپنی امداد و معاونت کے لئے تیار کر لیا جو ہر وقت ہر پہلو سے اس کی امداد کو آمادہ ہے۔

خلاصہ ہماری تمام معروضات کا یہ ہے کہ متمدن دنیا میں انسان کے اپنے تمام

معاملات کی اسلاحی و بہبودی کا مدار رائے صحیح پر ہے رائے میں امداد و استمداد کا مسئلہ سب سے اہم اور واجب العمل ہوگا۔ گویا اساس تمدن مشورہ پر ہے۔ اور عالم کی صلاحیت، اس کی آبادی، اس کی رونق و شادابی کا مدار تبادلہ آراء و خیالات پر ہے اور پھر اس کا کوئی پہلو فوائد و نتائج مفیدہ سے خالی نہیں ہے۔

مشورہ کا حکم اور اس کی فضیلت

جب یہ معلوم ہوگیا کہ تمدن کا لازمی جز و استشارہ و مشاورت ہے۔ عالم کی اصلاح کا مدار اسی پر ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ شریعت اسلامی نے جو انسان کی ہر حالت میں رہبر اور ہر قسم کی فلاح و بہبود کی متکفل ہے اس مسئلہ کی نسبت کیا حکم دیا ہے اور اس کی خوبیاں کس حد تک ذہن نشین کیں ہیں۔ اس بارہ میں ہم اول نصوص قرآنی معہ تفسیر متعلقہ آیات اور پھر روایاتِ احادیث اور پھر اقوالِ صحابہ وسلف امتہ مرحومہ بیان کریں گے۔

نصوص قرآنی

نص اول: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ.

خدا کی بڑی رحمت سے تم ان کے لئے نرم بن گئے۔ اور اگر تم کج خلق سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے متفرق ہو جاتے ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے استغفار کرو معاملہ میں ان سے مشورہ کرو۔ لیکن جب عزم کر چکو تو خدا پر بھروسہ کرو اور اللہ تعالیٰ متوکلوں کو دوست رکھتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض بعثت و رسالت ادا کرنے اور گمراہوں اور بھٹکے ہوؤں کو

ہدایت کرنے اور راہ راست پر لانے کے لئے ملاطفت، نرم خوئی، درگزر اور حسن اخلاق کی ضرورت ہے تا کہ ناواقف حسن اخلاق اور ملاطفت کی وجہ سے آپ کے گرد جمع ہوں اور آپ کے فیض صحبت اور ارشادات سے متمتع ہوکر پختہ کار مسلمان بن جائیں۔ اور اس کے برخلاف آپ کے اخلاق میں نرمی نہ ہوتی، آپ ناواقفوں اور جاہلوں کی اکھڑپن کو برداشت نہ کرتے، خلاف شان اور خلاف ادب کسی ایک لفظ یا حرکت پر دار وگیر و مواخذہ فرماتے، آپ دشمن تو دشمن دوستوں کی نامناسب حرکات کا تحمل نہ فرماتے، یا آپ سخت دل ہوتے آپ میں شفقۃ علی الخلق کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہوتی تو یہ مقبولیت عامہ مخلوق کا یہ اجتماع اور یہ جان نثاری حاصل نہ ہوتی بلکہ جب لوگ یہ دیکھتے کہ آپ بھی مثل اور انسانوں کے معاملہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں۔ درگذر فرمانا اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانا نہیں جانتے تو اول تو اس قسم کی گرویدگی حاصل ہی نہ ہوتی اور نہ لوگ آپ کے گرد جمع ہوتے اور جو ہوتے بھی تو وہ انداز وطرز کو دیکھ کر الگ ہوجاتے وہ خود ہلاکی تباہی کے گڑھے میں گرتے اور بعثت کا مقصود حاصل نہ ہوتا اور جب یہ بات ہے تو آپ کے حقوق اللہ میں جو کمی واقع ہو اس کے بارہ میں استغفار کرنا چاہئے۔ اور ان سے معاملات میں مشورہ کرتے رہنا چاہیے۔

ارشاد مذکورہ بالا سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ فرمانے کا حکم ہے اور یہیں سے مشورہ کے منجملہ ضروریات ہونے کے تنقیح بھی ہوگئی کہ جب خود جناب رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجودیکہ آپ نزول وحی کی وجہ سے مستغنی تھے یہ حکم ہے تو مسلمانوں کا اور کوئی فرد خواہ کسی درجہ ورتبہ کا ہو کیسے حکم سے مستغنی ہوسکتا ہے، ہر شخص کے ذمہ ہے کہ تمام ایسے امور کے اندر جن میں صواب وخطا میں اشتباہ ہو مشورہ کرے۔

لیکن آیت کے متعلق چند مباحث ہیں جن کی تنقیح وتحقیق ضروری ہے جس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ حکم مذکور کی تنقیح وتوضیح بھی بخوبی ہوجائے گی۔

مبحث اول: ۔صحابہ سے مشورہ لینے کا حکم کس بنا پر تھا۔ اکثر حضرات فرماتے

ہیں کہ مشورہ کی جو اصل غرض ہوتی ہے یعنی تعین رائے صائب وصحیح وہی ہے ہوتی تھی۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔

اَنَّ رسو ل اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لابی بکر وعمر لو اجتمعتما فی مشورۃ ماخالفتکما. (الا مام احمد عن عبدالرَّحمٰن بن عمر)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ارشاد فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ پر متفق ہوجاؤ تو میں خلاف نہیں کروں گا۔

نیز ترمذی وغیرہ کتب میں مروی ہے کہ جب آیت شریفہ

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَانَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوَاکُمْ صَدَقَةً .

اے ایمان والو جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہو تو سرگوشی سے پہلے خدا کی راہ میں کسی قدر خیرات دیا کرو۔

نازل ہوئی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا کتنا صدقہ ہونا چاہیے۔ ایک دینار تو حضرت علی نے جواب دیا یہ تو بہت زیادہ ہے مسلمان اس کے متحمل نہ ہوں گے۔ فرمایا نصف دینار جب بھی یہی جواب دیا یہ تو بہت زیادہ ہے ارشاد فرمایا تو پھر کیا ہونا چاہیے عرض کیا کہ ایک جو کی قدر آپ نے فرمایا تم تو بہت زاہد ہو یعنی دنیا سے بے رغبت اور مال کو نہ رکھنے والے۔ اس کے بعد پوری آیت ذیل نازل ہوئی۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوَاکُمْ صَدَقَاتٍ فَاِذْلَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ واتوا الزکوۃ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بما تعملون .

کیا تم لوگوں سے یہ نہ ہو سکا کہ اپنی سرگوشیوں سے پہلے خیراتیں دیا کرتے (خیر) جب تم نے اس پر عمل نہ کیا اللہ نے تم سے معاف فرما دیا تو اب صرف نمازیں ادا کیجئے۔ اور تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیا کرو اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے میری وجہ سے امت پر تخفیف فرما دی اور ہر مرتبہ مناجات کے وقت جو صدقہ کا حکم تھا جس کا تحمل ہر ایک سے نہ ہو سکتا تھا منسوخ ہو گیا حضرات شیخین کے بارے میں یہ ارشاد کہ اگر تم کسی امر میں متفق ہو جاؤ تو تمہارا خلاف نہ کروں گا۔ دلالت کرتا ہے کہ آپ ان کی رائے پر عمل فرماتے تھے اور مقصود تحصیل رائے تھا علی ہذا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صدقہ کے بارہ میں مشورہ کرنا خود اس کی دلیل ہے۔

اور جلیل القدر تابعی قتادہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی کچھ حاجت نہ تھی' وحی کے ذریعہ سے تمام امور آپ کو معلوم ہو سکتے تھے۔ باایں ہم جو آپ کو مشورہ کا حکم دیا گیا محض مسلمانوں کے اطمینان اور تطییبِ قلب کے لئے تھا اور یہ امر آپ کے حسنِ اخلاق اور ملاطفت کے تکملہ میں داخل تھا ہر مسلمان کو یہ علم تھا کہ آپ جو کرتے ہیں جو فرماتے ہیں باشارہ وحی فرماتے ہیں پھر عقل و فراست آپ کی تمام عالم کی عقل سے فائق۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی کے مشورہ کی ہرگز حاجت نہ تھی باایں ہم جہاں کھانے پینے چلنے پھرنے بیٹھنے اٹھنے میں آپ مساوات و بے تکلفی کا معاملہ فرماتے تھے اسی کی تکمیل کے لئے آپ کو یہ حکم بھی ہوا کہ معاملات میں مشورہ کر لیا کریں تا کہ ان کا دل خوش ہو جائے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ آپ کو مشورہ کا حکم تعلیم امت کی غرض سے تھا۔ یعنی آپ کو مشورہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ کے فعل کو دیکھ کر امت بھی اقتدا کرے اور سمجھ لے کہ جب آپ باوجود نزول وحی کے مشورہ فرماتے تھے تو وہ لوگ جن کے پاس کوئی ذریعہ حصول

علم یقینی اور اطمینان قلب کا نہیں ہے کیونکہ مشورہ سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

قال لما نزلت وشاورهم في الامر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اما ان الله ورسوله لغنيان عنها ولكن جعلها الله تعالىٰ رحمة لامتي فمن استشار منهم لم يعدم رشدا ومن تركها لم يعدم غياً.

ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب آیت وشاورہم فی الامر نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "دیکھو خدا اور اس کا رسول مشورہ سے بالکل مستغنی ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو امت کے لئے رحمتہ کا سبب بنایا ہے میری امتہ میں سے جو شخص مشورہ سے کام کرے گا رشد وہدایت اس کے ساتھ رہے گی اور جو اس کو چھوڑے گا گمراہی وکجروی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی"۔

اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ باوجود مستغنی ہونے کے مشورہ کا حکم صرف امتہ کی تعلیم واقتدا کی غرض سے دیا گیا۔ یہ تین احتمال ہیں جن کی طرف علماء حقانی گئے ہیں ایک چوتھا احتمال اور بھی ہے وہ یہ کہ مشورہ سے غرض وغایت امتحان ہوتا تھا۔ یعنی ناصح وغیر ناصح ہمدرد وغیر ہمدرد میں تمیز کرنا یا مشیر کے صدق واخلاص کا اندازہ کرنا مگر اس احتمال کو ضعیف ونا قابل التفات قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان احتمالات میں کسی کو ترجیح دیں یا ان کے متعلق اپنی رائے بیان کریں معاملات مشورہ طلب کی تفصیل اور اختلاف کی اصل منشاء کو بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

معاملات کل دو قسم کے ہیں دینی و دنیوی دینی معاملات دو قسموں پر منقسم ہیں۔ ایک وہ جن میں وحی آچکی دوسرے وہ جن میں وحی نہیں آئی۔ اور پھر جن معاملات میں وحی نہیں آئی ان کی بھی دو قسمیں ہیں اول وہ جن میں مشورہ کے بعد وحی نازل ہوئی۔ دوسری

وہ جن میں مشورہ پر عمل کیا گیا اور وحی نازل نہ ہوئی۔ گو کسی معاملہ میں آپ کے عمل کو جائز و برقرار رکھنا بھی وحی کے حکم میں داخل ہے کیونکہ کسی غلط رائے پر آپ کو استقرار و قیام نہیں ہوسکتا اس لئے لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ آپ کا عمل یا حکم عین منشاء خداوندی کے مطابق تھا اور اس کو وحی حکمی یا وحی باطنی کہتے ہیں۔ معاملات دنیوی میں بالاتفاق مشورہ جائز ہے۔

معاملات دنیوی سے ہماری غرض اس قسم کے معاملات ہیں جن سے کوئی حکم شریعت متعلق نہیں ہوتا جس کی نسبت آپ نے ارشاد فرمایا ہے **انتم اعلم بامور دنیا کم** مثلاً تابیر نخل کا قصہ معاملات دینی جن میں وحی نازل ہوگئی ان میں مشورہ کی ضرورت و حاجت نہیں۔ اور نہ آپ ایسے معاملات میں اغراض مذکورہ میں سے کسی غرض کے لئے مشورہ فرماتے تھے۔ بلکہ صرف اشارہ وحی پر عمل فرمانا آپ کے ذمہ ضروری تھا۔ اور جن میں وحی نازل نہیں ہوئی ان کے اندر علماء کا اختلاف ہے ایک جماعت کہتی ہے کہ آپ کو ایسے معاملات میں بھی بغرض تعین حکم ورائے مشورہ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ وحی کا انتظار کرنا چاہیئے ۔ اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ ایسے معاملات میں مشورہ کی اجازت تھی بعد مشورہ جو رائے قرار پائی اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ گو آخر تک وحی آئی یا نہ آئی۔

مشورہ کے بارے میں یہ اختلاف مبنی ہے ایک دوسرے اختلاف پر جس کو اس جگہ بقدر ضرورت بیان کر دینے کی ضرورت ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد و قیاس سے کام لینا جائز ہے یا نہیں یعنی جس طرح امت کے اہل اجتہاد کو کسی ایسے معاملہ میں جس کے اندر شارع کی نص موجود نہ ہو اجتہاد و قیاس کی اس وقت استنباط جائز بلکہ واجب ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی جائز تھا یا نہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ اجتہاد و قیاس کی اس وقت اجازت ہوتی ہے جب کسی طریقہ منصوصہ سے حکم معلوم نہ ہو سکے۔ آئمہ مجتہدین واہل رائے کو جب نص کی جانب سے مایوسی ہے تو اب ان کے لئے کون سا طریقہ استنباط حکم کا سوائے قیاس واجتہاد کے باقی رہا۔

اور جبکہ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی ہر ایک امر کا حکم معلوم ہوسکتا ہے تو قیاس واجتہاد کی کیا حاجت ہے۔ جمہور امت کا مذہب یہ ہے اور یہی صحیح اور باعتبار دلائل کے قوی اور مطابقِ واقعات مرویہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے معاملات میں جن کے بارے میں وحی نازل نہ ہوئی قیاس واجتہاد درست تھا۔ اور بعد قیاس واجتہاد جو امر قائم فرماتے اور اس کے خلاف وحی نازل نہ ہوتی یہ بھی وحی میں داخل سمجھا جاتا تھا اور اسی کا نام وحی باطنی و وحی حکمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے اس تمام بیان کا کہ معاملات دنیوی میں باتفاق جملہ علماء مشورہ جائز۔ البتہ کسی اور بناء پر صحابہ سے استفسار کرلیا جائے تو ممکن اور جن معاملات میں وحی نازل نہیں ہوئی ان کے اندر بغرض تعین حکم وتقویت واعانت رائے مشورہ لینا ان لوگوں کے نزدیک ناجائز ہے جو آپ کے لئے قیاس واجتہاد کو ناجائز کہتے ہیں اور جو لوگ جائز کہتے ہیں ان کے نزدیک مشورہ بمعنی مذکور درست و جائز۔

جو لوگ آپ کے لئے اجتہاد وقیاس کو جائز نہیں جانتے وہ بطریق اولیٰ مشورہ کو بدیں معنی کہ اس کے ذریعہ سے کوئی حکم شرعی قائم کیا جاسکے بطریق اولیٰ جائز نہیں سمجھتے لیکن چونکہ روایاتِ احادیث سے بکثرت آپ کا صحابہ سے مشورہ کرنا ثابت ہے اس لئے نفس مشورہ سے تو انکار نہیں کرسکتے لیکن یہ کہتے ہیں کہ آپ کا مشورہ کا حکم امت کی تعلیم اور تطییبِ قلوب کے لئے تھا۔

لیکن ابھی یہ بیان کرنا باقی ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک آپ کے لئے قیاس واجتہاد ناجائز ہے اور اسی بنا پر مشورہ کو بغرض تعیین وتحصیل حکم ناجائز کہتے ہیں ان کے نزدیک حکم وشاورھم فی الامر میں کل دو احتمال ہیں تعلیم امت کے لئے ہو یا تطییب قلوب مؤمنین کے لئے تیسرا احتمال نہیں ہے۔ لیکن جمہور امت کے قول کے مطابق جبکہ آپ کے لئے مشورہ بغرضِ تعین وتحصیل جائز ہوا تو اس آیت میں تین احتمال ہوں گے جب یہ تفصیل معلوم ہوگئی اب سنیئے کہ مشورہ کا حکم کے بارے میں یہ اختلاف کہ مشورہ کا حکم

بغرض تحصیل مقصود تھا جیسا کہ احتمال اول میں بیان کیا گیا ہے یا تعلیم امت و تطیب قلوب مومنین کے لئے تھا جیسا کہ احتمال ثانی وثالث کا حاصل ہے۔ حقیقی اختلاف نہیں بلکہ عنوان وتعبیر کا اختلاف ہے جولوگ مشورہ کو بغرض تعلیم امت و تطیب قلوب فرماتے ہیں وہ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بہت سے مواقع میں آپ نے صحابہ سے مشورہ فرما کر اسی پر عمل فرمایا۔ ان کی غرض صرف یہ ہے کہ مشورہ بے شک حقیقی مقصود کی تحصیل کے لئے مشروع ہوا روایات سے یہ امر ثابت مگر اس کے مشروع ہونے کی علت ہے۔ آپ بوجہ نزول وحی مشورہ سے مستغنی تھے۔ پھر اس طریق کو چھوڑ کر مشورہ کا حکم کیوں دیا گیا۔ اسکی علۃ بعض کے نزدیک تعلیم امت ہے یا تطیب قلوب۔ لیکن ان دونوں میں تنافی نہیں بلکہ حکم مشورہ کی دونوں علتیں ہوسکتی ہیں ہمارے مذکورہ بالا بیان سے اس امر کا فیصلہ تو ہو گیا کہ مشورہ کی مشروعیت اس کی اصلی غرض کے لئے ہے جو عموماً متعارف ومعمول ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امور دینیہ میں جیسا کہ درصورت عدم نزول وحی اجتہاد و قیاس جائز تھا ایسا ہی مشورہ جائز تھا اور یہ بھی مشروعیت مشورہ کی علۃ وغرض میں جو اختلاف ہے حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ عنوان وتعبیر کا اختلاف ہے۔

لیکن ابھی ایک امر تنقیح طلب باقی رہ گیا ہے کہ مشورہ کو اس کی غرض وغایت ماننے اور امور دینیہ میں آپ کے لئے جائز سمجھنے کے بعد بھی مشورہ کا حکم تمام امور دینیہ کو شامل تھا یا صرف جنگ دمعر کہائے قتال تک یہ حکم محدود تھا کلبی اوران کے ہم خیال علماء یہ فرماتے ہیں کہ مشورہ کا حکم مخصوص تھا معرکوں اور حروب کی تدابیر کے لئے، لیکن جمہور کا مذہب یہ ہے کہ حکم مشورہ تمام امور دینیہ کو عامل وشامل تھا لڑائیوں اور معرکوں کی تخصیص نہیں تھی۔

کلبی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بارہ میں نازل ہوئی ہے اور خاص جنگ احد میں آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا تھا کہ مدینہ میں ہی رہ کر مدافعت کرنا بہتر ہے یا باہر نکل کر مقابلہ کرنا۔ آپ کی رائے کا میلان خود اس جانب تھا کہ مدینہ ہی میں رہ کر مدافعت کریں لیکن اکثر صحابہ کی جوش ایمانی کا تقاضہ یہ تھا کہ پیش قدمی کر کے مقابلہ

کیا جائے عبداللہ ابن ابی منافق کی رائے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق تھی۔ وہ کہتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر ہم کسی دشمن سے مغلوب نہیں ہوئے اور نہ کسی کو آج تک ہم پر دسترس ہوا ہے۔ مگر غلبہ رائے کی وجہ سے آپ نے اکثر کی رائے کو قبول کیا۔ زرہ اور خود پہن کر تشریف لائے تو اب صحابہ کو ندامت ہوئی کہ ہم نے آپ کے خلاف ایک رائے پر اصرار کیوں کیا۔ اور عرض کیا کہ ہم سے غلطی ہوئی رائے وہی ہے جو آپ کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ نبی کی شان نہیں ہے کہ ہتھیار لگانے کے بعد بلا مقابلہ اتار دے آپ معہ مجاہدین روانہ ہو گئے اور احد پر کفار مکہ سے مقابلہ ہو گیا۔ اس معرکہ میں گو انجام کار مسلمانوں کو غلبہ ہوا مگر کئی طرح کا سخت نقصان اٹھانے کے بعد اول نقصان تو یہ پہنچ گیا کہ عبداللہ بن ابی معہ اپنی کثیر جماعت کے یہ کہہ کر واپس ہو گیا۔

اطاعهم وعصانی

اوروں کا کہنا مانا اور میری بات نہ مانی

اگر چہ منافقوں کا آپ سے جدا ہونا حقیقت میں نقصان نہ تھا بلکہ نفع تھا کیونکہ یہ لوگ شوق ورغبت سے ساتھ نہ تھے۔ اگر عین معرکہ قتال میں دھوکہ دے جاتے تو زیادہ نقصان ہوتا پھر ان سے کسی قسم کی جدوجہد کی بھی توقع نہ تھی۔ تھی تو اس بات کی کہ مسلمانوں کو اپنی طعن آمیز باتوں سے جیسا کہ ہمیشہ کیا کرتے تھے بددل اور شکستہ خاطر کریں۔ ایک ناپاک جماعت سے لشکر اسلام کا پاک وصاف رہنا ہی اچھا تھا۔ مگر چونکہ اس وقت تک حکمت الٰہی کا مقتضا یہ بھی تھا کہ منافقوں کو بھی ساتھ لگائے رکھا جائے۔ اس لئے ایک جماعتِ کثیر کا علیحدہ ہو جانا اول تو شوکت میں نقصان ڈالنے والا تھا۔ دوسرے پختہ کاروں کے پست ہمت ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کو عین معرکہ کے وقت ہزیمت ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض نے مدینہ میں آ کر دم لیا۔ اور ایک شخص نے یہ خبر پہنچا دی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے ہیں۔ بعض ان میں سے اپنے گھر گئے تو عورتوں نے

طعن و تشنیع شروع کردیئے کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے آئے۔ تم اس قابل ہو کہ چرخہ سنبھال کر عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھو۔

اس ہزیمت کے وقت کفار کو غلبہ کی صورت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کے ستر چیدہ بہادر و شہسوار حضرت حمزہ جیسے شہید ہو گئے۔ یہ نقصان حقیقت میں بچند وجوہ ایسا تھا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی ان کو اٹھانا نہیں پڑا۔

تیسرا نقصان یہ پہنچا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم آئے آپ کا دندان مبارک شہید ہوا۔ مسلمانوں کے لئے اس نقصان سے بڑھ کر اور کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کو اپنی جان سے مال سے عزت و آبرو سے زن و بچہ سے گھر اور جائداد سے سب سے زیادہ پیاری اور محبوب حضور انور ﷺ کی ذات تھی۔ ان کا شغف آپ سے تا درجہ بڑھا ہوا تھا کہ ایک عورت کو جب اس کے باپ بھائی وغیرہ کی شہادت کی خبر دی گئی تو اس نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں۔ اور جب یہ سنا کہ آپ زندہ ہیں تو اس نے کہا آپ زندہ ہیں تو ساری مصیبتیں آسان ہیں۔ اور یہ سب نقصانات اس غلط رائے کا نتیجہ تھے اور اب خود صحابہ کو بھی یہ خیال ہوسکتا تھا کہ ہم اس قابل نہیں رہے کہ ہم سے ان معاملات میں مشورہ کیا جائے۔ اس خیال کے دفعیہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ اول تو ان کے قصور معاف کرنے اور ان کے لئے استغفار کا حکم ہوا اور پھر ارشاد ہوا کہ ان سے مشورہ کرتے رہو۔

آیت کا شانِ نزول اور ترتیب بیان صاف بتلا رہے ہیں کہ شاورھم فی الامر میں امر سے امر حرب مراد ہے۔ الف لام استغراق کا نہیں کہ تمام امور حرب و غیر حرب میں مشورہ کیا کیجئے۔ بلکہ یہ الف لام عہد خارجی کا ہے یعنی خاص لڑائی کے معاملات میں جس کا تذکرہ پہلے سے ہے مشورہ کیجئے۔ غلطی رائے اور قصور کی وجہ سے وہ ایسے نہیں ہو گئے کہ ان سے مشورہ نہ کیا جائے۔

جمہور کہتے ہیں ہم مان لیتے ہیں کہ یہ آیت خاص جنگ احد کے بارہ میں نازل ہوئی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مشورہ کا حکم خاص امور متعلقہ جنگ وقتال کے ساتھ

مخصوص ہو جائے۔

اول تو اس وجہ سے کہ شان نزول کے خاص ہونے سے حکم کا خاص ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں۔ مگر حکم عام نہیں۔ اس قاعدہ سے یہاں بھی لفظ الامر تمام ان امور کو شامل ہے جن میں وحی نازل نہیں ہوئی۔ خواہ امور متعلقہ قتال میں ہو یا امور دینیہ میں۔

دوسرے اس وجہ سے کہ صحابہ سے مشورہ کرنے کا طریقہ نزول سے پہلے بھی جاری تھا۔ اور اس میں کوئی تخصیص کسی قسم کے معاملات کی نہ تھی۔ اس آیت سے جواز مشورہ کی ابتداء نہیں ہوئی۔ پس اگر ہم یہ مان لیں کہ شاورھم فی الامر میں خاص قسم متعلقہ تدابیر حرب مراد ہیں اور انھیں کے بارہ میں اجازت حکم ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ واقعہ مذکورہ میں صحابہ سے چند غلطیاں سرزد ہو جانے سے جو یہ خلجان ہو سکتا تھا کہ اب آیندہ وہ مشورہ کا طریقہ نہیں رہا اس خلجان کو رفع فرمادیا۔ یہ کہاں سے مفہوم ہوا کہ مشورہ کا طریقہ جو پہلے سے جاری اور معاملات کی نوعیت کے ساتھ مخصوص نہ تھا اس میں بھی اس آیت سے تخصیص ہو گئی۔

تیسرے اس وجہ سے کہ ہم کو بہت سے ایسے معاملات دینیہ کا ثبوت ملتا ہے جن میں آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا اور ان کو تدابیر متعلقہ قتال سے تعلق نہیں ہے۔

مثلاً بدر کی لڑائی سے فراغت ہو چکی تو آپ نے اسیران جنگ بدر کے بارہ میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ان کو معاوضہ لے کر رہا کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ یا مثلاً اذان کے بارہ میں صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے۔

قال کان المسلمون حین قدموا المدینة یجتمعون فتیحیتون للصلوٰة ولیس ینادی بھا احد فتکلموا یومًا

فی ذلک فقال بعضهم اتخذوا مثل ناقوس[۱] النصاری وقال بعضهم قرنا[۲] مثل قرن الیهود فقال عمر او لاتبعثون رجلاینا دی بالصلوٰۃ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یابلال قم فناد بالصلوٰۃ. (مشکوۃ ص:۵۶)

ابن عمر فرماتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ آئے تو اٹکل کر کے نماز کے لئے جمع ہوتے تھے۔ کوئی ان کو وقت کی اطلاع نہ کرتا تھا۔ ایک روز اس کی گفتگو ہوئی بعض نے کہا کہ نصاریٰ کی طرح ناقوس بنالیا جائے۔ بعض نے کہا یہود کی طرح قرن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کوئی شخص کھڑا ہو کر پکار دیا کرے۔ یہ سن کر جناب رسول اللہ ﷺ نے بلال سے ارشاد فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز کے لئے آواز دے دو۔

اس حدیث سے بخوبی ثابت ہے کہ نماز کی اطلاع دینے کے لئے مشورہ ہوا۔ صحابہ نے اپنی اپنی رائے بیان کی اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو قبول فرما کر نماز کے لئے پکارنے اور اطلاع دینے کا حکم دیا۔ اور اس طرح انجام کار اذان جاری ہوگئی۔

قصہ مشورہ در بارہ اساریٰ بدر میں کوئی اگر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مشورہ بھی منجملہ امور متعلقہ حروب تھا (اگر چہ ایسا کہنا ہرگز قابل تسلیم نہیں ہے) تو مشورہ متعلقہ اذان میں اس کی کچھ بھی کسی طرح گنجائش نہیں ہے اذان محض امر دینی ہے۔ اس کو قتل وقتال جنگ وجدل سے فی الحال یا انجام کار کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

ان دونوں واقعوں کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات کا ثبوت ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے امور دینیہ میں جس کا حروب سے تعلق نہیں مشورہ کیا گیا۔ مگر اب ان نقل کی حاجت نہیں رہی اور جب ایسے امور دینیہ میں آپ کا مشورہ ثابت ہے تو حکم مشورہ

(۱)......دو لکڑیاں ہوتی تھیں ایک چھوٹی ایک بڑی، چھوٹی کو بڑی پر مارتے تھے جس سے آواز نکلتی تھی ۱۲

(۲)......منہ سے بجانے کا آلہ مثل سنکھ وغیرہ کے۔۱۲

کو امور جنگ کے ساتھ مخصوص کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بے شک جمہور کی رائے صحیح ہے۔ مشورہ کا حکم تمام امور دینیہ کو عام وشامل ہے۔ ہرگز امور متعلقہ تدابیر جنگ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لیکن میرے خیال میں غالباً کلبی وغیرہ کا مطلب بھی یہ نہ ہوگا کہ امور جنگ کے علاوہ اور امور دینیہ میں مشورہ آپ کو جائز نہ تھا۔ وہ صحیح اور مسلّم واقعات سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت خاص امور حرب کے متعلق نازل ہوئی ہے یعنی یہ خیال کر کے کہ ان سے امور میں غلطیاں سرزد ہوئیں ان سے مشورہ تک نہ کریں۔ اگر ان کا یہی مطلب لے لیا جائے تو حقیقت میں کچھ اختلاف باقی نہ رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مبحث ثانی

خداوند عالم جل مجدہٗ نے اول تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ کا حکم فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا۔

فاذاعزمت فتوکل علی اللہ

پھر جب عزم مصمم کر چکو تو خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

اس ارشاد میں مشورہ کی حقیقت اس کے نتیجہ اور اسلامی اصول کی ایسی صحیح تعلیم بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کے بعد کسی مغالطہ اور غلط فہمی، کجروی اور غلط اصول قائم کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اول تو یہ کہ مشورہ میں اختلاف رائے ہوتا ہے۔ اگر اختلاف رائے میں پڑ کر کسی ایک جانب کو متعین نہ کر لیا جائے۔ اور عزم مصمم قائم نہ ہو تو مشورہ بجائے مفید ہونے کے نہایت مضر اور مہلک ہو جاتا ہے۔ تردد میں پڑ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ صحابہ سے مشورہ کیجئے۔ لیکن کسی ایک پر قائم ہو کر اس کے اجراء وامزاء کا عزم مصمم کر لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ اختلاف رائے اور کثرۃ رائے کی وجہ سے نفس معاملہ تعویق و

تردد میں پڑ جائے۔ اور یہ حقیقت میں امت کو تعلیم ہے مسلمانوں کے لئے مشورہ کا عام قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہ وہ بات ہے کہ عقلاءِ زمانہ بھی اس اصول کو ترک کر کے کبھی مدعا میں کامیاب نہیں ہو سکتے خلاصہ یہ ہے کہ مشورہ جیسا فی حد ذاتہٖ محمود اور موجب فلاح ہے ایسے ہی مشورہ کے بعد ایک جانب متعین کر کے عزم مصمم کر لینا بھی واجب و لازم ہے۔

دوئم یہ کہ مشورہ کرنا عقلاء کی رائے پر اعتماد کرنا اور اس پر کاربند ہونا منجملہ اسباب ظاہرہ کے قوی سبب کامیابی و مدعا برآمد کا ہے اور اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ مشورہ پر اعتماد کر کے کام کر لینا چاہیئے۔ لیکن اسلامی تعلیم معتدل ہے۔ افراط و تفریط کا اس میں شائبہ نہیں ہے۔ اسلام نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ ہم اسباب سے کام لیں اور پھر اسباب کو مؤثر حقیقی نہ سمجھیں۔ حقیقی فاعل قادر مطلق و باختیار کو سمجھیں۔ اس تعلیم کو ذہن نشین کرنے کے لئے اول تو یہ ارشاد ہوا کہ آپ اسباب کو بالکل ترک نہ کریں۔ صحابہ سے مشورہ کریں۔ لیکن اسباب پر اعتماد بھی نہ کریں بلکہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کریں اور کام شروع کریں۔ یہ وہ اسلامی صحیح تعلیم ہے، جس پر مسلمانوں کو ناز ہے۔ اور جس کا مقابلہ کوئی قوم اور کوئی مذہب نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے اسباب ظاہرہ پر اس قدر اعتماد کیا کہ خدا تعالیٰ کو بھول گئے، اسباب ہی کو منجی اور موثر سمجھنے لگے۔ انھوں نے حقیقتاً بندگی کا رشتہ توڑ دیا۔ اور جنھوں نے اسباب کو بے کار محض سمجھا انھوں نے خداوند عالم کی حکمت کو نہ سمجھا اسلام نے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا۔

اس ارشاد سے ہم کو توکل کی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی۔ توکل کے معنی یہ ہیں کہ ہر کام میں ہر تدبیر میں فقط خدا تعالیٰ کو موثر اور فاعل سمجھے۔ کسی سبب یا تدبیر پر اعتماد نہ کریں۔ اس کو حقیقی مؤثر اور خداوند عالم سے مستغنی نہ سمجھے۔ یہ مرتبہ اگر اس درجہ یقین و اذعان کو پہنچ گیا کہ اس کا حال بن گیا ہے۔ اس کے قلب میں اسباب کی طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ بلکہ مسبب الاسباب کی طرف ہے تو یہ درجہ توکل کامل کا ہے جو اہل معرفت و ارباب یقین کو حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر فقط علم و اذعان اور اعتقاد تو ہے مگر حال نہیں ہے تو نیچے کا درجہ ہے جس کے بغیر آدمی مومن کامل نہیں ہوتا نجات کے لئے یہ بھی کافی ہے۔

توکل کی بحث اس کے مدارج کی تفصیل و تحقیق متوکلین کے مدارج اور حالات اس سے زیادہ تفصیل کو چاہتے ہیں۔ مگر ہم اس جگہ اس سے زیادہ لکھنا نہیں چاہتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کبھی اس پر مستقل لکھیں گے۔

آیت کے متعلق اور بھی لطیف بحثیں تھیں۔ لیکن اس رسالہ میں ان کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے فقط دو ہی ضروری مباحث پر اکتفا کیا۔

(نص دویم)

والَّذِيْنَ اسْتَجَابُو الربهم واقامو االصلوٰة وامر هم شورىٰ بينهم ومما رزقناهم ينفقون .

ایمان والے وہ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم کو مانا، نماز کو قائم کیا، اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت اور اس کی پہلی آیتوں میں مؤمنین کی مدح اور ان کے اوصاف خاص بیان کئے گئے ہیں۔ اور منجملہ اوصاف خاصہ اور علامات مختصہ مؤمنین کاملین کے یہ بھی کہ وہ اپنے معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ مستقل ہوکر خود رائے بن کر نہیں کرتے۔ اس آیت میں چار وصف بیان کئے گئے اول اپنے رب کی اطاعت اس کے احکام کی تسلیم۔ دوسرے نماز کا قائم کرنا۔ تیسری اپنے معاملات کو باہمی مشاورۃ سے طے کرنا۔ چوتھے خدا کے دیئے ہوئے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔

اس ترتیب بیان میں اوّل تو خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے جو حقیقت میں اصل اصول اور تمام عبادت کے لئے شرط اوّل ہے۔ اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ ہے جو تمام عبادات مالی و بدنی کی اصلِ اصول ہے اور ایمان و کفر کی مابہ الفرق ہے۔ اس کے بعد مشاورۃ ہے۔ اور آخر میں فی سبیل اللہ خرچ کرنا اللہ کی راہ میں صرف کرنا۔ فرض و نفل دونوں کو شامل ہے اور

جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مشورہ فرض نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب و سنت کے درجہ میں ہے تو یہ ترتیب موجب خلجان معلوم ہوتی ہے۔لیکن حقیقت میں کچھ خلجان نہیں ہے۔مشورہ ایک مہتم بالشان امر ہے۔عالم کی فلاح وفساد میں اس کو بڑا دخل ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے۔

اذا کان امراء کم خیارکم واغنیاء کم اسخیاء کم وامر کم شوری بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا واذا کان امراء کم شوارکم واغنیا ئکم بخلاء کم و امرء کم الی نساء کم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا.

جب تمھارے حاکم وامیر تم میں سے بہتر ومنتخب لوگوں میں سے ہوں۔ تمہارے مالدار سخی ہوں۔تمہارے کام باہمی مشاورۃ سے طے ہوتے ہوں تو زمین پر رہنا اس کے اندر دفن ہونے سے بہتر ہے اور جب معاملہ برعکس ہو جائے۔امرا بدترین اور شریر ہوں۔مالدار کنجوس و بخیل ہوں۔ عورتوں کے ہاتھ میں تمہاری باگ ہو تو دفن ہو جانا زمین پر زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ (روح المعانی جلد ۷ ص:۵۳۱)

اس حدیث میں خصوصیت سے ان امور کو بیان کیا گیا ہے جس کو عالم کی اصلاح وفساد سے بہت کچھ تعلق ہے گویا مدار اصلاح وفساد غالباً ان امور پر ہے۔امراء سے عام مخلوق کا تعلق ہوتا ہے۔مالداروں کی طرف فقراء کو حاجت پڑتی ہے۔ایسے ہی مشورہ بھی عام احتیاج کی چیز ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معاملات میں باہمی مشاورۃ سے کام نہ لیا جائے۔بلکہ خودرائے یا کم عقلوں کے اقتداء سے معاملات طے کئے جائیں تو عالم میں فساد پھوٹ پڑے۔زندگی تلخ ہو جائے زندہ رہ کر مبتلاء مصائب وقلق ہونے سے مرنا بدرجہا بہتر ہو جائے۔

اور جب کہ عالم کی صلاحیت وفساد مشورہ وعدم مشورہ سے ہے تو مناسب یہ معلوم ہوتا تھا کہ مثل اور عبادات مشورہ بھی فرض ہوتا مگر خداوند عالم نے اس میں بھی مصالح عباد کو

ملحوظ رکھ کر مشورہ کو ان پر فرض نہیں فرمایا۔ مگر مشورہ کے استحسان اور اس کے مہتم بالشان ہونے کو ایسے انداز سے فرمایا کسی مومن صاحبِ عقل سلیم کو اس سے انحراف کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اول تو مؤمنین کی مدح کے موقع پر ان کے اوصافِ خاصہ کو شمار کرتے ہوئے مشاورۂ باہمی کو بھی بیان فرمایا جس سے خود اس کی عظمت وشان معلوم ہوتی ہے پھر صلوٰۃ وزکوٰۃ اور مفروضہ عبادتوں کے درمیان میں رکھا جس سے اول تو یہ معلوم ہو گیا کہ مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ وہ بھی فرض ہوتا۔ دوسرے زکوٰۃ وصدقات سے مقدم رکھا جس سے اور بھی اس کی عظمت وشان بڑھ گئی۔ نص اول سے اگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ کا حکم جو حقیقت میں امت کے لئے تعلیم ہے کہ جب باوجود مستغنی عن مشاورۃ ہونے کے بھی مشورہ کے لئے بھی مامور تھے تو دوسرے لوگ ضرور مامور ہوں گے۔ وہ کیسے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ گویا اس آیت میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا۔ اور اس آیت کے اندر مقام مدح میں مومنین کے اوصاف میں سے مشاورۃ باہمی کو بیان فرمایا جس سے یہ نتیجہ نکال لینا سہل اور بدیہی امر ہے کہ مشورہ بنص قرآن ایک ضروری اور موجبِ اصلاح عالم امر ہے۔ اس سے کسی کو انحراف واستغنا کی گنجائش نہیں ہے اس سے بڑھ کر تاکید اور تفہیم کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

روایاتِ احادیث:

نصوص قرآنی اور ان کے متعلق ضروری امور کے بیان سے فراغت پا کر اب ہم مشورہ کے متعلق روایات احادیث کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

فیه هُدِی لارشد الامور

تو اس کو سب سے بہتر امر کی طرف ہدایت کی جاتی ہے۔

بیہقی عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعًا۔

حدیث ثانی عن علی رضی اللّٰه عنه قال قلت یارسول اللّٰه

الا مر ینز ل بنابعد ک لم ینزل فیه قرآن ولم یسمع منکم فیه شی قال اجمعو اله العابدمن امتی واجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقضوه برای واحد . خطیب فی رواۃ مالک

حضرت علی فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد جوکوئی ایسا امر پیش آئے جس میں نہ قرآن نازل ہوا۔ نہ آپ سے کچھ سنا تو اس میں کیا کیا جائے۔ فرمایا میری امت کے دیندار لوگوں کو جمع کر کے اس امر کو مشورہ میں ڈال دو۔ تنہا کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

حدیث سوم

عن ابی هریرۃ مر فو عًا استر شدوا العاقل ترشدوا ولاتعصوه فتندموا . (خطیب فی رواۃ مالک .)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ دانشمند لوگوں سے طلبِ رشد ومشورہ کرو تم کو سیدھی راہ کی ہدایت ہوگی۔ ان کی نافرمانی وخلاف مت کرو ورنہ نادم ہوگے۔

حدیث چہارم

عن ابن عباسؓ قال لمانزلت وشاور هم فی الامر قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اما ان اللّٰه ورسوله لغنیان عنها ولکن جعلها اللّٰه تعا لیٰ رحمة لامتی فمن استشار منهم لم یعدم رشدا ومن تر کها لم یعدم غیا بیهقی بسندحسن . (یہ حدیث پہلے نقل ہوچکی ہے)

ابن عباس فرماتے ہیں جب آیہ وشاورھم فی الامر نازل ہوئی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ سمجھ لو کہ خدا اور اور خدا کا رسول مشورہ سے مستغنی ہیں۔ رسول مشورہ سے مستغنیٰ ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے

مشورہ کو میری امت میں سے رحمت بنایا ہے۔ میری امت میں سے جو مشورہ کرتا رہے گا۔ رشد و ہدایت اس کے ساتھ رہیں گے اور جو اس کو چھوڑ دے گا کجروی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

حدیث پنجم

اذا کان امراء کم آہ یہ حدیث معہ ترجمہ پہلے لکھی گئی ہے

حدیث ششم کتاب اداب الدنیا والدین ص ۱۲۰ میں ہے

وروی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال المشورۃ حصن من الندامۃ وامان من الملامۃ .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مشورہ ندامت سے محفوظ رہنے کا قلعہ ہے اور لوگوں کی ملامت سے امن ہے۔

حدیث ہفتم

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسو ل اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ارادامرا فشاور فیہ مسلمًا وفقہ اللّٰہ لارشدا لامور. (ادب الدنیا والدین صف ۱۲۰)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کوئی کام کرنا چاہے اور اس نے اس بارہ میں کسی مسلمان سے مشورہ کرلیا تو خدا تعالیٰ اس کو سب سے بہتر بات کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

حدیث ہشتم

روی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال راس العقل بعد الایمان باللّٰہ التو ددالی الناس وما استغنی مستبدبرأیہ وماھلک احدعن مشورۃ .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے

بعد اعلیٰ درجہ کی معقول بات لوگوں سے محبت اور میل جول کے ساتھ رہنا ہے کوئی خودرائے شخص محض اپنی رائے پر بھروسہ کر کے کبھی دوسروں سے بے پرواہ نہیں ہوا۔ اور نہ مشورہ کے بعد کام کرنے والے کو ہلاکت میں پھنسنے کی نوبت آئی۔

حدیث نہم

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقحوا عقو لکم بالمذاکرۃ واستعینوا علیٰ امور کم بالمشاورۃ.

اپنے عقول کو مذاکرہ سے تجربہ کار بناؤ اور اپنے معاملات میں باہمی مشاورۃ سے امداد لو۔

احادیث مذکورہ بالا سے چند امور بوضاحت تام ثابت ہوگئے اول یہ کہ طریقِ رشد وصواب وہدایت پر چلنے کے لئے مشورہ اصلِ اصلاح ہے مشورہ پر کاربند ہوکر جو کام کیا جاتا ہے اس میں خیریت وصلاحیت ہوتی ہے۔ رشد وہدایت ساتھ دیتے ہیں اور اگر مشورہ نہ کیا جائے تو کجی وگمراہی سے نجات ملنا مشکل ہے اس میں انجام کار ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔

دویم یہ کہ جیسا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امور دینیہ خواہ وہ متعلق تدابیر حرب ہوں یا متعلقہ احکام مشورہ جائز تھا۔ ایسے ہی آپ کے بعد بھی جب کسی معاملہ میں نص کتاب وسنۃ موجود نہ ہو۔ مسلمانوں کے لئے مشورہ مشروع ہے۔

تیسرے یہ کہ جن لوگوں سے مشورہ کیا جائے۔ ان میں اُن اوصاف کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جن سے ان کے مشیر بننے کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ اور جو ان کو غلط رائے نہ دیں اور خیانت سے نہ روکیں۔

چوتھے یہ کہ بوجہ نزول وحی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ سے مستغنی تھے۔ مگر اس غرض کے لئے کہ امت اقتدا کرے آپ کے لئے مشورہ مشروع کیا گیا۔ اس چوتھے امر کو ہم پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔ تیسرے امر کی تشریح شرائط

وآداب مشورہ میں تفصیل سے بیان ہوگی۔

اقوالِ صحابہؓ وسلف امتہ:

۱)...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نعم الموازرة المشاورة وبئس الاستعداد الاستبداد

(ادب الدنیا والدین ص: ۱۲۰)

باہمی مشاورۃ سے بوجھ کا تقسیم کرنا بہت خوب ہے اور بُری مستعدی ہے خودرائے ہونا۔

۲)...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

الرجال ثلاثه رجل تردعليه الامور فيسددها برايه و رجل يشاور فيما اشكل وينزل حيث يامره اهل الراى ورجل حائد لاياتمر رشدا لايطيع مرشدا.

آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جس پر معاملات پیش آئیں اور وہ اپنی رائے سے ان کی درستی اصلاح کردے دوسرے وہ جو مشکلات میں اوروں سے مشورہ کے بعد اہل الرائ کی رائے کا اتباع کرتا ہے اور تیسرا حیران ہے نہ کسی سے بھلائی کا مشورہ لیتا ہے نہ کسی ہدایت کرنے والے کی اطاعت کرتا ہے۔

۳)...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں۔

الاستشارة عين الهداية وقد خاطرمن استغنیٰ برائه

مشورہ حاصل کرنا عین ہدایت ہے۔اور جو شخص اپنی رائے پر اعتماد کئے ہوئے اس نے خطرناک راہ اختیار کی۔

۴)...... حضرت حسن بصری ارشاد فرماتے ہیں۔

ماتشاورقوم قط الا هدوا لارشد هم ثم تلاوامرهم

شوری بینھم

جب کوئی قوم کسی معاملہ میں مشورہ کرتی ہے تو ان کو بہترین بات کی ہدایت ہوتی ہے اس کی تاکید میں انھوں نے آیہ وامرھم شوریٰ بینھم تلاوت فرمائی۔ (ادب الدنیا والدین ص۱۲۰۔)

۵)...... حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

ان المشورۃ والمناظرۃ بابارحمۃ ومفتاحابرکۃ لا یضل معھمارایٔ ولایفقدمعھما حزم

(ادب الدنیا والدین ص: ۱۲۱)

مشورہ اور مناظرہ دو دروازے رحمت کے اور دو کنجیاں ہیں برکت کی ان کے بعد رائے مخفی نہیں رہتی اور نہ حزم واحتیاط مفقود ہوتے ہیں۔

۶)...... حضرت مالک امام نے اپنے ایک خط میں جو ہارون رشید کو لکھا تحریر فرمایا۔

الزم الرای الحسن والھدی الحسن والاقتصاد بلغنی عن ابن عباس رضی اللہ عنھما انہ قال الرای الحسن جزء من خمسۃ و عشرین جزأ من النبوۃ

میانہ روی کو مضبوطی سے پکڑنا مجھ کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت پہنچی ہے وہ فرماتے تھے اچھی رائے ایک جز ہے نبوت پچیس اجزاء میں سے۔

اقوالِ عقلاء و بلغاء وارباب ِسیاستہ

اس موقعہ پر علاوہ اہل اسلام دوسرے عقلاء کے مقولے بھی نقل کئے جائیں گے۔

۱)...... خلیفہ منصور عباس نے اپنی بعض اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:۔

خذ عنی ثنتین لاتقل فی غیر تفکیر ولا تعمل بغیر تدبیر .

دو باتیں مجھ سے حاصل کر لے۔ بغیر سوچے زبان سے کچھ مت نکال اور

بغیر تدبیر کے کام نہ کر۔

۲)...... فضل کا مقولہ ہے:۔

المشورة فیها برکة وانی لاستیشر حتی هذه الهبشیة الا عجمیة

مشورہ میں برکت ہے۔ میں مشورہ کرتا ہوں یہاں تک کہ اس عجمی باندی سے۔

۳)...... بعض عقلاء کا مقولہ ہے۔

الرای السدید احمی من البطل الشدید.

سیدھی اور سچی رائے سخت رائے دلیر اور بہادر سے زیادہ محافظ ہوتی ہے۔

(۴) ایک دانشمند اعرابی کا قول ہے۔

لامال اوقر من العقل ولافقر اعظم من الجهل ولاظهر اقوی من المشورة . (مستطرف ج، ا ص: ۶۰)

کوئی مال عقل سے کثیر اور وافر نہیں۔ جہل سے بڑھ کر کوئی فقر ومحتاجی نہیں کوئی سواری مشورہ سے زیادہ قوی نہیں ہے۔

۵)...... بعض بزرگوں کا قول ہے۔

من بدء بالا ستخاره دثنی بالاستشارة فحقیق ان لایخیب رایه . (مستطرف ج، ا ص: ۶۰)

جو شخص اپنے کام کے لئے اول استخارہ کرے اور بعد میں مشورہ کرے تو وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی رائے ناکامیاب نہ ہو۔

۶)...... عبدالحمید کا قول ہے۔

المشاوره فی رایه ناظر من ورائه

اپنے معاملہ میں مشورہ کرنے والا ایسا ہے جیسا اپنی پشت کی چیز دیکھنے والا۔

۷)...... بعض بلغاء کا قول ہے۔

حق العاقل ان یضیف الی رایه رای العقلاء .

عاقل کا فرض یہ ہے کہ اپنی رائے کے ساتھ عقلاء کی رائے کو ملالیوے۔

۸)...... حسن کا مقولہ ہے۔

الناس ثلاثة فرجل رجل ورجل نصف رجل ورجل لارجل فاما الرجل الرجل فذوالرای و المشورة واما الرجل الذی له رای ولا یشاور واما الرجل الذی لیس یرجل فالذی لیس له رائ ولایشاور .

(مستطرف ج، ا ص:٦٨)

آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو پورا آدمی ہے۔ دوسرا وہ جو آدھا ہے۔ تیسرا وہ جو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ شخص جس کو مرد کامل کہنا چاہیے وہ ہے جو خود صاحب رائے ہے اور مشورہ بھی کرتا ہے اور وہ جس کو نصف آدمی کہنا چاہیئے۔ وہ شخص ہے جو خود تو ذی رائے اور صاحب عقل وہوش ہے مگر مشورہ نہیں کرتا اور جو بالکل ہی آدمی نہیں وہ وہ ہے جو نہ خود ذی رائے ہے اور نہ دوسروں سے مشورہ کرتا ہے۔

حسن کے اس مقولہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں جس کو ابھی نقل کر چکے ہیں۔ اختلاف ظاہر ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو مرد کامل اس کو قرار دیا ہے جو معاملات کی تدبیر و اصلاح اپنی رائے سے کر سکے۔ دوسروں کے مشورہ کا خواہ مخواہ محتاج نہ ہو۔ اور حسن مرد کامل اس شخص کو کہتا ہے جو باوجود رائے ذی و تدبیر ہونے کے دوسروں سے مشورہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسرے درجہ کا آدمی اس کو فرماتے ہیں جو مشکلات میں مشورہ کے بعد کام کرے۔ اس میں دونوں صورتیں داخل ہیں خود بھی ذی رائے ہو اور

مشورہ بھی کرے اور خود ذی رائے نہ ہو مگر مشورہ بھی کرے۔ حالانکہ حسن صورت اول کو یعنی ذی رائے بھی ہو اور مشورہ بھی کرے مرد کامل کی صورت کہتے ہیں۔ یہ اختلاف ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے ارشاد سے تو چار صورتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

۱)...... فقط اپنی رائے و تدبیر سے حل معاملات کرے۔

۲)...... صاحب رائے ہو اور مشورہ بھی کرے۔

۳)...... صاحب رائے نہ ہو مگر مشورہ کرے۔

۴)...... نہ صاحب رائے ہے اور نہ مشورہ کرتا ہے اور نہ مشیر کی اطاعت کرتا ہے اور حسن کے قول میں صرف پہلی دوسری اور چوتھی صورت سے بحث کی گئی ہے۔

تیسری صورت یعنی ذی رائے نہ ہو مگر مشورہ کرے بحث نہیں کی حالانکہ جب اس نے اس احتمال کو لے کر کہ نہ خود صاحب رائے ہو اور نہ مشورہ کرے ایسے شخص کو آدمیت کے درجہ سے بالکل خارج کر دیا ہے تو اس شخص کا بھی جو ذی رائے تو نہیں مگر مشورہ کے بعد کام کرتا ہے درجہ ضرور قائم کرنا چاہیئے تھا۔

اختلاف اول کو دیکھا جاتا ہے تو عقل کی رو سے حسن کا قول صحیح معتمد معلوم ہوتا ہے۔ مگر حضرت عمر کی جلالت شان و انتہائی تدبیر اور سیاست کی طرف نظر اٹھائی جاتی ہے تو حسن کا قول اس کے معاملہ میں قابل تسلیم معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے حسن جن تینوں درجوں سے بحث کرتے ہیں۔ حضرت عمر نے اس سے اوپر بھی ایک درجہ قائم کیا ہے۔ حسن کی مراد تو صاحب رائے سے وہی شخص ہے جس کو عقل و تدبیر ظاہری سے پورا حصہ ملا ہو۔ لیکن حضرت عمر کی نظر اس سے عالی درجہ پر ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو عقل عطا فرما کر نیک و بد کی تمیز پر قادر کر دیا ہے اتنی بات میں مومن و کافر مسلم سب شریک ہیں۔ عقل جو فطرتاً انسانی ترکیب کا جزو اعلیٰ ہے۔ اس کو تجربہ سے ترقی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے عاقل غیر مجرب سے عاقل مجرب کا درجہ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن عقل کی ترقی جیسی تجربہ اور ممارستہ سے ہوتی ہے اور اس حصہ میں

بھی انسان کے سب افراد شریک ہیں ۔ اس طرح عقل کی تائید اور تقویت خدا کے نور وہدایت سے ہوتی ہے جس کو فراستِ ایمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے عقل کے ساتھ جب فراست ایمانی بھی مل جاتی ہے تو اس کا درجہ ہزاروں مشوروں اور تجربوں سے فائق تر ہو جاتا ہے ہزار دانشمند مل کر بھی کبھی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے لیکن ایک مومن فراست ایمانی کی بدولت صحیح نتیجہ تک بے تامل پہنچ جاتا ہے اور اس وقت اس کے لئے لازمی نہیں ہوتا کہ مشیروں کی جماعت اگر چہ کتنی ہی بڑی تعداد میں اور کیسے ہی تجربہ کیوں نہ ہو اتباع کرے، بلکہ اصحاب رائے و مجربہ کو مومن کی فراست ایمان کا اتباع کرنا چاہیے ۔ اسی وجہ سے ارشاد ہوا ہے۔

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله .

مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیے ۔ کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

یعنی مومن اگر چہ فراست ایمانی سے کوئی بات کہے اس کو یوں ہی نہ سمجھے وہ جو کچھ کہتا ہے نور خداوندی کی ہدایت سے کہتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ کتب میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص کی نظر راستہ میں اجنبی عورت پر شہوت سے پڑ گئی اس کے بعد داخل ہوا تو حضرت عثمان نے فرمایا بعض شخص مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور آثار زنا ان کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں ۔ اس شخص نے کہا اے امیر المؤمنین کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی آتی ہے ۔ آپ کو کس طرح معلوم ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ وحی نہیں بلکہ فراست مومن ہے۔ ظاہر ہے حضرت عثمان کا یہ فرمانا قیافہ یا آنکھوں کے آثار پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ آپ کو بذریعہ فراست زنا کے آثار کا احساس ہوا اور اسی وجہ سے اس قدر یقین کے ساتھ فرمایا۔ اگر محض رائے وقیاس ہوتے تو کبھی آپ ایسا حکم نہ لگاتے ۔ کیونکہ مؤمن کو محض رائے سے متہم کرنا بھی منع ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ کوئی سمجھے کہ صاحب فراست ایمانی کو مشورہ لینا منع ہے یا وہ مشورہ سے بالکل مستغنی ہے ۔ کیونکہ خود صاحب وحی کو گو کسی مصلحت پر مبنی ہو مشورہ کا حکم

ہے۔ اور صاحب فراست ایمانی جب اس درجہ کا نہیں ہے تو ان کے لئے نہ مشورہ ممنوع ہے اور نہ ایسا مستغنی البتہ بسا اوقات اس کو حاجت نہیں ہوتی۔

پس جہاں تک ہم نے غور کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا منشاء یہ ہے اور یہ درجہ حسن کے پیش نظر نہیں ہے جو محض ایک صاحبِ تدبیر و سیاست وزیر ہے۔ رہا دوسرا اختلاف سو وہ قابلِ التفات و خیال نہیں ہے۔ کیونکہ احتمال کل چار ہیں۔

۱)...... صاحب رائے ہو اور مشورہ بھی کرے۔

۲)...... صاحب رائے ہو اور مشورہ نہ کرے۔

۳)...... صاحب رائے نہ ہو اور مشورہ کرے۔

۴)...... نہ صاحب رائے ہو اور نہ مشورہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چار کے علاوہ ایک درجہ فراست ایمانی والے کا قائم فرمایا جس کو اول صورت میں بیان فرمایا ہے۔ اور ان چاروں میں صرف دو صورتیں بیان فرمائی ہیں اور باقی دو کو انہیں کے اندر داخل سمجھ کر ان کی حالت کو صراحۃً بیان نہیں فرمایا ان کے بیان میں بعد صاحب فراست ایمانی کے دوسرا درجہ اس شخص کا ہے جو مشکلات میں مشورہ کر کے اہل الرائے کی رائے کا اتباع کرتا ہے۔ اس درجہ میں دونوں شخص داخل ہیں جو صاحب رائے ہیں وہ بھی۔ اور جو صاحب رائے نہیں وہ بھی۔ علیٰ ہذا تیسرا درجہ اس شخص کا رکھا ہے جو حیران ہے نہ مشورہ کرتا ہے۔ اور نہ مشیر کا اتباع کرتا ہے۔ اس میں بھی دونوں شخص داخل ہیں جو صاحب رائے ہیں اور مشورہ نہیں کرتے اور جو صاحب رائے بھی نہیں اور مشورہ بھی نہیں کرتے۔

ایسے ہی حسن نے ان چار صورتوں میں سے تین کی تو تصریح کر دی البتہ ایک صورت کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ یعنی جو شخص کہ خود تو صاحب رائے نہیں ہے۔ مگر اہل الرائے سے مشورہ کرتا ہے اس کو نہ کامل رجل میں داخل کیا ہے نہ نصف میں اور نہ لا رجل میں تو وہ داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ اب یا تو کامل رجل ہو گا یا نصف رجل۔ لیکن کامل رجل کہنا بھی بعید

از قیاسِ عقل ہے۔اس لئے لامحالہ نصف رجل میں داخل ہونا بالکل بین وظاہر ہے کیونکہ صورت ثانیہ میں وہ شخص نصف رجل کے درجہ میں رہا جس نے گوذی رائے نہیں ہے مگر اپنے معاملہ کی باگ اہل الرائے کے ہاتھ میں دیدی ہے۔ بدرجہ اولیٰ اس درجہ میں رہے گا۔اوراس کا درجہ اس نصف رجل کے درجہ سے بڑھا رہے گا جو صورت ثانیہ میں بیان کیا گیا بلکہ وہ قریب تر رجل کامل کے ہوگا چونکہ اس کا درجہ ظاہر وباہر تھا۔اس وجہ سے حسن نے صراحتہ اس کا ذکر نہیں کیا۔

غرض اختلاف کچھ نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیان فرمودہ صورت اول سے تو حسن نے بحث ہی نہیں کہ بلکہ باقی چار صورتوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو کا ذکر صراحتاً فرمادیا اور دو کا ضمناً اور حسن نے تین کا ذکر صراحتاً اور ایک کا ضمناً۔

۹)......بعض عقلاء کا قول ہے۔

من بدءَ بالا ستخارة و ثنّى بالاستشارة فحقيق ان لا يخيب رايه .

جو شخص اول اپنے رب سے استخارہ کرے اور پھر وہ کام کرے تو وہ مستحق اس امر کا ہے کہ خائب وخاسر نہ ہو۔

۱۰)......ابن المعتز عباسی کا قول ہے۔

المشورة راحة لک و تعب على غيرک .(مستطرف ص ۶۸،۶۹)

مشورہ تیرے لئے راحت ہے اور دوسرے پر مشقت وتعب ہے

یعنی مشورہ سے دوسرے پر بوجھ پڑ جاتا ہے اور تو خود ہلکا اور ملامت اور شماتت اعداء سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

۱۱)......بعض عقلاء کا قول ہے،

اذااستخار الرجل ربه واستشار صحبه و اجهد رايه فقد قضا ما عليه ويقضى الله فى امر ه مايحب (مستطرف ص۶۸)

جب آدمی اپنے رب سے استخارہ کرلے اور اپنے دوستوں سے مشورہ کرلے اور اپنی دانش کو پورا صرف کر چکے تو وہ اپنا فرض ادا کر چکا۔ اب خدا تعالیٰ اس کے معاملہ میں جو چاہے کرے۔

مطلب یہ ہے کہ نتیجہ کا حسب مدعا ظاہر ہونا نہ بشر کے اختیار میں ہے اور نہ قدرت میں داخل۔ اس کے اختیار میں جو بات ہے اور جس کی پابندی اس کو کرنی چاہیے وہ صرف یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ پیش آئے اور اسکے دونوں جانب فعل وعدم فعل کے مفید نتائج میں متردد ہو تو اوّل اپنے رب سے استخارہ کرے۔ پھر مشورہ اور اس کے بعد اپنی رائے کا زور لگا کر ایک جانب کو اختیار کرے۔

۱۲)...... کان یقال من اعطیٰ اربعًا لم یمنع اربعًا من اعطے الشکر لم یمنع المزید ومن اعطے التو بۃ لم یمنع القبول ومن اعطی الاستخارۃ لم یمنع الخیرۃ و من اعطے المشورۃ لم یمنع الصواب . (مستطرف ص ۶۸)

یہ مقولہ منقول چلا آتا ہے کہ جس شخص کو چار باتیں حاصل ہوگئیں اسے چار امور سے بھی محروم نہیں رکھا جاتا جو شخص نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے وہ مزید نعمتوں سے محروم نہیں رہتا اور جس کو توبہ کی توفیق ہو جاتی ہے۔ قبولِ توبہ سے محروم نہیں رہتا اور جس نے خدا سے استخارہ کرلیا اس کو امور خیر کی توفیق ہوتی ہے اور جس نے مشورہ کرلیا صواب سے محروم نہیں رکھا جاتا۔

۱۳)...... قبیلہ عبس کے ایک شخص سے کسی نے کہا۔ کیا بات ہے تم لوگ معاملات میں خطا بہت کم کرتے ہو۔ اس نے جواب میں کہا۔

نحن الف رجل وفینا حازم واحد فنحن نشاورہٗ فکنا الف حازم . (عقد مزید جلد اول ص ۱۹)

ہم ایک ہزار شخص ہیں۔ اور ہم میں ایک شخص دانشمند، مدبر اور تجربہ کار ہے

ہم اس سے مشورہ کرتے ہیں تو گویا ہم ہزار دانشمند اور مدبر ہیں۔

مطلب یہ کہ ہم بغیر مشورہ کے کام نہیں کرتے۔ اور ایک مدبر و تجربہ کار کا مشورہ قبول کرتے ہیں۔ تو گویا ہم ہزار کے ہزار مدبر و دانشمند ہیں جو مشاورت باہمی کے بعد معاملات طے کرتے ہیں۔ پھر ہم کیونکر خطا پر قائم رہ سکتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب بغیر سوچے سمجھے اس ایک شخص کا اتباع کرتے ہیں بلکہ یہ کہ ہم خود بھی ذی رائے و تدبیر ہیں۔ مگر ایک تجربہ کار دانشمند کا قول سب پر مرجح ہوتا ہے۔ اور انجام میں ہم متفق ہو جاتے ہیں۔ اور یہی قاعدہ عقلاء دنیا کا ہے کہ تجربہ کار و مدبر کا قول ہمیشہ مرجح سمجھا جاتا ہے۔

۱۴)...... ایک شاعر کہتا ہے۔

الرای کاللیل مسود جوانبه و اللیل لاینجلی

الاباصباح فاضمم مصابیح اراء الرجال الیٰ مصباح

رایک تزددضوء مصباح. (عقد مزید جلد اول ص ۱۹)

رائے مثل شب دیجور کے ہے کہ اس کے اطراف سیاہ ہیں۔ اور رات کا اندھیرا بغیر صبح کے زائل نہیں ہوتا۔ لوگوں کی رائے کی مشعل کو اپنے چراغ کے ساتھ ملا لینے سے تیرے چراغ کی روشنی زیادہ ہو جائے گی۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی رائے سے ایک پہلو کو سمجھتا ہے۔ مگر جیسا کہ رات میں اگرچہ قریب کی چیز کا احساس و ادراک ہو جاتا ہے مگر ذرا فاصلہ کی چیز نظر نہیں آتی۔ اسی طرح تنہا اپنی رائے سے تمام پہلو روشن نہیں ہوتے وہ برابر معرضِ خفا میں رہتے ہیں لیکن جب صبح ہو کر شب کی تاریکی زائل ہو جاتی ہے تو مشرق و مغرب جنوب و شمال کی تمام چیزیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب اپنی رائے کے ساتھ دوسروں کی رائے ملا گیا تو گویا ایک چراغ کے ساتھ جس کی روشنی تھوڑی دور تک پھیلی ہوئی تھی ہزاروں شمعوں کو روشن کر دیا اور عالم کے نورانی ہو جانے سے خود اس کے چراغ کی روشنی بھی بڑھ گئی اور اطراف و جوانب کی سب چھوٹی بڑی چیزیں ظاہر و نمودار ہو گئیں۔

سچ یہ ہے کہ اس شاعر نے مشورہ کے فوائد و نتائج کو بہت ہی خوبی اور لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کیسا صحیح ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ان من الشعر لحکمة

(بعض شعر حکمت ہوتے ہیں)

یعنی شعر کو محض تک بندی اور تخیلات کا مجموعہ ہی نہ سمجھو ان میں بہت سی حکمت کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔

۱۵)...... بعض بلغاء فرماتے ہیں:۔

من حق العاقل ان یضیف الی رایہ آراء العقلاء و یجمع الی عقلہ عقول الحکماء فان الرای الفذربما ذل والعقل الفرد ربما ضل.

عاقل کا فرض یہ ہے کہ اپنی رائے کے ساتھ عقلاء کی رائے کا اضافہ کرے۔ اور اپنی عقل کے ساتھ حکماء کی عقل کو جمع کرے کیونکہ اکیلی رائے بسا اوقات ذلیل ہوتی ہے۔ اور تنہا عقل بسا اوقات گم راہ۔

۱۶)...... عرب ایک نابینا شاعر بشار بن برد اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اذابلغ الرای المشورۃ فاستعن بحزم نصیح اونصاحة حازم

جب کسی معاملہ میں مشورہ کی نوبت آئے تو خیر خواہ کی دانشمندی یا دانشمندی کی خیر خواہی سے امداد لینی چاہیئے۔

لاتجعل الشوری علیک غضاضة فان الخوافی قوة للقوادم

مشورہ کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھ، کیونکہ چھوٹے پر شہ پروں کے لئے قوت ہوتے ہیں۔

شاعر نے اول شعر میں مشیر کے شرائط کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی تشریح ہم

مشورہ کے آداب وشرائط میں کریں گے۔ دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے مشورہ لینے کو اپنے لئے حقارت کا سبب نہ سمجھے یہ خیال نہ کرے کسی سے مشورہ لینے میں میری نادانی یا ناواقفیت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ شخص کیسا ہی دانشمند اور تجربہ کار ہو اور مشیر اس درجہ کا نہ ہو۔ کیونکہ قوی کو بھی بسا اوقات ضعیف سے تقویت پہنچ جاتی ہے دیکھو پرند کے بازو میں بہت سے پر ہوتے ہیں ایک وہ جن کو شہپر کہتے ہیں۔ اور پرند کے اڑنے کا مدار انہیں پر ہوتا ہے دوسرے چھوٹے چھوٹے پر جن کو خوافی کہتے ہیں۔

لیکن شہپر اپنی قوت سے کام لینے میں ان پروں کا ایک حد تک محتاج ضرور ہے اور اس کو ان سے قوت ضرور پہنچتی ہے۔

اس بیان کی تائید اس حکمت کے مشہور مقولہ سے ہوتی ہے۔ جو ادب الدنیا والدین میں نقل کیا گیا ہے۔

وقد قيل في منثور الحكم من اكثر المشورة لم يعدم عندالصواب مادحا وعند الخطاء عاذرًا اوان كان الخطاء من الجماعة بعيدًا. (ادب الدنيا والدين ص ۱۲۰)

حکمت کے بکھرے ہوئے موتیوں میں یہ مقولہ بھی ہے جو شخص بکثرت مشورہ کرتا رہتا ہے تو وہ دو حال سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ درصورت صواب اس کے مادح موجود ہوتے ہیں اور درصورت خطا معذور سمجھنے والے۔ اگرچہ ایسا شخص اکثر صواب پر ہی ہوتا ہے کیونکہ ساری جماعت کا خطا پر قائم رہنا ایک امر بعید از عقل ہے۔

۱۷)...... قاضی ابوالحسن ماوردی اس مضمون مذکورہ کی تائید اس طرح کرتے ہیں۔

ولاينبغي ان يتصور في نفسه انه ان شاور في امره ظهر للناس ضعف رايه وفساد رويته حتى افتقر الىٰ راى غيره فان هذه معاذير النوكى وليس يراد الراى للمباهاة

انما یراد للانتفاع بحته والتحرز من الخطاء عند زاللّٰهِ وکیف یکون عارا ماادی الی صواب وعن خطاء .

(ادب الدنیا والدین ص ۱۲۱)

مشیر کو اپنے دل میں یہ خیال کرنا لائق ہے کہ اگر وہ اپنے معاملات میں کسی سے مشورہ کریگا تو لوگوں میں اسکی رائے کا ضعف اور فکر کا نقصان نہ ہوتا کسی کی رائے کا کیوں محتاج ہوتا۔ رائے کا ضعف اور فکر کا نقصان نہ ہوتا تو کسی کی رائے کا محتاج کیوں ہوتا۔ اس قسم کے خیالات احمقوں کے خیالات رائے اور مشورہ فخر ومباہات کے لیے نہیں ہوتے ان سے تو انتفاع مقصود ہوتا ہے جو چیز کہ صواب تک پہنچا دے اور خطا سے محفوظ رکھے وہ عار کی بات کیونکر ہو سکتی ہے۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ مشورہ لینے کے اندر نتیجہ اور فائدہ مترتبہ کا دھیان رکھنا چاہیئے محتاج مشورہ کو اظہار فخر ومباہات کی وجہ سے کہ ہم ایسے مستقل اور صائب الرائے ہیں۔ ہم کو کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ترکِ مشورہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ مشیر کو مشورہ دینے کے وقت اپنی بڑائی اور محتاج الیہ ہونے کی طرف دھیان رکھنا چاہیئے۔ اگر بالفرض مستشیر اپنے فخر ومباہات میں کمی آجانے کے خیال سے مشورہ نہ لے اور نتیجہ خلاف اس کی توقع کے ظاہر ہوا تو وہ چند ساعت کا فخر بھی زائل ہو کر ہمیشہ کی ندامت حاصل ہوئی اور مقصود فوت ہو جانے سے نقصان بھی اٹھایا اور بعد مشورہ مقصود حاصل ہو گیا تو حصول مقصود اس چند ساعت کے فخر سے ہزار مرتبہ فائق و برتر ہوگا بلکہ اس کی دانشمندی حزم وتدبر کا سکہ بیٹھ کر ہمیشہ کا فکر ہو جائے گا۔

۱۸)......بعض بلغاء فرماتے ہیں۔

اذااشکلت علیک الامور وتغیر لک الجمهور فارجع الیٰ رای العقلاء وافزع الیٰ استشارة العلماء ولاتانف

من الاستر شـاد ولا تستنكف من الا ستمداد فلا ن تسال وتسلم خير لک من ان تستبدّ وتند م .

(ادب الدنيا والدين ص ۱۲۱)

جب تجھ کو معاملات میں اشکال پیش آ جائیں اور عام خیالات تجھ سے منحرف ہو جائیں تو تجھ کو عقلاء کی رائے کی طرف رجوع کرنا اور گھبرا کر علماء سے مشورہ کرنا چاہئے۔ طلبِ رشد و امداد میں حیاء و غیرت کرنی چاہیئے لوگوں سے مشورہ لیکر اور دریافت کر کے سالم و غانم رہنا مستقل الرائے بن کر انجام کار نادم و پشیمان ہونے سے بہتر ہے۔

۱۹)...... حکیم لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت دی۔

من جرب الامور فانه يعطيک من رائه ماقام عليه بالغلاء انت تا خذهٔ مجانا .(ادب الدنيا والدين ص ۱۲۱)

تجربہ کار وہ رائے دیتا ہے جو اس کو نہایت گراں قیمت پر ملی ہے۔ یعنی نہایت مشقت و تحمل و صائب کے بعد حاصل ہوئی ہے اور تو اس کو مفت بلا تعب اڑا تا ہے۔

الخطاء مع الاستر شاد احمد من الصواب مع الاستبد اد .

مشورہ اور طلبِ رشد کے بعد خطاء میں مبتلاء ہو جانا اس سے زیادہ محمود ہے تو استقلال رائے سے راہ صواب پر ہو۔

حاصل یہ ہے کہ مشورہ لینے کے بعد اگر چہ رائے خطا پر ہی قائم رہے نتیجہ مطلوبہ حاصل نہ ہو لیکن پھر بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ مستقل اور خودرائی سے نتیجہ مطلوبہ حاصل کرے وجہ اس کی ظاہر ہے کہ نتیجہ کا ترتب نہ مشیر کے ہاتھ میں ہے نہ مستشیر کے اختیار میں۔ عقلاء محض اسباب پر ثمرات کا ترتب دیکھتے ہیں۔ لیکن جب ایک ثمرہ کے لئے

اسباب بہت سے ہوتے ہیں تو پھر اسباب کا نتیجہ تک پہنچ جانا ضروری امر نہیں ہے موانعِ تاثیر اسباب و ترتب نتیجہ سے عائق و مانع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک یا چند عقلاء مل کر تمام اسباب پر مبنی ہو جائیں اور کل موانع کا ان کو علم ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک قسم کے عقلاء جب تجربیات کے متعلق اپنی تمام قوتیں صرف کر چکے تو چاہئے تھا کہ قرن مابعد میں انکشافات جدید کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تو ممکن ہے کہ مشورہ کے بعد بھی صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکے۔ اور بغیر مشورہ تنہا اپنی رائے سے وہاں تک پہنچ جاتا۔

اور جب ترتب نتیجہ کسی کے ہاتھ میں نہیں اور یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے صحیح ہو اور چند عقلاء کی رائے مل کر بھی صحیح نہ ہو۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جب اپنی خودرائی کے باوصف صحیح نتیجہ تک پہنچ کر کسی معاملہ میں باوجود مشورہ مقصود تک رسائی نہ ہوئی تو اس کو اپنی رائے پر زعم ہو جائے اور وہ خودرائی کو مابہ الاعتماد ٹھیرا کر ہمیشہ اسی طریق کو نہ کرنے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر عقلاء کی جماعت جو رائے قائم کرتی ہے وہ صحیح اور منتج ہوتی ہے پس ایسا مستقل الرائے مستبد شخص ایک دفعہ خودرائے قائم کرتا ہے بعد صحیح نتیجہ تک پہنچنے سے ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو جائے گا اور وہ خودرائی کو محمود منتج سمجھ کر بار بار غلط کاریوں میں مبتلا ہوگا اور جب ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ بعد مشورہ اگرچہ خطا پر ہی رہے اس سے بہتر ہوگا کہ استقلال رائے کو صحیح نتیجہ پر پہنچ جائے کیونکہ اول صورت میں وہ ملام و مطعون تو ہوگا اور باقاعدہ نظام عالم مشورہ کا پابند رہ کر مطالب تک پہنچنے پر کامیاب ہوتا رہے گا۔ برخلاف صورت ثانیہ کے کہ جب خود کئے واستبداد کا خوگر ہو کر غلط کار بن جائے گا تو مطعون خلائق جدا ہوگا اور نقصان مائع و شماتتہ ہمسایہ کا مصداق علیحدہ ہوگا۔

۲۱)......ایک شاعر کہتا ہے۔

لیس الرای فی جنب واحد اشیروا علی بالذی تریانی

میرے دوستو رائے ایک شخص کے پہلو میں نہیں ہوئی تم مجھ کو اس بات کا

مشورہ دو جسکو تم بہتر سمجھتے ہو۔ (ادب الدنیا والدین ص ۱۲۱)

۲۲)...... سیف ابن ذی کا قول ہے۔

اعجب برایه لم یشا ورو استبدبر ایه کان من الصواب بعیدا

جس کو اپنی رائے پر گھمنڈ اور زعم ہوتا ہے وہ مشورہ نہیں کرتا اور جو خود رائی سے کوئی کام کرتا ہے صواب سے دور رہتا ہے۔ (ادب الدنیا والدین ص ۱۲۱)

بعض ادباء کا مقولہ ہے:۔

ماخاب من استخار ولا ندم من استشار.

جس شخص نے اپنے رب سے استخارہ کیا نامراد نہیں رہا جس نے مشورہ کر کے کام کیا نادم نہیں ہوا۔ (ادب الدنیا والدین ص ۱۲۰)

بعض حکماء فرماتے ہیں:۔

نصف رایک مع اخیک فشاوره لیکمل لک رایک

تیری رائے کا نصف حصّہ تیرے بھائی کے پاس ہے تجھ کو اس سے مشورہ ضرور کرنا چاہئے تا کہ تیری رائے کامل ہو جائے۔ (ادب الدنیا والدین ص ۱۲۱)

۲۵)...... ایک حکیم فرماتے ہیں۔

من کمال عقلک استظهارک علیٰ عقلک .

تیری دانشمندی یہ ہے تو اپنی عقل کا دوسری عقول کو مددگار بنائے۔

(ادب الدنیا والدین ص ۱۲۱)

۲۶)...... اہل فارس کے مقالات حکیمہ میں کا ایک مقولہ ہے:۔

اضعف الحیلة خیر من اقویٰ الشدّة واقل التأنیّ خیر من اکثر العجلة والدولة رسول القضاء المبرمُ واذا استبدالملک برایه عمیت علیه المراشد .

ضعیف تدبیر نہایت سخت شدۃ سے بہتر ہے تامل وغور کے بعد تھوڑا سا کام عجلت کیساتھ بہت سے کام سے بہتر اور دولت قضا مبرم کا پیام رساں ہے

اور جب بادشاہ اپنی رائے میں مستقل ہو جائے تو ہدایت کے راستے اس سے مخفی ہو جاتے ہیں۔ (ادب الدنیاوالدین ص ۱۲۲)

۲۷)......ایک حکیم کا قول ہے۔

المشورة موكل بها التو فيق لصواب الراى .(مستطرف ص:٦٨)

مشورہ کے ساتھ رائے صواب کی طرف موفق ہونا لگا ہوا ہے۔

۲۸)......**وصف الرجل عضدالدولة فقال لهٗ وجه فيه الف عين وفم فيه الف لسان وصدر فيه الف قلب.**

ایک شخص نے عضدالدولہ کی تعریف میں کہا اس کے چہرے میں ہزار آنکھیں اور منہ میں ہزار زبانیں اور سینہ میں ہزار دل ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ عضدالدولہ خود فہیم صاحب رائے صائب گویا اور مقرر ہے۔ وہ خود اپنی رائے سلیم سے معاملات کے کہنہ اور حقیقت کو سمجھتا ہے اور دوسرے اہل الرائے و تجربہ کار اشخاص سے مشورہ کرتا ہے پس اس کے چہرہ میں صرف دو آنکھیں نہیں بلکہ ہزار ہیں ایسے ہی اس کے منہ میں ایک زبان نہیں بلکہ ہزار زبانیں ہیں یعنی ہر ایک کے ساتھ مناسب حال گفتگو کرتا ہے اور اپنے مطلب و مدعا کو نہایت فصاحت و بلاغت و خوش اسلوبی سے ذہن نشین پر قادر ہے۔ ایسے ہی اس کے سینہ میں ایک دل نہیں بلکہ ہزار ہیں۔ ایک دل میں کتنا ہی ادراک و فراست کا مادہ بھرا ہوا ہو مگر ایک ایک ہی ہے۔ اور جب اسکے ساتھ اور دوسرے روشن دل بھی ملے ہوئے ہیں اور ان کے مفید مشوروں اور سالہا سال کے تجربوں سے منتفع ہو چکا ہو تو اب وہ تنہا نہ رہا بلکہ اس کے ایک دل میں ہزار دل مضمر و مستتر ہیں۔

اس شخص نے عجیب لطافت سے عضدالدولہ کی مدح سرائی کی۔ آدمی میں دو قسم کی خوبیاں ہو سکتی ہیں۔

(۱) صاحب عقل و تدبیر اور فراست و دانش ہو۔

(۲) اہل رائے وتجارب کے مشورہ سے متمتع ہونے میں کسی قسم کی نخوت وکبر مانع نہ آئیں اپنی دانش وتدبیر پر اعتماد کر کے دوسرے عقلاء کے مشوروں سے مستغنیٰ نہ ہو جائے ان کی رائے ومشورہ کو حقیر اور اپنے لئے موجب ننگ وعار نہ سمجھے۔

اس نے عضد والدولہ کی تعریف میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جن سے دونوں قسم کے اوصاف کی طرف اشارہ ہوگیا۔ یعنی یہ خود اتنا دانشمند، عواقب امور پر نظر ڈالنے والا اور ہر معاملہ کی کنہ وحقیقت اور نتائج وثمرات کو سوچنے سمجھنے والا ہے کہ گویا ایک آنکھ سے نہیں دیکھتا اور ایک قلب سے نہیں سوچتا سمجھتا بلکہ اتنا دیکھتا اور اس قدر سمجھتا ہے جتنا ہزار آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور ہزار دلوں سے سوچا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ وہ کسی معاملہ میں تنہا اپنی رائے وعقل سے اہم معاملات کو انجام دینا نہیں چاہتا بلکہ اپنے معتمد علیہ امراء وزراء سے مشورہ لیکر طے کرتا ہے۔

۲۹)......اردشیر ابن مالک کا مقولہ ہے:۔

اربعة تحتاج الی اربعة الحسب الیٰ الادب والسرور الی الامن و القرابة الی المودة والعقل الی التجربة .

چار چیزیں ایسی ہیں جو کارآمد منتج ہونے میں دوسری چار چیزوں کی محتاج ہیں۔ حسب وشرافت ذاتی ادب وتہذیب کے محتاج ہیں۔ اور سرور امن کا قرابت ورشتہ داری محبت ومودت کی عقل تجربہ کی۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی میں ذاتی جوہر شرافت لیاقت کے موجود ہوں۔ لیکن اس کی تہذیب وتادیب کماینبغی نہ ہو تو اس کے ذاتی جوہر بھی زیادہ کارآمد نہیں ہوتے بلکہ یوں ہی رائے گاں جاتے ہیں۔ اور کسی کو خوشی ومسرت کے اسباب نصیب ہوں۔ لیکن امن واطمینان حاصل نہیں ہے تو کیونکر ان اسباب عیش ومسرت سے متمتع ہوسکتا ہے اور باہم قرابت ورشتہ داری تو ہو مگر معاملہ مودت ومحبت گم ہے تو ایسی قرابت کیا کام دے سکتی ہے

علیٰ ہذا کتنا ہی دانشمند صاحبِ عقل وہوش ہو مگر تجربہ کار نہیں تو تنہا اس کی عقل چنداں مفید نہیں بلکہ ناتجربہ کاری کی حالت میں عقل کی تیزی کبھی مضر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے آزمودہ ہونے کے لئے مشاورۃ ارباب تجربہ نہایت ضرور و لازمی جز ہے۔

۳۰)...... امیر مہلب ابن ابی صفرہ کہا کرتے تھے:۔

ان من البلية ان يكون الرأى بيد من يملكه دون من يبصره.

سخت اور شدید تر مصیبت یہ ہے کہ رائے اس شخص کے ہاتھ میں ہو جو اس کا مالک ہے۔ اور جو رائے کے تمام پہلوؤں کو دیکھتا ہے اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ (مستطرف جلد اول ص ۶۸)

یعنی محتاج مشورہ یا تو اہل الرائے سے مشورہ ہی نہ کرے اور یا کرے مگر اس کی رائے پر عمل نہ کرے اور خود اپنے معاملات کو طے کر لیا کرے۔

۳۱)...... بعض حکماً سے دریافت کیا گیا کن کن امور سے عقل کی تائید وتقویت ہوتی ہے اور وہ کیا باتیں ہیں جن سے عقل کو سخت نقصان ومضرتیں پہنچتی ہیں۔

فقال اشدها تائيد اله ثلاثة اشياء مشاورة العلمأ وتجربة الامور وحسن التثبت واشدها اضرارا به ثلاثة اشياء الاستبدادو التهاون والعجلة.

حکیم نے جواب دیا کہ عقل کو سب زیادہ تین چیزوں سے تائید پہنچتی ہے۔ اول علماء سے مشورہ کرنا، دوسرے معاملات کا تجربہ ہونا، تیسری رائے میں متانت وثبات ہونا اور سب سے زیادہ مضرت بھی اس کو تین چیزوں سے پہنچتی ہے خودرائی واستقلال، تغافل وسستی اور جلد بازی سے۔

مشاورۃ اور تجربہ دو جداگانہ باتیں ہیں۔ مشاورۃ سے طریق حق وصواب کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص معاملات میں مبتلا ہو کر تجربہ حاصل نہ کرے تو تنہا

مشورہ لینا عقل کی تائید وتقویت کے لئے کافی نہیں ہے اس کی عقل جبھی کامل ومکمل ہوتی ہے۔ جب معاملات میں خود مبتلا ہو کر اہم کاموں کو سرانجام دے اور سرد وگرم حالات کے ذائقہ سے خود واقف ہو جائے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ علماء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو معاملات کا اور خصوصاً اس قسم کے معاملات کا جسمیں مشورہ لیا جائے علم اور تجربہ ہو۔ خاص کسی فن کے عالم یا شریعت کے علم مراد نہیں ہیں۔ ہاں اگر شریعت کے عالم متقی ومتدین صاحب فراست ایمانی ہوں تو ان کا مشورہ دوسروں کے مشورہ سے بہت سے معاملات میں مرجح سمجھا جائے گا۔

۳۲)...... ایک حکیم نے دوسرے حکیم کو کسی معاملہ میں مشورہ دیا تو مشورہ لینے والے حکیم نے اظہار شکر وامتنان کے موقعہ پر کہا:۔

لقد قلت بما يقول به الناصح الشفيق الذى يخلط حلو كلامه بمره وسهله بو عره ويحرك الاشفاق منه ماهو ساكن من غيره وقد وعيت النصح مر قبلتهٗ اذكان مصدره من عند من لا يشك فى مودته وصفاء غيبه ونصح حبيبه و مازلت بحمد الله الى الخير طريقا واضحا ومنا را بينا.

تو نے ایسے ناصح مہربان کی بات کہی جو اپنی شیریں کو تلخی کے ساتھ اور سہل اور آسان کو دشواری کے ساتھ ملاتا ہے اور جس کی شفقت ومہربانی اس کے اندر ایسی ہمدردی کو حرکت میں لاتی ہے جو دوسروں کے اندر حالت سکوں میں ہے۔ میں نے نصیحت کی بات کو سمجھا اور قبول کیا۔ کیونکہ وہ اس شخص سے صادر ہوئی جس کی دوستی غائبانہ اخلاص اور دوست کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی میں شک وتردد کی گنجائش نہیں ہے خدا کا شکر ہے کہ تو ہمیشہ سے خیر کی طرف کھلا ہوا راستہ اور روشنی کا منار رہا ہے۔

حاصل یہ کہ خیر خواہی وہمدردی اور مشورہ نیک میں بسا اوقات ایسے الفاظ اور ایسے

لہجہ کا استعمال کرنا پڑتا ہے جو خلاف طبع اور ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی طالب مشورہ کی رائے کا میلان ایک جانب ہوتا ہے۔ اب اگر مشیر کے اندر اخلاص کامل و ہمدردی تام نہیں ہے تو وہ بوجہ رعایتِ مزاج ہاں میں ہاں ملا دیتا ہے اور اگر ہمدردی پوری ہے تو اس کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ حسب ضرورت سخت اور درشت لہجہ میں بھی رائے دینے سے درگزر نہیں کرتا۔ یہ ظاہری صفائی اور درشتی اگرچہ تلخ معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اندر وہ شیرینی ہے جس کی لذت سے ہمیشہ نفع اٹھاتا ہے۔ لیکن ظاہری تلخی کو برداشت کرنا اور اندرونی حلاوت پر نظر رکھنا بھی دانشمند لوگوں کا کام ہے اور اسی دانش وتدبر کا نتیجہ ہے کہ یہ حکیم اپنے مشیر کا ایسے شاندار الفاظ میں شکریہ ادا کرتا ہے۔

۳۳)..... حکمت کے بکھرے ہوئے موتیوں میں سے ایک مقولہ یہ بھی ہے۔

كل شيء يحتاج الى العقل والعقل يحتاج الى التجارب ولذلك قيل الايام تهتك لك عن الاستار الكامنة .

ہر چیز عقل کی محتاج ہے اور عقل تجربوں کی حاجتمند ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ زمانہ پوشیدہ اور مخفی امور پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

(عقد فرید ص:۱۲۰)

۳۴)..... بعض حکماء کا قول ہے۔

التجارب ليس لها غاية و العاقل منها في زيادة .

تجربوں کی کوئی انتہا اور غایت محدود و معین نہیں ہے عاقل کے تجربات ہمیشہ ازدیا میں رہتی ہیں۔ (عقد فرید ص:۱۲۰)

(۳۵) ایک حکیم فرماتے ہیں۔

من استعان بذوى العقول فاز بدرك المامول .

جو شخص ذوی العقول کی رائے اور مشورہ سے مدد حاصل کرتا ہے حصولِ مدعا میں کامیاب ہوتا ہے۔ (عقد فرید ص ۱۲۰)

وضرورت، اس کی غرض وغایت، فوائد ونتائج، ثمرات وبرکات کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ اس بارہ میں اس سے زیادہ نقلِ روایات واقوال کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے اسی قدر پر یہاں کفایت کر کے اب ہم مشورہ کے دوسرے مراتب پر بھی اسی طرح تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ مشورہ کے چار رکن ہیں۔

(۱) معاملات قابل مشورہ۔

(۲) اہلیتہ مشورہ۔

(۳) مستشیر یعنی محتاج وطالب مشورہ۔

(۴) مشیر یعنی مشورہ دینے ولا۔

معاملات قابل مشورہ کی تفصیل وتوضیح

سابق بیانات سے مشورہ کا اہم ضروری منتج خیر و برکت ہونا اور ترکِ مشورہ کا موجبِ ابتلاء خطرات مہلکہ وندامت وپشیمانی خیبتہ وخسران ہونا معلوم ہو چکا۔ لیکن ابھی یہ بیان کر دینا باقی ہے کہ مشورہ جب ایسا اہم اور ضروری ہے تو اس کا حکم ہر چھوٹی بڑی جلیل وحقیر بات کو مشتمل ہے یا کچھ معاملات اس سے مستثنٰی بھی ہیں جن میں مشورہ کی حاجت نہیں یا جن میں مشورہ کرنا بجائے رحمت ہونے کے موجب ہلاکت ہو جاتا ہے سو معلوم کرنا چاہیئے کہ مشورہ کا ایسے معاملات میں حکم ہے جس کی دونوں جانب محتمل نفع وضرر ہوں اور شریعت یا عقل یا عادت کے اعتبار سے کوئی جانب متعین اور یقینا ثمر منفعت نہ ہو۔ اگر معاملہ ایسا ہے جس میں شریعت سے حکم صادر ہو چکا۔ اس کے طریقے اور حدود معین کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں کسی سے مشورہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ بسا اوقات مشورہ نہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اوقات نماز کا ادا کرنا یا فریضہ زکوٰۃ یا حج وصوم سے سبکدوش ہونا ان معاملات میں شریعت کا صاف وصریح حکم موجود ہے۔ ان کے شرائط وادا کی مکمل

تعلیم دی جاچکی ہے اب بوقت نماز منادی خدائے جل وعلا با آواز بلند مسلمانوں کو خانہ خدا کی طرف اداء نماز کے لئے بلاتا ہے ایسی حالت میں کوئی شخص مشورہ کرنے بیٹھے کہ اس وقت نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں عین حماقت و نادانی میں داخل ہوگا اور یہ مشورہ یقیناً معصیت ہوگا۔ البتہ اداء فرض کے مختلف اسباب و ذرائع اور طریق میں سے کسی ایک طریق کو اختیار کرنے میں علماء یا اطباء یا اہل عقل و تجربہ سے مشورہ کرے تو جائز بلکہ بعض حالتوں میں واجب ہوگا۔ مثلاً ایک شخص مریض ہے اس کو تردد ہے کہ مجھ کو ایسی حالت تیمم کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں اطباء یا تجربہ کاروں سے مشورہ کرسکتا ہے یا حج کے لئے امن طریق شرط ہے۔ قافلے کئی راہ سے جاسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض راہ پر خطرہ ہوں اور بعض نہ ہوں یا بعض میں کم خطرہ ہو اور بعض میں زیادہ۔ ان راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے اندر مشورہ کرنا درست ہے یا ضروری ہے یا مثلاً کسی پر دشمن حملہ کرتا ہوا چلا آتا ہے اس کو جان بچانے کے لئے اپنی حفاظت ضروری ہے۔ ایسی حالت میں مقتضاء عقل یہ ہے کہ ہر ممکن صورت سے دشمن کی مدافعت کرے۔ یہ وقت نہیں کہ دشمن تو سر پر پہنچ گیا ہو اور یہ شخص احباب مخلصین اور تجربہ کار اہل سے مشورہ کی فکر میں رہے یہ اسی فکر میں رہیگا اور دشمن اس کا کام تمام کردے گا۔ ہاں اگر اس قدر مہلت ہے تو اس کو مدافعت عدو اور محافظت نفس کے مختلف طریق میں سے کسی ایک طریق کو اختیار کرنے میں مشورہ کرنا مناسب یا ضروری ہوگا یا مثلاً بھوک اور پیاس کے وقت روٹی کھانا یا پانی پینا ان امور میں سے ہے جو امور طبعیہ میں داخل ہے۔ عقل اور عادت کا صاف فتویٰ یہ ہے کہ بھوک کے عذاب سے بغیر روٹی کھائے نجات نہیں ہوسکتی اور شدت تنگی کی آگ بلا پانی کے فرو نہیں ہوسکتی۔ ان امور طبعیہ میں مشورہ کی حاجت نہیں ہاں اس کے ذرائع یا ترک یا مختلف اغذیہ اور اشربہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں اگر کسی کے اندر خطرہ کا احتمال ہو تو مشورہ کرنا مستحسن یا ضروری ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن امور کا حکم یا نتیجہ متعین ہے یا وہ امور طبعی میں ہیں۔ ان کے

اندر مشورہ کی حاجت نہیں۔ اگر مشورہ کا حکم ایسا عام رکھا جائے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام خواہ امور طبعیہ عادیہ میں داخل ہو یا امور شرعیہ میں بلا مشورہ نہ کیا جائے تو علاوہ اس کے کہ بہت سے مواقع میں مشورہ معصیۃ کی حد میں داخل ہو جائے گا۔ مشورہ جس غرض و غایت کے لئے مشروع کیا گیا یا ضروری یا مستحسن سمجھا گیا ہے۔ وہ باقی نہ رہے گا وہ بجائے رحمت کے زحمت اور بجائے مفید و منتج خیر و برکات ہونے کے مضر اور مثمر خطرات ہو جائے گا۔

مشورہ انہی امور میں ضروری یا مستحسن ہے جن میں کوئی جانب شرعاً عقلاً عرفاً عادتاً معین نہیں اور جن کے مختلف جوانب میں خطرات و منافع کا احتمال ہے جن کے نتائج مبہم اور مخفی ہیں۔

پھر معاملات کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ بعض ایسے امور ہیں کہ انکے منافع وخطرات دونوں معمولی اور کم درجہ کے ہیں اور بعض کے منافع بھی زیادہ اور خطرات بھی اہم۔ ان معاملات کی نوعیت اور منافع وخطرات کی عظمت وقوۃ ووقعت وضعف کے اعتبار سے مشورہ کے حکم استحسان میں فرق ہو جائے گا۔ بعض مواقع میں مشورہ نہایت اہم اور ضروری ہوگا۔ اور بعض جگہ درجہ استحسان میں رہے گا۔

خداوند عالم نے مشورہ کو انسانی مصالح کا رکن اعظم بنایا۔ ارباب عقول کو اس کی پابندی کا حکم دیا مگر اس نے اپنی رحمت عامہ کی بناء پر انسان کو مقید نہیں کیا کہ کوئی معاملہ بلا مشورہ کر ہی نہ سکے بسا اوقات اہم معاملات پیش آتے ہیں۔ اور ایک تجربہ کار انسان کو اس کے انصرام وحل کا طریقہ معلوم ہوتا ہے جس کے خلاف ورزی کو وہ مہلک سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کسی صاحب عقل و دانش سے مشورہ کرے گا تو اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں بتلا سکتا ایسی حالت میں اگر وہ بلا مشورہ کام کر بیٹھے تو ملام و مطعون نہ ہوگا۔

اہلیت مشورہ:

مشورہ کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں اوصاف ذیل موجود ہوں:۔

الف)...... مشیر میں عقل کامل اور تجربہ تام ہو۔ کوئی شخص بغیر ان اوصاف کے کامل و مکمل نہیں ہوتا۔ عقل نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا شمار ذوی العقول میں کرنا بھی فضول اور لغو ہے۔ اور اگر عقل ہو لیکن ناقص تو جسقدر نقصان عقل میں ہے اس کی انسانیت میں اسی قدر نقصان ہے۔

ب)...... صاحب عقل و تجربہ ہونے کے بعد دوسری شرط اہلیۃ کی یہ ہے کہ مشیر میں ہمدردی خلق اللہ و خیر خواہی کا مادہ عموماً اور مستشیر کے ساتھ خصوصاً موجود ہو اس کے اخلاق مہذبہ و خصائلِ حمیدہ اس کی اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ کسی کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ کرے۔ خصوصاً اس شخص کے ساتھ جو اپنے معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں دے کر خود سبکدوش ہو رہا ہے اگر مشیر میں باوجود عقل کامل و تجربہ نصح و ہمدردی کا مادہ عموماً موجود نہیں۔ یا کم از کم متشیر کے ساتھ یا تو ہمدردی کا داعیہ اس کے قلب میں نہیں ہے یا بجائے ہمدردی کے اس کے ساتھ بغض و عداوت، حسد و کینہ بدخواہی موجود ہے تو ایسا شخص عموماً قابل مشورہ نہیں ہے اور خاص کر اس شخص کے لئے تو اس کا مشورہ سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

غرض وصف اول کے ساتھ اس دوسرے وصف کا پایا جانا بھی ضروری ہے ورنہ عاقل تجربہ کار کا مشورہ بجائے مفید ہونے کے زیادہ مضر ہو جاتا ہے جیسا کہ اس ہمدرد ناصح و شفیق کے مشورہ سے پرحذر رہنا ضروری ہے جو کُو دن کم عقل، جاہل و غفلت شعار ہے اس سے زیادہ ایسے شخص کے مشورہ سے پرہیز رکھنا واجب ہے جو دانشمند و فہیم مجرب و آزمودہ کار تو اعلیٰ درجہ کا ہے مگر اس میں مادہ خیانت و بدخواہی موجود ہے۔

حضرت عبداللہ ابن الحسن رضی اللہ عنہ صاحب زادہ محمد بن عبداللہ کو نصیحت فرماتے ہیں۔

احذر مشورة الجاهل وان كان ناصحًا كما

تحذر عداوة العاقل اذا كان عدوا فانه يوشك ان

يورطك بمشورته فيسبق اليك مكر العاقل وتور

يط الجاهل

جاہل اگرچہ خیر خواہ ہو مگر اس کے مشورہ سے بچنا چاہیئے جیسا کہ دانا دشمن کی عداوت سے کیونکہ کچھ بعید نہیں کہ اپنے مشورہ سے وہ تجھ کو بلا کی میں دھکیل دے اور عاقل کی مکر و تدبیر اور جاہل کی نادانی تجھ کو آ دبائے۔

اسی مضمون کو ابو اسود دولی اس طرح ادا کرتے ہیں۔

وما كل ذى لب عبو تيك نصحه وما كل مؤت نصحه بلبيب

ولكن اذامااستجمعا عنه صاحب فحق له من طاعة ينصيب.

ہر ذی عقل تیرا خیر خواہ نہیں ہوتا اور نہ خیر خواہ دانشمند ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ دونوں وصف کسی میں جمع ہو جائیں تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

بعض حکماء کا قول ہے۔

لاتشاور الاالحازم غير الحسو دو اللبيب

غير الحقودو اياک ومشاورة النساء فان رابهن الى الا

فن وعز مهن الى الوهن.

تجھ کو سوا صاحب حزم غیر حاسد اور دانشمند غیر کینہ ور کے کسی سے مشورہ نہ کرنا چاہیئے۔ عورتوں کے مشورہ سے قطعاً پرہیز رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی رائے کا میلان فساد کی طرف اور عزم کا سستی کی جانب ہوتا ہے۔

ج۔ مشیر میں علاوہ عقل کامل و تجربہ تام و نصح و ہمدردی مخلوق کے عموماً یا خصوصاً اور موجودگی اخلاق مہذبہ اور تدین عقلی کے تدین مذہبی، تقویٰ و صلاحیت کا ہونا بھی منجملہ شرائط اہلیۃ کے ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ آدمی کو اخلاق حمیدہ و ملکات پسندیدہ اور عقل کامل، کذب و خیانت، مکر و تزویر، حیلہ سازی و دغا بازی سے خود بھی مانع ہوتے ہیں۔ خواہ وہ شریعت منزلہ کے ارکان کا پابند ہو یا نہ ہو۔ اور

اسی درجہ کو تدین عقلی یا عرفی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ درجہ مشیر کے لئے ایسا ضروری لازم ہے کہ بدون اسکے وہ قابل مشورہ ہو ہی نہیں سکتا یہاں تک کہ اگر وہ شریعت منزلہ کا تابع بھی ہے لیکن ان اوصاف کے ساتھ متصف نہیں ہے تب بھی وہ مشورہ کا اہل نہیں لیکن تدین عقلی وعرفی کے ساتھ اس میں تدین مذہبی بھی پایا جائے تو اس کی اہلیۃ مکمل ہے۔ اور ایسے شخص سے مشورہ کرنا تمام غوایل ونقایص سے مامون ومطمئن کردیتا ہے کیونکہ دینداری وتقویٰ شعاری نے اس کے قلب کو آلایش ونفسانیت وکدوراتِ باطن سے پاک وصاف کردیا ہے اور اس کے اندر گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ خلاف ہمدردی ونصح کوئی بات کہہ سکے۔

عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

من ارادامر افشاور فیه امرً امسلمًا وفقه اللّٰه لأرشد اموره.

جو کسی کام کا ارادہ کرے اور مرد مسلم سے مشورہ کرے تو خداتعالیٰ اس کو بہترین امور کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ تدین عقلی کے ساتھ تدین شرعی بھی مجتمع ہوجائے تو اس کی اہلیۃ مشورہ کامل ومکمل ہوجائے گی کیونکہ بسا اوقات عقل کامل وتجربہ تام کے باوصف کبھی آدمی کو اتباعِ عقل ہی کسی ایسے امر کا استحسان ذہن نشین کردیتا ہے جو مستشیر کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ لیکن اتباعِ شریعت اخلاق حمیدہ کے علاوہ اس کے دوسری حیثیت سے بھی پابند کئے ہوئے ہے جو کسی طرح سواء نصیحت وخیرخواہی کسی دوسرے امر کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اسی وجہ سے مشورہ کے لئے مسلمان کو منتخب کرنا ازبس ضروری ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ جامع اوصاف مذکورہ متبع شریعت نہ مل سکے تو ایسی حالت میں غیرمسلم سے بھی مشورہ لینے میں کچھ حرج نہیں۔ یہ ایسی شرط نہیں کہ بغیر اس کے اہلیۃ مشورہ پائی ہی نہ جائے۔

تاریخ وسیر کی ورق گردانی سے ثابت ہے کہ بہت سے مواقع میں ان کفار اور ذمیوں سے مشورہ کیا گیا جن کی نصح وعقل پر دوسرے ذرائع سے اطمینان ہو چکا ہے۔ اور یہ امر مستشیر کے تجربہ کے حوالہ کیا جاسکتا ہے۔

مشورۂ نکاح نوح ابن ابی مریم قاضی مرد نے اپنی صاحبزادی کا نکاح کرنا چاہا تو ایک مجوسی یعنی آتش پرست سے جو ان کے پڑوس میں رہتا تھا اس بارہ میں مشورہ کیا۔ مجوسی نے تعجب سے کہا کہ تمام لوگ تو آپ سے مشورہ کرتے اور امور دینیہ میں فتویٰ لیتے ہیں اور آپ مجھ سے مشورہ لیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا نہیں تم کو مشورہ دینا چاہیئے اس نے کہا بادشاہ فارس کسریٰ تو مال کو ترجیح دیتا تھا یعنی مالدار کو غیر مالدار پر مرجح سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک مال ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے عزت ووقعت بڑھتی تھی اور لڑکیوں کی راحت وآسایش اسی میں سمجھی جاتی تھی اور قیصر روم جمال کو پسند کرتا تھا۔ کیونکہ مقصود نکاح سے زوجین میں مودت والفت ہے اور یہ بات جمال کی حالت میں زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے دختر ہو یا فرزند اس کے لئے صاحب جمال کو ترجیح دیتا تھا۔ مال وغیرہ ان امور میں نہیں جن کو اصل مقصود نکاح (موجب تفریق وتکالیف اور نزاع ومخاصمت ہوجاتا ہے) جمال کے ساتھ نکاح موجب تفریق وتکالیف اور نزاع ومخاصمت ہوجاتا ہے اور رئیس عرب شرافت خاندانی اور حسب کو ترجیح دیتا تھا یعنی ان کے نزدیک زوجین کا شرافت حسبی ونسبی میں ہم رتبہ ہونا زیادہ مرجح تھا اور تمھارے (اہل اسلام کے) سردار یعنی اگر کوئی دیندار ومتشرع تو ہے مگر صاحبِ مال و جمال وشرافت نہیں تو ایسے شخص کو اس پر ترجیح دیتے تھے جس میں یہ امور تو موجود ہیں مگر دیندار نہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ کس کی اقتداء کو پسند کرتے ہو۔ آیا فارس وروم وعرب کے رؤسا کے اتباع کو یا اپنے سردار پیغمبر کے۔

حاصل اس کے مشورہ کا یہی تھا کہ تم کو اپنی صاحبزادی کے عقد کے لئے صاحب دین کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ اگر اس کے ساتھ وہ صاحب مال و جمال وشرافت بھی ہو نور علیٰ نور ہے۔ اور یہ مشورہ ظاہر ہے کہ بالکل صحیح وسچا اور مخلص خیر خواہی پر مبنی تھا۔ اور یہ ظاہر ہے

کہ قاضی صاحب کو اپنے پڑوسی کے تدین عقلی یا عرفی اور اس کی عقل و تجربہ پر نہ ہوتا اس کی خیر خواہی میں تردد یا شک ہوتا تو ہرگز اس سے مشورہ نہ کرتے۔ لیکن یہ امر کچھ مجوسی ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اگر مسلمان کی عقل و نصح پر بھی اعتماد نہ ہوتا تو اس سے بھی مشورہ نہ کرتے غرض یہ ہے کے غیر مسلم میں یہ اوصاف پائی جائیں۔ تو بھی اہل مشورہ ہے ہاں ختی الوسع مسلم سے مشورہ کرنا چاہیئے۔

فائدہ:۔ نکاح کے لئے چار امور مال و جمال حسب و دین کا موجب رغبت ہونا پھر شریعت محمدیہ میں دین کو سب امور پر ترجیح دینا اس حدیث کے مضمون سے ماخوذ ہے جس کو بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

ان رسول اللّٰہ قال تنکح المرأة لاربع لما لها و لحسبها وجما لها و لد ينها فاظفر بذات الدين تربت يداک.

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی عورت کی طرف نکاح کی رغبت یا تو مال کی وجہ سے ہوتی ہے یا جمال وحسب اور دین کی وجہ سے تجھ کو چاہیئے کہ دیندار عورت سے نکاح کرے۔

ان چار اوصاف موجب رغبت کے علاوہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک پانچواں وصف اور بھی بیان فرمایا یعنی اخلاق حمیدہ۔ چنانچہ امام احمد نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اور اسی طرح بزاز۔ ابو یعلی اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم تنکح المراۃ احدی خصال لجما لها ومالها وخلقها ودينها فعليک بذات الدين والخلق تر بت يينک.

عورت کے خصائل مذکورہ میں سے کسی ایک خصلت کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ جمال و مال خلق اور دین کی وجہ سے تم کو چاہیئے کہ صاحب دین اور خلق کو پسند کرو۔

اس حدیث میں حسب کا ذکر نہیں ہے جو اور احادیث میں مذکورہ ہے۔ اس کو ملا کر اسباب رغبت نکاح کل پانچ ہوتے ہیں۔ مال، جمال، حسب، اخلاق و دین۔ آپ کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان سب میں دین کو ترجیح ہے اگر کسی مرد یا عورت میں مال و جمال حسب و اخلاق حسب یا بعض موجود ہوں مگر دین نہ ہو تو ایسے اسباب کی طرف رغبت کرنے کو آپ نے ناپسند فرمایا ہے۔ اور یہ اوصاف کسی میں کل کے کل یا بعض نہ ہوں مگر دین ہے تو آپ اس کو تمام اوصاف کے جامع سے مرجح فرماتے ہیں۔

لیکن یہ امر بھی قابل تفصیل ہے کہ جیسا دین کا لحاظ سب پر مقدم ہے، ایسے ہی علاوہ دین کے باقی سب اوصاف رغبت ترجیح میں یکساں ہیں یا ان میں بھی بعض کو بعض پر فوقیت و ترجیح حاصل ہے، مگر اس کا یہ موقع نہیں ہے انشاء اللہ تعالیٰ کسی وقت اس کی تفصیل بھی کی جائے گی۔

د)...... جس شخص سے مشورہ لیا جائے اس کا قلب ایسے ہجوم و افکار سے خالی ہو۔ جن کی وجہ سے دماغ پریشان اور قلب مشغول ہو جاتا ہے ایسا شخص باوجود عقل تام و تجربہ کامل نصح و ہمدردی۔ تدین و تقویٰ شعاری کے صحیح اور معقول مشورہ دینے سے عاجز و قاصر رہتا ہے کیونکہ وہ خود اپنے خیال میں ایسا مبتلا ہے کہ نہ معاملہ مشورہ طلب میں اپنی پوری عقل لڑا کر اس کی تمام جوانب کو سوچ سکتا ہے اور نہ مستشیر کی رہبری کر سکتا ہے وہ خود۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند کا مصداق بن رہا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ شخص باوجود اوصاف و شرائط اہلیۃ مشورہ کے ایک امر عارض کی وجہ سے صحیح مشورہ دینے پر قادر نہیں ہے صالح ابن عبدالقدوس اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ولامشير كذى نصح ومقدرة فى مشكل الافاختز ذاك منصحا

نہیں ہے مشیر مثل ایسے شخص کے کہ جو خیر خواہ ہو اور مشکلات میں دستگیری کرنے والا ہو کسی ایسے کو ناصح بنا۔

کسریٰ ملک فارس کا دستور تھا کہ اپنے وزراء اور مشیر کاروں کو تمام تر ددات افکار سے فارغ البال رکھتا تھا۔ اگر کسی معاملہ میں ان کی رائے وزن دار نہیں پاتا تھا تو سمجھ لیتا تھا کہ کسی میں مبتلا ہیں۔ اور اسی وقت اہل کاروں کو بلا کر سزائیں دیتا تھا کہ تم نے ان کو ماہوار اور معین روزینوں میں کمی کی ہے جس کی وجہ سے ان کے طبائع متفکر اور بحال خود مشغول ہیں۔ دماغ ان کا پریشان اور عقل ان کی سالم نہیں ہے۔ حاصل اس شرط کا بھی یہی ہے کہ مشیر کی عقل کامل اور سالم ہے۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ شرط اول میں تو اصل فطرت سے عقل کا وجود و کمال بیان کیا ہے اور اس میں بقاء اور سلامتی، اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشیر کا افکار و تر ددات میں مبتلاء ہونا اس کو اہلیۃ مشورہ سے خارج نہیں کر دیتا ہاں چونکہ ایسی حالت میں بوجہ نقصان عقل و فکر مضرت کا اندیشہ ہے اس لئے وہ عارضی طور پر اس قابل نہیں رہا کہ اس سے مشورہ کیا جائے اگر کسی شخص کی رائے و عقل پر اس درجہ اعتماد ہو کہ وہ ابتلاء افکار و ہجوم حوادث کے باوصف مختل الحواس نہیں ہو جاتا بلکہ ایسی حالت میں بھی جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے وہ جچی تلی ہوتی ہے۔ تو اس سے مشورہ کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے تاہم اس میں اور اس شخص میں جو باجود تمام اوصاف مذکورہ کی موجودگی کے افکار و تر ددات سے بھی خالی ہے۔ فرق ضرور ہوگا کیونکہ اطمینان و غیر اطمینان کی حالت مساوی نہیں ہو سکتی۔ ایک فارغ القلب و سلیم الحواس جہاں تک اپنی فکر کو دوڑا سکتا ہے اور غور و فکر سے بات کی تہ کو پہنچ سکتا ہے اور اسی بناء پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص باوجود سلیم الحواس مطمئن القلب افکار و تر ددات سے خالی ہونے کے کسی دوسری امر کی طرف متوجہ ہے اس کی اہلیۃ میں بھی اسی قدر نقصان ہے۔ مثلاً سفر کی عجلت میں ہے یا حوائج بشری کے انصرام کی طرف متوجہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

(۵) جس امر میں مشورہ لیا جاتا ہے۔ مشیر کی اغراض و خواہشات کا اس سے تعلق نہ ہو یعنی اس کو کوئی ذاتی غرض اس سے متعلق نہ ہو۔ اگر اس کی ذاتی غرض کا اس امر سے تعلق ہے تو باوجود تمام اوصاف مذکورہ موجود ہونے کے اس کا مشورہ قابل اعتماد نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ غرض ذاتی اور خواہش نفسانی طبعاً آدمی کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتی

ہے کہ اس کو خود بھی بہت کم احساس ہوتا ہے بے اختیارانہ اس وہ بہت سرزد ہو جاتی ہے جو مستشیر کے حق میں مضر ہوتی ہے آدمی کی رائے ایسی حالت میں ہرگز صحیح قابل اعتماد و لائق وثوق نہیں ہوتی ۔ صاحب عقول و آراء صحیحہ وفطرۃ سلیمہ بھی اس موقع پر اپنے درجہ سے گر جاتے ہیں ۔ فضل ابن عتبۃ ابن ابی لہب فرماتے ہیں ۔

وقد یحکم الایام من کان جاھلا ویردی الھوی ذالرأی وھو لبیب

زمانہ کبھی ایسے شخص کے درجہ کو محکم کر دیتا ہے جو جاہل ہے اور کبھی خواہش نفس صاحب رائے و دانشمند کو گرا دیتی ہے ۔

ویحمد فی الامر المفتی وھو مخطی ویعذل فی الاحسان وھو مصیب

اور کبھی آدمی باوجود خطا پر ہونے کے شکر گزاری کا مستحق ہوتا ہے اور کبھی باوجود احسان کرنے اور صواب پر ہونے کے قابل ملامت بن جاتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات ایک جاہل غیر ذی رائے خیر خواہی ہمدردی کے ساتھ مشورہ دینے کی وجہ سے خواہ اس کا مشورہ انجام کار مفید ہو یا مضر محسود اور قابل ستائش ہو جاتا اور اس کی وقعت نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور خود غرضی وہواء، نفسانی عاقل و دانشمند کو اس کے درجہ سے گرا دیتی ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ باوجود غرض مشترک ہونے کے ہر شخص ایسا نہیں ہوتا ۔ جس کو مشورہ میں متہم سمجھا جائے ۔ بہت ایسے افراد ہوتے ہیں کہ مشورہ کے وقت مستشیر کی اغراض ومنافع کو پیش نظر رکھ کر مشورہ دیتے اور اپنی خواہش قلبی کو پس پشت ڈالیں ۔ مگر قواعد کے تدوین وتمہید میں اکثریات پر نظر ہوتی ہے متثنیات کا خیال نہیں کیا جاتا اور اسی وجہ سے قاعدہ کلیہ یہی ہے جو ہم نے بیان کیا ۔ اگر کوئی فرد اس سے مستثنیٰ ہو اور مستشیر کو باوجود غرض مشترک ہونے کے اس کے تدوین وتقویٰ پر اعتماد ہو تو یہ صورت جداگانہ ہوگی شریعت غرّاء نے بھی اس قسم کے معاملات میں اغراض مشترکہ کا خیال کر کے قواعد کلیہ بنا کر ہم کو دیئے ہیں ۔ دیکھئے ماں باپ کی شہادت اولاد کے حق میں معتبر نہیں ہے علیٰ ہذا اولاد کی

شہادت ابوین کے لئے اور زوجین کی شہادت ایک دوسرے کے لئے، آقا کی شہادت مملوک غلام کے لئے اور غلام کی آقا کے لئے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ آپس میں منافع و اغراض مشترک ہیں۔ باپ کو نفع بیٹے کا ہوتا ہے۔ وعلی ہذا۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دیندار اور تقویٰ شعار مسلمان سے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے ذاتی منافع کے لئے ہی جو بلا واسطہ اس کو پہنچتے ہیں شہادت میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے چہ جائیکہ ان منافع کے لئے جن کے واسطے پہنچنے کا احتمال ہے۔ لیکن شریعت نے خاص افراد کا لحاظ نہیں کیا بلکہ حکم دے دیا۔

لاتقبل شهادة الولد لوالده ولا الوالد بولده ولا امرأة لزوجها ولا الزوج لامرأته ولا العبد لسيد ولا المولىٰ لعبده ولا الاجير لمن استاجره.

بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں، اور باپ کی بیٹے کے حق میں، عورت کی خاوند کے حق میں اور خاوند کی بی بی کے حق میں، غلام کی آقا کے حق میں اور آقا کی غلام کے حق میں اور اجیر کی مستاجر کے حق میں معتبر نہیں۔

کتب تاریخ میں واقعہ مسطور ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ جبکہ آپ خلیفۃ المومنین تھے ایک یہودی کے پاس برآمد ہوئی۔ آپ نے قاضی شریح کی عدالت میں اس مقدمہ کو دائر کیا۔ اور شہادت میں بڑے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے مولیٰ یعنی غلام آزاد کردہ قنبر کو پیش کیا۔ قاضی صاحب نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت اس قاعدہ کلیہ کی بناء پر کہ وہ صاحبزادے ہیں رد کردی۔ قنبر کی شہادت کو قبول کر کے فرمایا کہ ایک گواہ اور لائیے۔ کیونکہ تنہا ایک گواہ کی شہادت پر اگر چہ وہ کتنے ہی بڑے درجہ کا ہو فیصلہ نہیں ہوسکتا دوسرا کوئی گواہ موجود نہ تھا۔ اس وجہ سے دعویٰ خارج ہوا۔ زرہ یہودی کو لادی گئی۔

اس روشن اور صاف قاعدہ کلیہ اور اس فیصلہ حقانی کا یہ اثر ہوا کہ یہودی یہ کہہ کر کہ خلیفۂ وقت اپنے قاضی کے یہاں معاملہ دائر کرے اور وہ خارج ہو جائے مسلمان ہو گیا۔

ظاہر اور بر ظاہر ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جانب کسی قسم کا احتمال بھی سوء

ظنی کا نہیں ہوسکتا اور نہ قاضی صاحب کو معاذ اللہ تھا۔ مگر قاعدہ کلیہ شریعت غراء کا یہی تھا جس کے آگے سب کو سر تسلیم خم کرنا لازم وواجب ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے اگر ایسی خصوصیات سے استثناء کا دروازہ کھول دیا جاتا تو پھر ہر شخص کو ایسی نہ کسی خصوصیت فرضی یا واقعی سے استثناء کا موقع اور بہانہ مل جاتا۔ اور یہ قاعدہ کلیہ شریعت کا کاغذ پر ہی لکھا نظر آتا عملدرآمد سوا ء شاذ صورتوں کے کہیں بھی نہ ہوتا۔

و)...... مشیر اگر متعدد ہوں تو ان کا آپس میں حسد وتنافس سے خالی ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ایک کو دوسرے کی بات تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو مشاورۃ کا نتیجہ سواء مشاجرۃ، منازعت اور منافرۃ کے کچھ نہ ہوگا۔

یہ چھ اوصافِ وشرائط ہیں جن کے مجتمع ہونے سے آدمی مشورہ کا اہل بنتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ بعض اوصاف اس درجہ ضروری ہیں جن کے بغیر قابلیت ثابت ہی نہیں ہوتی۔ ان کو ذات مشورہ میں داخل ہے اور بعض ضرورتیں اس درجہ کی نہیں ہیں۔ ان سے کسی وقت قطع نظر بھی کرلی جاتی ہے جیسا کہ ہماری تشریحات سے واضح ہو چکا ہے۔

اہل عقل وحکمت نے اپنے زرین اقوال میں اوصاف وشرائط کو جامع ومانع الفاظ میں بیان فرمادیا ہے۔ مستطرف میں ہے۔

قالت الحکماء ولاتشاور معلما ولا راعی غنم ولا کثیر القعود مع النساء ولا صاحب حاجة یرید قضأها ولا خائفا ولا حاقنا وقیل سبعة لا ینبغی لصاحب لب ان یشاورهم جاهل وعدو وحسود ومراء و جبان وبخیل وذوهوی فان الجاهل یضل والعدو یرید الهلاک والحسود یتمنی زوال النعمة والمرائی واقف مع رضاء الناس والجبان من رایه الهرب والبخیل حریص علی جمع المال فلا رای له فی غیره وذولهوی اسیر هواه فلا یقدر علیٰ مخالفته.

حکماء نے فرمایا ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے والے، بکریوں کے چرانیوالے عورتوں کے پاس زیادہ بیٹھنے والے اور کسی صاحب حاجت سے جو اس کے پورا کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہو۔ اور خوف زدہ شخص اور اس شخص سے جو بول و براز کو دبائے ہوئے ہو قضاء حاجت کی فکر میں لگا ہوا ہے مشورہ نہ کرنا چاہیئے اور بھی حکماء کا مقولہ کہ سات شخص ایسی ہیں جن سے مشورہ کرنا کسی صاحب عقول کو مناسب نہیں ہے جاہل دشمن، حاسد، ریا کار، نامرد، بخیل، خود غرض، اس لئے جاہل تو خود گم کردہ راہ ہے۔ دوسرے کو بھی گمراہی میں ڈالتا ہے، دشمن ہلاک کرنا چاہتا ہے، حاسد زوال نعمت کا متمنی ہے۔ ریا کار لوگوں کی رضا جوئی کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ نامرد کی رائے ہمیشہ فرار اور گریز کی جانب ہوتی ہے اور بخیل مال کے جمع کرنے پر تلا رہتا ہے۔ سواء جمع مال اس کو دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں۔ خود غرض اپنے اغراض کا پابند ہے اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔

حاصل یہی ہے کے ایسا شخص جس میں فی حد ذاتہ عقل و تجربہ نہیں۔ یا ہیں مگر کسی امر عارضی کیوجہ سے صحیح مشورہ نہیں دے سکتا مشیر بننے کے قابل نہیں۔

مستشیر یعنی طالب مشورہ کے فرائض و آداب۔

یہ امر تو اول بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی اہم معاملہ پیش آئے جس کے اندر رائے قائم کرنا مشکل ہے یا معاملہ کی دونوں جانبیں فوائد و خطرات سے خالی نہیں ہیں تو ایسی حالت میں استبداد و استقلال رائے سے کام کرنا مہلک ہے اور موجب ننگ و عار اور ملامت و طعن ہے اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ محتاج مشورہ اگر چہ کتنا ہی دانشمند صاحبِ وجاہت اور آزمودہ کار ہو اسکو کسی دوسرے سے مشورہ کرنے میں اگر چہ وہ شخص ظاہر میں کم رتبہ اور معمولی حالت میں ہے یہ امر مانع نہ ہو کہ اگر میں باوجود دانشمندی تجربہ کاری اور وجاہت اور علو شان کے دوسرے کے سامنے اپنے معاملہ کو پیش کر کے طالب رائے ہوں گا تو لوگوں کی نظروں میں میری بے وقعتی یا نادانی ظاہر ہوگی۔ اور یہ سمجھا جائے گا کہ اگر میں خود صاحب رائے ہوتا تو دوسروں کا محتاج نہ ہوتا۔ کیونکہ ان

خیالات اور اعذار سے مشورہ کو ترک کر کے اپنے معاملات کو خراب کرنا اور مورد طعن و ملامت بن کر نظروں میں حقیر بننا سخت حماقت میں داخل ہے اب ہم مستشیر کے لئے فی نفسہ فرائض و آداب کو بیان کرنا چاہتے یعنی جب کوئی اپنی اہم مشکل معاملات میں دوسروں سے مشورہ کا طالب، ہو تو اس کے ذمہ لازم یا مناسب ہے۔

۱)...... مستشیر کا پہلا فرض یہ ہے کہ مشورہ کے لئے ایسے افراد کو منتخب کرے جو مشورہ دینے کے لائق و اہل ہیں۔ جن میں وہ اوصاف و شرائط موجود ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی جو صحیح مشورہ دینے کے قابل ہیں جن کے مشورہ پر کاربند ہونے سے فائز المرام ہو سکتا اور ترک مشورہ کی صورت میں جو نقصانات یا الزام پہنچ سکتے ہیں ان سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر مستشیر لائق و قابل مشورہ افراد کے انتخاب میں کوتاہی کرے گا یا ایسے اشخاص کو منتخب کرے گا۔ جن میں بجائے ان اوصاف کے جو مشیر کے لئے ضروری ہیں۔ دوسری قسم کے فضائل موجود ہیں اور جو ظاہراً مشیر بننے کی قابلیت نہیں رکھتے تو اس کا الزام خود مستشیر کے ذمہ ہے۔ اور جو نقصان اس کو پہنچے گا وہ خود اس کی کوتاہی کا نتیجہ ہو گا۔ اور گو وہ اس صورت میں اس قدر ملام و مطعون تو نہ ہو گا۔ جیسا کہ خود رائی اور استقلال سے کام کرنے کی صورت میں ہوتا۔ مگر اس حالت کے قریب ہی قریب رہے گا۔ اس لئے سب سے اول اس کا کام یہی ہے کہ مشورہ کے لئے اہل اور لائق افراد منتخب کرے۔

۲)...... مستشیر کی غرض مشورہ سے استفادہ رائے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ امتحان مشیر۔ کیونکہ امتحان کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں مشیر کی عقل و دیانۃ، تجربہ و صداقت پر اعتماد نہ ہو اور جبکہ مشیر کی اہلیتہ کو پہلے جانچ لیا گیا ہے تو اب امتحان کے معنی کیا ہیں۔ اگر کسی کا امتحان مقصود ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ رائے تو ایک جانب معین ہو چکی ہے اب پرکھنا یہ ہے کہ مشیر آیا صحیح رائے دیتا ہے یا غلط۔ لیکن اس کو مشورہ نہیں کہتے اس کا نام امتحان اور جانچ ہے۔ اور یہ وہیں ہوتا ہے جہاں کسی کی عقل و تجربہ پر اعتماد نہ ہو۔ یا جس کی صداقت و محبت، عداوت و نفرت کا حال معلوم نہ ہو۔

۳)...... مشیر مشورہ میں اگر چہ مستشیر کی منشاء اور خواہش کے خلاف رائے دے

ٹھنڈے دل سے سننا چاہیئے۔ یعنی کسی خیال یا واہمہ پر اس کی طرف سے بدظن نہ ہو اگر ایسا کیا جائے گا تو مشورہ کا نفع ہرگز اس کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ یہ شخص حیرانی اور پریشانی میں زیادہ مبتلا ہو جائے گا۔ بسا اوقات ایک خالص اور سلیم العقل کی درست بات پر کسی نہ کسی وجہ سے بدظنی کا موقع مل جاتا ہے لیکن مستشیر کو اس وقت عقل اور ثبات قلب سے کام لینا چاہیئے اگر بدظنی سے کام لیا جائے گا تو کسی کام یا معاملہ میں بھی تنقیح رائے نہ ہوگی اگر کوئی ایسا شخص دستیاب ہونا دشوار ہو جائے گا۔ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

معاشرۃ ومشاورۃ کا رکن اعظم یہ ہے کہ مستشیر پر اعتماد ہو۔ اور اس کو ہم شرائط اہلیتہ میں بیان کر چکے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

اصف ضمیرک لمن تعاشرہ واسکن الی ناصح تشاورہ

اپنے دل کو ہمنشین کی طرف سے صاف رکھنا چاہیئے۔ اور ہمدرد خیر خواہ مشیر کی بات پر اطمینان کرنا چاہیئے۔

وارض من المرأ فی مودّتہ بما یودی الیک ظاہرہ

دوست کی اس قدر دوستی پر جو ظاہر حال سے معلوم ہوتی ہے راضی رہنا چاہیئے۔

من یکشف الناس لایجداحدًا تنصح منہم لہ سرائرہ

جو لوگوں کے باطن حالات کی تفتیش کرے گا۔ تو کوئی ایسا نہ ملے گا جس کے باطن میں خیر خواہی کو رہو۔

اوشک ان لا یدوم وصل آخ فی کل نکاتہ تنا فرہٗ

اگر بھائی و دوست کی ہر لغزش پر گرفت کی جائے تو کسی ایک بھائی کا تعلق بھی باقی نہیں رہ سکتا۔

۴)......جس معاملہ میں مشورہ طلب کیا جاتا ہے اس کو کھول کر اور واضح ہو کر بیان کرے تا کہ مشیر کو اس کے تمام جوانب پر نظر کر کے رائے قائم کرنے کا موقع ملے اگر معاملہ کو مبہم و مجمل بیان کیا گیا یا بعض واقعات کو یا اپنے خیال اور غرض اور مقصود کو مخفی رکھا گیا تو مشیر ہرگز صحیح رائے نہیں دے سکتا اور اس وجہ سے جو نقصان پہنچیگا اس کا ذمہ دار خود

مستشیر ہوگا۔ مشیر ہرگز قابل ملامت وطعن نہ ہوگا۔

۵)...... مستشیر کو چاہیئے کہ مشیروں کی رائے اور ان کی وجوہ استدلال خود بھی غور سے سنے اور سمجھے تاکہ مستشیر جس طرح بوجہ مشورہ کرنے کے استبداء رائے کی آفات سے محفوظ رہا ہے ایسے ہی بے سمجھ بوجھے دوسروں کی رائے کا اتباع کرنے کی تقلید اعمٰی اور تفویض سے بھی بچ جائے جب وہ تمام پہلوؤں اور ان کے وجوہ پر غور کرے گا تو خود بھی صحیح نتیجہ پر پہنچے گا اور اس کو اپنے اپنے مشیروں کی عقول وتجربہ کاری نصح وہمدردی ودفع الوقتی کا بھی پورا اندازہ ہوجائے گا۔ اور اس کو یہ واضح ہوجائے گا کہ میری عقل ان معاملات میں کہاں تک چل سکتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آئندہ جب اس قسم کے مشکل اور مہم معاملات پیش آئیں گے تو یہ اس وقت اس تجربہ سے بہت کچھ کام لینے کے لائق ہوگا اور اگر اپنے معاملات کو دوسروں کے ہاتھ میں سپرد کرکے بے سوچے سمجھے تقلید کرے گا تو ان سب فوائد سے محروم رہے گا۔

۶)...... مشاورۃ میں بحث ومباحثہ کے بعد کوئی رائے قائم ہوجائے اور بعد از عمل ثابت ہو کہ ہرگز مشیروں پر طعن وتشنیع نہ کرے کیونکہ مشیر کا کام صرف یہ ہے کہ اپنی عقل ورائے سے ایک طریقہ کو واضح کردے۔ اس طریقہ کا موصل الی المطلوب ہونا مشیر کے حد ادراک واختیار سے بالکل خارج ہے۔ اول تو آدمی کتنا ہی صاحب فراست ودانشمند کیوں نہ ہو مگر اس کی عقل محدود ہے۔ تمام اسباب واحتمالات کا احاطہ وشوار اور سخت دشوار ہے اور پھر باوجود تمام اسباب وذرائع موصلا قریبہ وبعیدہ کے مجتمع ہونے کے ترتب نتیجہ خداوند عالم کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے مشیر ہرگز مستحق، وملامت، وطعن نہیں ہے۔ اگر ایسی صورتوں میں مشیر مورد طعن بنائے جائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر وہ کبھی کسی کو مشورہ دینے کی جرات نہ کریں گے۔ اور ہمیشہ یہ کہہ کر الگ ہوجایا کریں گے کہ جو مناسب سمجھے اس پر عمل کرو۔ اور مخلوق مشورہ کی دولت عظمٰی سے محروم ہوجائے گی۔ جس کا فساد ونقصان ظاہر ہے۔

۷)...... مشیر کی گمنامی اور کم وقعتی کو اس کے مشورہ کو رد کرنے کا سبب نہ سمجھنا چاہیئے

مستشیر کا فرض ہے کہ دانشمندی اور خیر خواہی کی بات اگر چہ کسی گمنام کم وقعت شخص کی زبان سے بھی سنے تو اس کی قدر کرے۔ کیونکہ مشورہ کی غرض اپنا انتفاع ہے۔ اس میں مشیر کے بلندرتبہ یا کم درجہ مشہور و گمنام ہونے کو کچھ دخل نہیں ہے۔

آدمی کو اگر خود عقل و تمیز ہے تو برائی کی صحت و سقم کو خوب پہچان سکتا ہے۔ اگر چہ رائے دینے والے کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

النصح[۱] ارخص ماباع الرجال فلا ترد د علی ناصح نصحا و لا تلم

سب سے ارزاں چیز جس کو لوگ فروخت کرتے ہیں نصیحت و خیر خواہی ہے تجھ کو چاہیئے کہ کسی ناصح کی نصیحت کو رد کرے اور نہ اس کو ملامت کرے۔

الی النصائح لاتخفی منا هجها علی الرجال ذوی الليا و الفهم

نصیحت و خیر خواہی کے طریقے دانشمند اور زیرک سے مخفی نہیں رہتے۔

(۸) ان سب مراحل کے بعد جب باہمی مشاورۃ سے ایک امر منقح ہو جائے معاملات کے تمام پہلو واضح ہو جائیں۔ ہر ایک صورت کے حسن و قبح پر کافی روشنی پڑ جائے تو اب مستشیر کا فرض ہے کہ طے شدہ اور منقح رائے پر عمل کرنے میں لیت ولعل کو دخل دے کر اجراء و نفاذ میں دیر نہ کرے۔ مشورہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے تمام پہلو پیش نظر ہو جائیں، تصویر کے دو رخ بھی سامنے آجائیں جو فرادیٰ نظروں سے مخفی و مستشیر تھے اور جو معاملہ کے تمام پہلو واضح ہو گئے تو مشورہ کے نتیجہ تک اسی وقت پہنچا جا سکتا ہے جب اس پر عمل بھی کیا

---

[۱]:..... مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو رائے دینے کا شوق ہوتا ہے۔ اور اگر چہ ان کو محتاج مشورہ سے قبولیت و شکریہ کی توقع نہ ہو جب بھی سبقت کو بیٹھتے ہیں۔ مگر تم کو ایسی حالت میں ان کے مشورہ کو حقیر سمجھ کر رد نہ کرنا چاہیئے اور نہ اس سبقت پر یا بلا سوچے سمجھے رائے دینے پر ملامت کرنا چاہیئے ہاں یہ بھی ضرور نہیں کہ اس رائے پر عمل کیا جائے یہ خود سوچنے سمجھنے کی بات ہے کہ منئ مشورہ کا نصح و ہمدردی ہے یا نہیں۔ اور باوجود نصح کے یہ رائے قابل ہے یا نہیں ۱۲ منہ

جائے۔ ہر ایک تدبیر اور عمل کا ایک وقت ہوتا ہے ممکن ہے کہ مشورہ کے اندر جن پہلوؤں اور جن اسباب وذرائع اور جن حکم ومصالح کا لحاظ رکھا گیا ہے ان کا وقت نکل جائے گا۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ مشورہ سے جس قدر جلد ممکن ہے فائدہ اٹھا ئے مستشیر اگر بعد وضوح رائے واستقرار مشورہ خواہ مخواہ تردد میں پڑ جائے یا عمل میں تاخیر ہوئی تو وہ خود اپنے لئے ہلاکی وبربادی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ایک بادشاہ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کی سلطنت کس طرح زائل ہوئی کہا

تاخیر عمل الیوم لغد آج کا کام کل پر کرنے سے

ایک شاعر کہتا ہے:

اذا کنت ذاری فکن ذاعزیمة ولاتک بالتر دد للر ای مفسدا

جب تو صاحب رائے ہے تو تجھ کو صاحب عزم بھی ہونا چاہیئے بلاوجہ تردد کر کے طے شدہ رائے کو فاسد نہ کرنا چاہیئے۔

فانی رأیت الریث فی العزم هجنه وانفاذذی الرای العزیمة ارشدا

کیونکہ عزم میں ڈھیل دینا عیب ونقصان ہے اور رائے کا نافذ وجاری کرنا رشد وبھلائی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مشورہ کے برکات سے جب ہی مستفید اور منتفع ہوسکتا ہے جبکہ عزم راسخ وہمت قوی سے اس کا اجراء ونفاذ بھی کرے۔ اگر بعد وضوح رائے شکوک وشبہات اور احتمالات بعیدہ نکالنے کے تخیلات میں پڑ جائے یا عمل میں تاخیر وتعویق کرے تو ہرگز اس کی برکات سے متمتع نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ شخص اس حالت سے زیادہ نفریں کے قابل ہوگا۔ جیسا کے بلا مشورہ کام کر بیٹھتا۔ کیونکہ اس حالت میں نفریں کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس نے اپنی رائے کو قابل اعتماد اور وثوق سمجھا اور تبادلہ آراء کے وقت رائے کے ثمرات سے محروم رہا اور یہ ایک درجہ عدم علم کا ہے۔ جس میں آدمی کسی وقت بھی معذور سمجھا جاتا ہے۔ اور اس حالت میں

چند وجوہ سے قابل سرزنش ہے۔ اول تو اس درجہ سے کہ باوجود علم اور انکشاف کے تردد وشک میں پڑا جو ایک قسم کا جمود وانکار ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اس نے عزیمت وہمت سے کام لے کر فی الفور مشورہ کے ثمرات سے نفع نہ اٹھایا۔ ممکن ہے کہ جس مناسبت سے مشورہ طے ہوا ہے اس کا وقت نکل جائے۔ تیسرے یہ کے آج کے کام کو کل پر رکھنے سے اپنی کاہلی سستی اور تغافل کا ثبوت دیا جو فی نفسہ مستقلاً مہلک مرض ہے۔

مشیر کے فرائض وآداب:

(۱) مشور کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کے اندر شرائط واوصاف مذکورہ پائے جائیں مشیر کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے درجہ اور قابلیت کو سمجھے۔ اگر وہ اوصاف اس میں نہیں ہیں جن کا وجود مشیر کے لئے لازم ہے اس کو چاہیئے کہ اس بار امانت کے تحمل سے فوراً انکار کر دے کیونکہ دو ہی حالتیں ہیں۔ یا تو یہ کہ وہ اپنے متصف باوصاف نہ ہونے کو سمجھتا ہے اور باوجود سمجھنے کے خواہ مخواہ پھر دوسرے کا بار اپنی گردن پر اٹھاتا ہے یا نہیں سمجھتا پہلی صورت میں تو وہ دغاباز، حیلہ ساز مکار اور فریبی سمجھا جائے گا۔ مستشیر کا تو جبکہ اس نے علم وخیال کے موافق اس کو اہل مشورہ سمجھ کر معاملہ کو اس کے سپرد کیا ہے کچھ قصور نہیں۔ اب جو کچھ الزام یا قصور ہے وہ صرف مشیر کی گردن پر ہے۔ اور دوسری صورت میں اس کا جہل جہل مرکب ہوگا۔ کہ اپنے جاہل ہونے کو بھی نہیں سمجھتا۔ غرض مشیر کے ذمہ واجب ہے کہ جب کوئی شخص اپنے معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں دے کر خود سبکدوش بنتا ہے تو وہ اپنی حالت کا اندازہ کرے آیا مجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو عموماً مستشیر کے لئے شرط ہیں۔ یا باوجود وصاف مذکورہ میں موجود ہونے کے خاص اس معاملہ میں جو پیش کیا گیا ہے رائے دینے کے قابل سمجھے تو اس بار کو اٹھائے ورنہ انکار کر دے۔

(۲) جبکہ مستشیر نے اپنے مہام امور کی باگ مشیر کے ہاتھ میں دیدی اور اپنی نجاح وفلاح خیبت وخسران کا مدار اس کی رائے ومشورہ پر رکھا تو مشیر کا فرض ہے کہ اپنی ممکن کوشش

تنقیح رائے وتوضیح طریق میں صرف کرے۔ اور جو رائے اس کے نزدیک اصوب وانسب معلوم ہو اس کو اخلاص نیت صفائی طینت کے ساتھ مشیر کے سامنے ظاہر کرے اور ممکن سے ممکن طریقہ سے اس کی ہمدردی ودلسوزی کو اپنا فرض سمجھے۔

یہ نہایت صریح ظلم ہے کہ ایک شخص اس پر اعتماد کرتا ہے اور وہ سرسری غور وفکر سے اس کو مشورہ دے کر ورطۂ ہلاکت میں ڈالتا ہے اور خود اس نعمت عظمیٰ کے شکر سے کہ مخلوق اس کو اس قابل سمجھتی ہے کہ مشکلات کے وقت اس کی عقدہ کشائی کرے۔ محروم رہ کر اپنے نفس کو مستوجب سلب نعمت بناتا ہے اور یہ اس سے بڑھ کر ظلم ناقۃ نفس وکمینہ پن ہے کہ مشورہ میں اس کی خیر خواہی کو مدنظر رکھ کر ایسے امر کا مشورہ دے جو صریحًا اس کے نزدیک بھی مضر ہے۔ جس سے مستشیر کی امیدیں تمام پامال امنگیں پژمردہ اور تمام خیالات ملیامیٹ ہوتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان من حق المسلم علی المسلم اذا استنصحہ ان ینصحہ

منجملہ ان حقوق کے جو ایک مسلمان کے دوسرے پر ہیں ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ تجھ سے طالب نصح وہمدردی ہو تو اس کی خیر خواہی کرے۔

یہ مضمون تو خاص مسلم کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ غیر مسلم کے ساتھ ہمدردی ضروری نہیں یا اس کے خلاف دیانۃ مشورہ دینا جائز ہے۔ دوسری حدیث اپنے مفہوم میں عام ہے کہ مشیر پر ہر مستشیر کی خیر خواہی واجب ہے۔ خواہ وہ مسلم ہو یا کافر جناب رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔ المستشار مؤتمنٌ جس سے مشورہ کیا جاتا ہے وہ امین بنایا گیا ہے۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جاتا وہ امین بنایا گیا ہے۔ جس طرح امین کو امانت میں خیانت جائز نہیں ہے اس طرح مستشار کو مشورہ میں خیانت حرام ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ جو امر اس کے خیال میں بہتر سے بہتر ہے اس کا مشورہ دے اور اگر اس معاملہ سے اس کی غرض بھی متعلق ہے۔ اور صاف وصریح مشورہ دینے

میں اس کو اپنی مضرت اور فوت مقصود کا اندیشہ ہے تب بھی اس کے ذمہ یہی واجب ہے کہ اپنے منافع کا خیال نہ کر کے صحیح مشورہ میں کوتاہی نہ کرے اور ایسا کرنا اس کی کمال دینداری، تقویٰ اور انسانیت کی دلیل ہے اور اس کی ایثار نفسی اور حوصلہ مندی کا ثبوت ہوگا لیکن اگر اس کے اخلاق کمزوری اس کی اجازت نہیں دیتی اور وہ اپنے منافع کو ضائع کرنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تو ایسے شخص کو چاہیئے کہ اول ہی وہلہ میں مشورہ دینے سے انکار کردے۔ تاکہ مستشیر اس پر مطمئن نہ رہے۔ اور کسی دوسرے سے مشورہ کرے اسی مضمون کو سلیمان ابن درید نے اس طرح ادا کیا ہے۔

واجب اخاک اذاستشارک ناصحًا وعلیٰ اخیک
نصیحة لا تردد.

جب تیرا کوئی بھائی طالب ہمدردی ہو کر تجھ سے مشورہ کرے تو تجھ
کو مشورہ دینا ضروری ہے۔

لیکن اس کے ساتھ حدیث بالا سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب مستشار امین ہے اور اس وجہ سے مشورہ میں خیانت یا ہمدردی میں کوتاہی ناجائز ہے تو مقتضاء اس امانت کا یہ ہے کہ اس مشورہ کا افشاء اور ظہار بھی نہ کرے۔ تاوقتیکہ خود مستشیر کی جانب سے اس کی اجازت، نہ ہو۔ یا اس کے علم و یقین کے موافق اس کا اظہار مضر نہ ہو۔ ورنہ اس کا افشاء و اظہار بھی خیانت و بدعہدی میں داخل ہوگا۔ اور یہ شخص مرتکب معصیت کبیرہ کا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ جب مستشار امین ہے اور اس کے ذمہ ہر مستشیر کی خیر خواہی واجب ہے خواہ مسلم ہو یا کافر۔ تو پھر حدیث اول میں مسلم کی تخصیص کیوں اور کیسے ہے۔ اگر یہ عام انسانیت کا حق ہے تو پھر مسلم کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ایک حق عام ہوتا ہے۔ اور ایک خاص۔ اور یہ عموم اور خصوص تعلقات کے عموم و خصوص پر متفرع ہے۔ حدیث ثانی میں عام تعلقات کی بناء پر عام حق کو بیان کیا گیا ہے۔ اور حدیث اول میں علاوہ تعلق انسانیت کے خاص تعلق اسلام

کا ملحوظ رکھ کر اس کو خصوصیت کے ساتھ بطور تاکید ارشاد فرمایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام تعلقات انسانی کی حالت میں درصورت عدم نصح جس قدر مواخذہ ہوگا۔ اس سے بدرجہا زائد خاص تعلق اسلامی کی حالت میں عدم نصح و ہمدردی میں ہوگا اور پھر خصوصیت تعلقات اسلام ہی کی حد پر منتہی نہیں ہوتی۔ اسلام کے بعد اور بھی خصوصیت ہیں جو ہمدردی کے وجوب وتاکد کو اسیطرح بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً والدین کا تعلق اساتذہ کا تعلق جار کا تعلق وغیرہ وغیرہ غرض جتنے مقتضا ہمدردی و دلسوزی بڑھتے جائیں گے اتنا ہی درصورت عدم مواخذہ بڑھتا جائے گا۔ لیکن باایںہمہ عام تعلق کی حالت میں جو ہمدردی اس پر واجب ہے اس میں کمی نہ ہوگی۔ وہ بحال خود باقی رہے گی۔

(۳) جب کسی شخص کا عقل و تجربہ تسلیم کرلیا جاتا اور لوگ عموماً اس کی اصابت رائے کے قائل ہوکر اس پر اطمینان کرنے لگتے ہیں تو حسب تقاضاء فطرۃ انسانی اکثر و بیشتر ایسے افراد میں ایک قسم کا عجب وغرور پیدا ہوجاتا ہے وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے منہ سے جو بات نکلتی ہے درست ہوتی ہے۔ اور جو مشورہ دیتے ہیں بالکل مطابق واقع ہوتا ہے۔ اس مرض کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو یہ شخص غور وفکر کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھنے لگتا ہے۔ اور بلا سوچے سمجھے مشورہ دینے کو کافی خیال کرلیتا ہے۔ دوسرے تمام دنیا کی آراء کو اپنے مقابلہ میں ہیچ اور نا قابل التفات سمجھتا اور خیال کرتا رائے کو حقیر اور دوسروں کو نادان و ناتجربہ کار جانتا ہے۔ یہ حالت سچ پوچھیئے تو اس کو اوّج عزت سے قعر مذلت میں گرادینے والی ہے اور یہ اس سے بھی زیادہ مضر ہے کہ آدمی خود رائے اور استقلال سے بلا مشورہ کام کر بیٹھے۔ کیونکہ یہ شخص اپنے معاملہ میں غور وفکر تو بخوبی کرلیتا ہے اور مشیر اس حالت میں پہنچکر اول تو خود رائے اور مستبد بن گیا دوسرے اپنی سرسری رائے کو بھی قابل وثوق واعتماد سمجھنے کی وجہ سے تمام پہلوؤں کا خیال نہ کیا۔

جب مشیر کی حالت یہ ہو تو فرض ہے کہ ایسے شخص سے نہ مشورہ کرے اور نہ اسکو قابل اعتماد سمجھے۔ اور اگر مستشیر اس کے مرض پر مطلع نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے اس پر اعتماد کر بیٹھا تو مشیر پر لازم ہے کہ اپنے اس مرض کا ازالہ کرکے مشورہ دینے پر آمادہ ہو۔

اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اس کے ذمہ ضرور ہے کہ مشورہ دینے سے انکار کر دے یا کم از کم اتنا کہدے کہ کسی دوسرے سے ہی مشورہ کر لیا جائے۔ ورنہ اس مشورہ کے جو کچھ برے نتائج ظاہر ہوں گے اُنکا جوابدہ و ذمہ دار مشیر ہوگا۔ اور مستشیر نے انتخاب میں کوتاہی کی ہے تو وہ بھی اس ذمہ داری میں حصہ دار رہے گا۔

(۴) مشیر کو یہ بھی مناسب ہے کہ مشورہ دینے میں سبقت نہ کرے۔ یعنی جب تک کہ اس سے مشورہ طلب نہ کیا جائے خود اقدام کر کے مشورہ نہ دے۔ اس صورت میں چند نقصان ہیں۔ ان کی رائے بے وقعت معلوم ہوگی۔ اس طرح بلا دریافت مشورہ دینے میں متّہم سمجھا جائے گا۔ خیال کیا جائے گا کہ اس کی کوئی ذاتی غرض اس سے متعلق ہے اس لئے تاوقتیکہ مستشیر کی جانب سے رغبت طلب اور اظہار اعتماد نہ ہو زبان نہ ہلائے۔ طرفہ کہتا ہے۔

ولا تر قد ن النصح من لیس اھلہ
کن حیث یستغنی برایک غانیا

نااہل کے لئے اپنی ہمدردی خرچ مت کر جو شخص تیری رائے سے استغناء کرے تو بھی اس سے بے پرواہ ہو جا

وان امرأ یوماتولی برایہ فلعہ یضیب الرشد اویک غاویا

اور اگر کوئی رائے اپنی کا خود مستولی بنے تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے خواہ ہدایت پائے یا گمراہ رہے۔

حضرت خذیفہ رضی اللہ عنہ ابن الیمان روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

قال لقمان لابنہ یابنّی اذا استشھد ت فاشھدو اذاستعنت فاعن واذا استشرت فلا تجعل حتی تنظر

لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ جب تم سے شہادت طلب کی جائے تو شہادت دو۔ اور جب کوئی امداد چاہے تو اعانت کرو۔ اور جب

کوئی طالب مشورہ ہو تو بلا غور و فکر جلدی مشورہ نہ دو۔
یہسن کلابی اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

مـن الناس من ان يستشيرک فتجهد له الرای يستغششک

مالا تتا بعه

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب وہ طالب مشورہ ہوں اور تو جدو جہد
سے ان کو رائے دے اگر تو ان کی موافقت نہ کرے تجھ کو متہم سمجھتے ہیں۔

فلا تمتحن بالر أی من ليس اهله

فلا انت محمود ولا الر ای نافعه

ایسی حالت میں نااہلوں کے سامنے اظہار رائے نہ کرنا چاہیئے کیونکہ
نہ تو قابل شکر گزاری ہوگا اور نہ رائے نافع ہوگی۔

البتہ اگر مشیر یہ سمجھے کہ کوئی شخص غلط راہ چلنے سے بلا کی میں مبتلا ہوا چاہتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ اگر میں نے سکوت کیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا تو اس وقت اس کو خود بڑھ کر اظہار رائے کرنا اور صحیح راستہ بتلانا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ اس کو بے وقت سمجھے اور اس کی رائے کو نظر انداز کر دے یا اس پر عمل کرے۔

وگر بینی کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینی گناہ است

یہ ایسی ہی بات ہے کہ ولایت وحکومت کی خواہش کرنا ممنوع اور مذموم ہے لیکن اگر کسی حالت خاص میں اس کو یہ یقین ہو جائے کہ موجودہ حالت کی اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت کی باگ میرے ہاتھ میں ہو تو ایسے وقت اس کو طلب حکومت جائز ہے۔ حضرت یوسف علیہ وسلم نے اسی بناء پر فرعون سے فرمایا تھا۔ **اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم۔**

(۵) مشیر کو یہ مناسب ہے جب ایک جماعت مشورہ کے لئے جمع ہو تو یہ شخص اپنی

رائے کے اظہار میں پیش قدمی نہ کرے۔ بلکہ اول اپنے سے زیادہ تجربہ کار اور عقلاء کو موقع دے۔ تاکہ دوسروں کی رائے سن کر اس کو بھی بہتر رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ معاملہ کے پہلو گفتگو کے بعد واضح ہوتے ہیں اور آدمی علم کے بعد گفتگو کرے اس سے بہتر ہے کہ ظن وتخمین معلومات پر اظہار رائے کر دے جس کا انجام سوائے ندامت وخجالت یا رائے کے کمزور وتعلیل عمل ہونے کے کچھ نہیں ہے۔ ابن ہیرہ نے اپنی اولاد کو وصیّت کی اور کہا۔

لا تکونن اول مشیر

تو سب سے پہلے مشیر نہ بن

لیکن یہ امر استحسانی ہے۔ اگر اس کو ایسا موقع مل جائے تو اس کے لئے بہتر ہے اور اگر سارے مشیر اسی انتظار میں سکوت کئے بیٹھے رہیں تو ظاہر ہے کہ غرض مشورہ فوت ہو جانے سے مستشیر کا نقصان عظیم اور مشیروں کے لئے سخت مذموم ہے۔ ایسی حالت میں سکوت نہ کرنا چاہیئے۔

(۶) مشیر کو چاہیئے کہ ایسے شخص کو مشورہ دینے سے بچے جس کی نسبت اس کو یقین ہے کہ کسی مشورہ کو نہیں مانتا۔ اس کی غرض محض امتحان ہوتی ہے ایسے شخص کو مشورہ دینا ہرگز مفید نہیں ہے۔ اور اپنے لئے موجب ندامت وخجالت ہے۔ ابن ہیرہ نے جو نصائح اپنی اولاد کو کیں اس میں یہ بھی ہے۔

لا تشر علی مُستَبِدٍ فان التماس موافقته لوم والاستماع منه خیانة.

کسی خودرائے اور مستقل الرائے کو مشورہ نہ دینا چاہیئے کیونکہ ایسے شخص سے موافقت کرنا دناءۃ میں اور اس کی بات سننا خیانت میں داخل ہے

مشاورت کے طریقے اور اس کے آداب

مشورہ کی کل دو ہی صورتیں ہیں کسی ایک شخص قابل اعتماد کے سامنے اپنے معاملہ کو

پیش کر کے طالب رائے ہو۔ یا یہ کہ جماعت عقلاء ارباب فہم و دانش کے سامنے کسی مبہم و مشکل معاملہ کو بغرض تنقیح رائے پیش کیا جائے۔ صورت اول میں تو صرف اتنی ہی بات کافی ہے کہ مشیر اپنی رائے وفہم کی موافق ہمدردی اور دلسوزی سے رائے ظاہر کردے البتہ صورت ثانیہ میں جبکہ مشیروں کی ایک جماعت سے تبادلہ آراء وخیالات کیا جائے اور ایک امر بغرض مشورہ جماعت کے سامنے پیش کیا جائے چند امور قابل بحث و تفتیش ہیں۔

(۱)......اظہار کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔

(۲)......درصورت اختلاف آراء مشیروں کا فرض کیا ہے۔

(۳)......آیا اس جماعت سے ایک مجلس میں جمع کر کے مشورہ کرنا بہتر ہے یا ہر ایک سے جداگانہ۔

اول امر کی توضیح یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ ایک جماعت عقلاء و مدبرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ تو ان میں سے ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے کہ اپنی رائے آزادانہ بلا رو و رعایت و بلا خوف لومتہ لائم ظاہر کرے یہ خیال نہ کرے کہ میری رائے کسی کے منشا کے خلاف ہونے کی صورت میں انگشت نما ہوسکتا ہوں۔ یا یہ کہ میری رائے کا ضعف ظاہر ہونے میں لوگ مجھے حقیر اور نا قابل اعتماد سمجھیں گے۔ یا مجھ پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور میری نسبت عقل و تجربہ ہوشمندی و برتری کا خیال قلوب میں راسخ ہے زائل ہو جائے گا۔ کیونکہ ان خیالات کا پابند ہونا اظہار رائے میں سکوت کرنا۔ یا کسی ایک جماعت کی رعایت کر کے آزادی کے ساتھ اپنی کامل اور محقق رائے کو نہ ظاہر کرنا ایک درجہ کی خیانت میں داخل ہے جس سے احتراز رکھنا مشیر کے اولین فرائض میں سے ہے۔ دوسرے یہ مشاورت اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اور تدبیر کے سب طریقے معین و مشخص ہو جائیں اور یہ جبھی ممکن ہے کہ ہر شخص اپنے خیال کو بلا تکلف آزادی کے ساتھ ظاہر کردے، اس غرض کے لئے نہیں ہوتی کہ ہر شخص کی رائے کا اتباع کیا جائے۔ کبھی اظہار رائے سے یہ امر بھی مانع ہو جاتا ہے کہ مجلس شوریٰ میں چھوٹے بڑے طبقہ کے

آدمی جمع ہوتے ہیں۔ مثلاً استاد و شاگرد، پیر، مرید، باپ بیٹا، علی ہذا عقل و تجربہ عمر وغیرہ کے اعتبار سے طبقات و مدارج کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص قابل اعتماد سمجھ کر اس مجلس کا امین بنایا گیا تو اس کے ذمہ ضرور ہے کہ آداب مجلس و اہل مجلس کو ملحوظ رکھ کر پوری طرح اظہار رائے کردے۔ ورنہ وہ خائن و بددیانت سمجھا جائے گا۔

اور جس طرح کہ مجلس مشاورۃ میں اپنی رائے کا اظہار آزادی و مطلق العنانی کے ساتھ ضروری ہے اسی طرح دوسروں کی رائے اور ان کے دلائل کو بغور سننا بھی اس کے ذمہ لازم ہے۔ اول تو یہ امر آداب مجلس میں داخل ہے کہ جب کوئی دوسرا کلام کرے تو یہ شخص ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنے یہ بات کہ آدمی خود کلام کرے دوسروں سے بتوجہِ تام کان لگانے کا متوقع رہے اور دوسرا کلام کرے تو خود متوجہ نہ ہو اداب مجلس بلکہ تقاضائے انسانیت کے خلاف ہے خود اپنے ہی اوپر قیاس کرے کہ اس کی گفتگو کے وقت دوسرا متوجہ نہ ہو تو اس پر کیا گزرتی ہے اور کلام کو پورا کرنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ سننے والے کی بے توجہی سے نشاط زائل ہو جاتا ہے۔

حضرت [1] عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

بحلیسی علی ثلاث ان ارقمه بطرفی اذا اقبل واوسع له اذا جلس واصغی الیه اذا حدث

ہمنشیں کے تین حق مجھ پر ہیں جب وہ سامنے ہو تو میری نگاہ اس کی طرف لگی رہے، جب وہ بیٹھے تو اس کے لئے جگہ چھوڑ دوں، جب وہ گفتگو کرے تو کان لگاؤں۔

حکماء [2] کا قول ہے:

راس الادب کله الفهم والتفهم والاصغاء لمتکلم.

ادب کا رأس یہ ہے کہ خود صاحب فہم ہونے دوسرے سے سمجھنے کی کوشش کرے، گفتگو کرنے والے کے سامنے کان لگائے۔

---

(۱) مستطرف جلد اول ص:۱۰۹ (۲)..... عقد فرید جلد اول ص:۱۹۴

امام شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قوم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

مارایت مثلهم اشد تنا ؤبا في مجلس ولا احسن فهما من محدث.

میں ان لوگوں سے زیادہ باری باری مجلس میں گفتگو کرنے والے کی بات کو سمجھتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔

اسی طرح عبدالملک بن مروان نے خلیفہ مروانی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا

واللّٰه ماعلمتهٗ الا(۱) خذ ابثلاث تارکًا لثلاث ا خذًا لحسن الحديث اذاحَدَّث وبحسن الاستماع اذا حُدِّث بايسر المؤنة اذا خولف تاركاً لمجاوبه اللئيم ومماراة السفيه ومنازعة اللجوج.

خدا کی قسم میرے علم میں میں وہ تین باتوں کو مضبوطی سے تھامنے والے۔ اور تین امور کا تارک تھا جب کسی سے بات کرتا تو نہایت لطافت وخوبی سے کرتا جب کوئی اس سے بات کرتا تو کان لگا کر سنتا جب کوئی اس کے خلاف کرتا تو سہل سے سہل تنبیہ اس کو کرتا۔ دنی وکم ظرف لوگوں کے سوال وجواب، کم عقلوں کے ساتھ مخالفانہ بات کرنے ہٹی اور لجاجت کرنے والوں کے ساتھ جھگڑنے والوں سے پرہیز کرتا تھا۔

بعض حکماء نے فرزند کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

يابني تعلم حسن الاستماع كما تتعلم الحديث وليعلم الناس انک احرص علي أن تسمع منک ان تقول .

بیٹا تم کو اچھی طرح سننا بھی اسی طرح سننا چاہیئے جیسے اچھی طرح بات کرنا لوگ یہ سمجھیں کہ تم کو اپنے بولنے سے دوسروں کے سننے کا زیادہ

(۱)...... عقد فرید جلد اول ص ۱۹۴

شوق ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

حد ثوا الناس مااقبلوا بوجو هکم .(۱)

لوگوں سے اس وقت تک گفتگو کرو جب تک تمھاری طرف متوجہ رہیں

اہل علم (۲) وحکمت کے ان کلمات میں سے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں یہ یہ بھی ہیں:۔

من حسن الادب ان لا تغالب احد اعلی کلامه واذاسئل غیرک فلا تجب عنه واذاحد یث بحدیث فلا تنا زعه ایاه ولا تقتحم علیه ولا تر ه انک تعلمه واذاکلمت صاحبک فاخذ ته حجتک فحسن مخرج ذلک علیه ولا تظهر الظفر به وتعلّم حسن الا ستما ع کما تتعلم حسن الکلام.

حسن ادب میں یہ بھی ہے کہ کسی گفتگو پر اپنی غالب آنے کی کوشش نہ کرے جب کسی دوسرے سے پوچھا جائے تو مجیب نہ بننا چاہیئے اور جب کوئی بات کرے تو درمیان میں بحث نہ کرے اور نہ اس میں دخل دے اور نہ اس کو یہ جتلائے کہ ہمیں پہلے سے معلوم ہے اور اگر گفتگو میں تو غالب آجائے تو اپنے دوست کی بات بنانے کی کوشش کرے اس پر غصہ وفتح مندی کا اظہار نہ کرے۔ تجھ کو بات کا اچھی طرح کان لگا کر سننا بھی ایسے ہی سیکھنا چاہیئے جیسے اچھی طرح بات کرنا۔

جب آداب مجلس میں یہ امر داخل ہے تو اس کا بے توجہی سے سننا خلاف تہذیب

(۱)......عقد فرید جلد اول ص ۱۹۴ (۲)......عقد فرید جلد اول ص ۱۹۴

خلاف آداب مجلس خلاف انسانیت ہوگا۔ دوسرے یہ کہ جب وہ اوروں کی رایوں کی طرف توجہ والتفات نہ کرے گا تو علاوہ اس کے کہ اس سے اس کا اپنا عجب اور رائے کی ایسی وقعت ظاہر ہوتی ہے کہ دوسروں کی رائے کو قابل التفات بھی نہیں سمجھتا۔ بڑی مضرت یہ ہوگی کہ متکلم کا نشاط جاتا رہے گا اور جس طرح روانی اور آزادی سے وہ اظہار رائے کرتا تھا اس سے رک جائے گا اور جب ممبران مجلس کی طرف سے اظہار رائے پوری طرح نہ ہوا تو مشورہ ناقص اور مجلس مشاورت ناقص ہوئی اور اس نقصان مشورہ اور غیر کامیابی مجلس کا بوجھ اس شخص کی گردن پر پڑا اور یہ اس نصح و ہمدردی کے بالکل خلاف ہے جو مشیر کے ذمہ واجب تھی۔

تیسرے یہ کہ متکلم کے کلام میں بہت سے فوائد ایسے ہوتے ہیں جن کی طرف اس کا ذہن منتقل نہیں ہوتا ممکن ہے کہ معاملہ کے بعض پہلو اس سے مخفی اور مستشیر رہے ہوں اور بعض رموز و دقائق تک اس کی نظر نہ پہنچی ہو۔ اگر یہ شخص دوسرے کے کلام کو توجہ تام اور میلان قلب کے ساتھ نہ سنے گا تو خود بہت سے فوائد و نکات سے محروم رہے گا۔ جس کا نقصان اس کی ذات کو پہنچے گا اور اس زیور فضل سے محروم رہے گا جو بہت سے تجربوں کے بعد ہوتا ہے۔ خداوند عالم جل و مجدہٗ نے مومنین کے اس وصف خاص کی مدح اپنے کلام پاک میں اس طرح فرمائی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

جو لوگ سنتے ہیں قول کو پس اتباع کرتے ہیں اس میں سے بہتر کا۔

غرض بوجہ مذکورہ بالا سے مشیر کے ذمہ ضروری ہے کہ باقی ممبران مجلس شوریٰ کے کلام غور و توجہ سے سنے ایسا نہ ہو کہ اپنی رائے پر کامل اعتماد کر کے دوسروں کی رائے کو بالکل حقیر سمجھے۔

امر دوم کا بیان یہ ہے کہ اگر مجلس شوریٰ میں ممبران مجلس کی رائے باہم مختلف ہیں

تو کسی ممبر کو اپنی رائے پر اصرار کا حق نہیں ہے ان کا فرض یہ ہے کہ ہر ایک رائے کی دلیل وحجت کو کان دھر کر سنیں اور اپنے دل میں غور کریں تاکہ مفید رائے کا انکشاف ہو جائے۔ اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ اختلاف رائے سے کوئی صحیح نتیجہ نکال سکے۔ اگر ایسا نہ ہوگا بلکہ ہر شخص اپنی رائے کو قابل اعتماد سمجھے گا۔ اور دوسروں کو حقیر تو اس میں منازعت ومجادلت کی نوبت آئے گی اور انجام اس کا باہمی مخالفت، بغض وعداوت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ مجلس بجائے مفید ہونے کے سخت مضر ہو جائے گی۔ اختلاف محمود امر ہے معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر بغیر اختلاف رائے روشنی نہیں پڑتی مگر اس وقت جبکہ ہر شخص اپنے خلاف رائے کو ٹھنڈے دل سے سنے اور غور کرے اگر اس کے نزدیک وہ رائے صحیح ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں خود اس کی اخلاقی کمزوری مانع نہ آئے اور غلط ہے تو تہذیب ومتانت کے ساتھ اس کے ضعیف اور غیر مفید ہونے کو ظاہر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو مشاورت کے بار امانت سے سبکدوش نہ ہوگا۔ اور وہ بجائے امین ہونے کے خائن وبددیانت سمجھا جائے گا۔

امر سوم کی تفصیل یہ ہے کہ کسی معاملہ میں ایک جماعت سے مشورہ کرتا ہے تو ہر ایک سے جدا جدا مشورہ کرے یا ان کو ایک جا جمع کر کے معاملہ کو پیش کرے اور رائے لے۔

ہر ایک صورت میں بعض منافع خاص ہیں اور بعض مضرتیں جدا جدا، رائے لینے میں منافع ضرور ہے کہ ہر شخص خوب سوچ سمجھ کر رائے قائم کر لے گا۔ اسکو موقع ملے گا طبیعت کو یکسو کر کے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالے۔ اور بات کی تہہ کو پہنچ سکے۔ کیونکہ اس حالت میں صرف اسی کے اوپر اس کا بار ہے۔ اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اصابت رائے اور فوز مرام کا سہرہ میرے ہی سر بندھے تو اچھا ہے خلوت وفراغِ قلب کی حالت میں آدمی جس قدر تدبر وتفکر سے کام لے سکتا ہے ہجوم اجتماع کے وقت نہیں لے سکتا۔ اور پھر بلا کسی قسم کی رعایت یا رعب مجلس بلحاظ اہل مجلس کے اپنی رائے بے تکلف ظاہر کر دے گا۔ لیکن اس میں یہ نقصان بھی بڑا ہے کہ اجتماع کے بعد بحث ومباحثہ سے جتنے پہلو واضح ہو سکتے ہیں وہ اس صورت میں نہیں ہو سکتے۔ علاوہ اس کے مختلف آراء میں سے صحیح نتیجہ نکالنا اور ایک رائے

کو قابل عمل قرار دے کر باقی آراء کو متروک و متروح اور نا قابل عمل سمجھنا صرف شخص واحد یعنی مستشیر کا کام ہوگا جو تنہا ہرگز اس اہم ذمہ داری کا متحمل نہیں قرار دیا جاسکتا اور اگر ایک ہی شخص کو اس اہم ذمہ داری کے لئے کافی سمجھ لیا جائے گا تو اس کا نقصان بھی قریب قریب اس کے ہوگا جیسا کہ وہ تنہا مستقل و مستبد ہو کر عمل کرتا اور جمع کر کے مشورہ کرنے میں فائدہ خاص تو یہ ہے کہ معاملہ کے تمام پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔ مضر و مفید جوانب کی خوب تنقیح ہو جاتی ہے لیکن مجلس میں اول تو ہر شخص کی طبیعت پر بوجھ نہیں پڑتا اجتماع اخلاط اور غوغاء مجلس تشت وخیالات و پریشانی قلب کے سبب بن جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر بہت سے مشیر جمع ہیں اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کہ زور طبیعت لگا کر کوئی نتیجہ خیز بات نکالی جائے بلکہ بسا اوقات بہت سے اشخاص دوسروں پر حوالہ کر کے خود بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں رائے کے حسن و قبح میں کچھ دخل نہیں دیتے اور پھر دوصورت رائے زنی باہم تحاسد، تفاخر، مشاجرۃ ومخاصمۃ کا احتمال غالب ہوتا ہے اور یہ بھی بسا اوقات پیش آتا ہے کہ بعض افراد رعب مجلس کیوجہ سے رائے زنی میں آزاد نہیں رہتے خصوصا جبکہ مجلس میں حاکم ومحکوم زانو بزانو جمع ہوں۔ محکوم کو مشکل ہو جاتی ہے کہ حاکم کی رائے سے اتفاق کرے یا اختلاف۔ اس کا ضمیر تو موافقت کی اجازت نہیں دیتا۔ ہیبۃ وخوفِ مخالفت سے مانع آتے ہیں۔ ایسی حالت میں مشورہ سے مفید نتیجہ کا نکلنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اہل مجلس میں ایک قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر نہ صرف اس معاملہ کے ناقص رہ جانے تک محدود رہتا ہے بلکہ اور معالات تک پہنچتا ہے۔ دونوں صورتوں کے دونوں پہلو نفع ونقصان کو خیال کر کے عقلاء نے کسی ایک جانب کو ترجیح دی ہے۔ اہل فارس تو مشاورۃ کے لئے انعقاد مجلس کو پسند کرتے تھے تاکہ ہر شخص اپنی رائے بے تکلف ظاہر کر دے اور دوسرا اس کے نقصان کے بیان میں تردد سے کام نہ لے اور اس طرح جس جانب جو حسن وخوبی ہے یا جو خلل ونقصان ہے ظاہر ہو جائے اور تمام پہلو مجمع عام میں روشن ہو کر امر صواب منقح ہو جائے۔

اہل فارس کے سوا دوسری قومیں تنہائی وخلوت میں جداگانہ رائے لینے کو پسند کرتی

تھیں۔ تاکہ ہر شخص اپنی پوری ہمت وقوۃ سے کسی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

یہ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں سے صورت اول یعنی جداگانہ ہر ہر فرد سے مشورہ لینا باعتبار حصول نفس مقصود مرجح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مقصود صرف یہ ہے کہ عقلاء اپنی عقل سلیم اور تجربہ تام کی بدولت حل مشکل کے لئے کوئی راہ نکالیں اور یہ مقصود جداگانہ رائے لینے میں زیادہ حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ دونوں صورتوں میں اگر کوئی خاص نفع لئے ہوئے ہیں تو دوسری جانب نقصان ومضرت سے بھی خالی نہیں اسلئے مطلقاً کسی ایک صورت کو ترجیح دینا یا ہر ایک موقعہ پر اسی طریقہ کو قابل عمل وقبول سمجھ لینا بھی کسی طرح قرین صواب ودانشمندی نہیں ہے۔ اس لئے امام ابوالحسن[1] ماوردی دونوں مذہبوں کو بیان کر کے خود یہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ ہم کو سب سے اول یہ دیکھنا چاہیئے کے مشورہ کس بات میں ہے۔ اگر کسی معاملہ میں رائے کے تمام پہلو تو معلوم ہیں لیکن اس کی تنقیح کرنا ہے کہ ان مختلف پہلوؤں میں سے صحیح، حق، اور موصل الی المطلوب کون سا ہے۔ تب تو بحالت اجتماعی مشورہ کرنا مفید اور انفع ہے کیونکہ ہر ایک شق پر مجمع عام میں ردوقدح ہو کر حسن وقبح بظاہر ہو جائے گا اور اگر معاملہ ایسا مبہم ومشکل ہے کہ حل کے طریقے ابھی معلوم نہیں ہوئے اور نہ اس کے اندر جتنے احتمالات ہیں وہ سب معین ومشخص، تب یہی امر متعین ہے کہ ہر شخص کو جداگانہ غور وفکر اور زور طبیعت لگانے کا موقع دیا جائے مجمع عام میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ غرض آراء کی تعیین وتشخیص کی صورۃ میں ان کے صحیح وغلط کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے تو انعقاد مجلس شوریٰ بہتر اور ذریعہ فوز وفلاح ہے۔ اور نفس تعین رائے اور تنقیح طریقہ حل معاملہ کے لئے خلوت میں غور وفکر ہونا انفع واولی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام ابوالحسن ماوردی کا یہ فیصلہ حق اور صواب ہے اور اس نے ہم کو طریق مشورہ اور انعقاد مجلس شوریٰ کی ضرورت۔ غرض وغایت اور طریقے کے لئے شاہراہ

---

(۱)......آداب الدین والدنیا ص:۱۲۲

بتلادی ہے اور یہ ایسا فیصلہ ہے جس پر عمل کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اور اس کو چھوڑ کر کسی ایک صورت کو اختیار کرنا نہ خطرہ سے خالی ہے۔ اور نہ صحیح نتیجہ تک پہنچانے کا متکفل وضامن ہوسکتا ہے مگر اس فیصلہ کی تفصیل بیان کردینے کی ضرورۃ ہے تاکہ جتنی صورتیں اس کے تحت میں داخل ہوسکتی ہیں سب کا حکم معلوم ہوجائے اور کوئی امر مبہم و مجمل باقی نہ رہے۔ اس لئے ہم فیصلہ اصل کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک شق کو بیان کردینا چاہتے ہیں۔

معاملات مشورہ طلب دو حال سے خالی نہیں یا مستشیر کو اس کے تمام پہلو معلوم ہیں یا نہیں اور ہر صورت میں خواہ اس وجہ سے کہ معاملہ زیادہ اہم اور مشکل نہیں یا مستشیر کے نزدیک کسی ایک عاقل و تجربہ کار کا مشورہ کافی ہے ایک شخص سے مشورہ کرے یا جماعت سے یہ کل چار صورتیں ہیں۔

(۱)　رائے کے پہلو معلوم ہیں اور کسی ایک عاقل و مدبر و دانشمند و تجربہ کار قابل اعتماد کی رائے کو کافی سمجھتا ہے۔

(۲)　رائے کے تمام پہلو معلوم ہیں۔ اور اس میں جماعت سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۳)　رائے کے تمام پہلو معلوم نہیں بلکہ رائے کے تمام پہلو معلوم کرنے اور کسی ایک کی رائے کو قابل عمل قرار دینے کے لئے مشورہ کی ضرورت ہے اور ایک شخص قابل اعتماد کی رائے کو کافی سمجھتا ہے۔

(۴)　رائے کے تمام احتمالات کو معلوم کرنے اور پھر اس میں سے ایک احتمال کو ترجیح کے لئے جماعت سے مشورہ کی حاجت ہے۔

صورت اول میں تنہا اس شخص سے جس کو اہل مشورہ لیا گیا ہے تعین رائے صواب کرلینا کافی ہوگا۔ اور صورت ثانیہ میں رائے کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرنے اور پھر ان میں سے کسی ایک پہلو کو قابل عمل قرار دینے کے لئے ایک مشیر کی رائے کافی ہوگی۔ صورت ثالثہ میں یعنی جبکہ رائے کے تمام پہلو واضح و منکشف ہو چکے صرف تعین رائے حق وصواب

کے لئے ایک جماعت سے مشورہ کرنا ہے۔ یہی مفید ہے کہ جماعت کے سامنے بحیثیت اجتماع اس امر کو پیش کیا جائے تا کہ ہر شخص اس میں جس جانب کو پسند کرتا ہے معہ دلائل بیان کرے اور دوسرے کو اس پر قدح کا موقعہ ملے۔ تا کہ بحث و مباحثہ کے بعد ایک جانب قابل عمل قرار دی جاسکے۔ صورۃ رابعہ میں یہ بہتر ہے کہ اول جماعت کے ہر ایک فرد سے تنہا رائے لی جائے تا کہ ہر شخص کو غور وفکر کے بعد رائے قائم کرنے کا موقع ملے اور پھر اس معاملہ کو مجلس شوریٰ میں پیش کر کے تنقیح وتعیین رائے کی جائے۔

اس صورت میں اول تو ہر ایک کی رائے کا موازنہ اور اس کے غور وفکر کا درجہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ دوسرے جماعت کے سامنے قابل عمل پہلو کی تنقیح بھی ہو جائے گی۔

رہی یہ بات کہ مستشیر کو ایک شخص کی رائے پر اعتماد کر لینا کافی ہے یا نہیں اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مشورہ کی جس حد تک ضرورت ہے وہ تو ایک اہل اور قابل اعتماد شخص سے مشورہ کر لینے میں پوری ہو جائے گی۔ یہ شخص حکم مشورہ کی تعمیل کر کے بار استبداد سے سبکدوش ہو جائے گا۔ کیونکہ حکم مشورہ میں ایک یا دو قید کی نہیں ہے۔ مگر معاملات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں بعض معاملات میں ایک کی رائے کافی ہوتی ہے۔ اور بعض ایسے مبہم و مشکل ہوتے ہیں کہ تنہا ایک کی رائے کافی نہیں ہوتی۔ مستشیر کو خود اطمینان حاصل نہیں ہوتا وہ بھی سمجھتا ہے کہ میں نے حق مشورہ ادا نہیں کیا۔ اب یہ خود مستشیر کا فرض ہے کہ معاملہ کی نوعیت کا اندازہ کر کے ایک درجہ کے متعلق وہی عمل کرے جو اس کے مناسب ہے اگر ہر معاملہ میں جماعت ہی سے مشورہ لازم و ضروری یا مناسب سمجھا جائے تو انصرامِ معاملات میں بہت دقت و تنگی پیش آجائے۔

البتہ معاملہ اگر شخصی نہیں بلکہ جمہوری ہے۔ اس کا تعلق عام مخلوق سے ہے تو ایسی حالت میں جماعت سے مشورہ کرنا ضروری یا مناسب ہوگا۔ تنہا ایک کی رائے پر عمل کرنے سے فرض مشورہ کما حقہ ادا نہ ہوگا۔ اس میں اندیشہ مضرت عام اور اتلاف حقوق کا ہے ہاں اگر جماعت ہی کسی ایک اہل و قابل اعتماد کو قائم مقام بنادے تو یہ امر تو دوسرا ہے کہ باعتبار

نوعیت معاملہ شخص واحد سے مشورہ کرلینا موجب اطمینان ہے یا نہیں مگر اس صورت میں اتلاف حق نہیں رہے گا۔ اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ جس صورت معاملہ میں رائے کے تمام پہلو معلوم نہیں بلکہ اول اس کے پہلو معلوم کرنے اور پھر تنقیح کی رائے صواب کے لئے جماعت سے مشورہ کی ضرورت ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اول ہر شخص سے تنہا رائے لی جائے۔ اور پھر مجلس میں جماعت کے سامنے پیش کر کے مختلف رائے میں سے ایک امر کو منقح کیا جائے۔

لیکن اس پر عمل کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کے ہر ایک شخص سے تحریری رائے حاصل کرلی جائے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک سے زبانی رائے لے لی جائے اور مجلس شوریٰ میں پیش کر دیا، رایوں کو بیان کر دے ہر شخص خود اپنی اپنی رائے کو بیان کر دے اور اس پر بحث کرلی جائے۔

یہ بات بھی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ تنہا رائے لینے میں یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ رائے کے تمام پہلو معلوم ہو جائے۔ ممکن ہے کہ بعض پہلو اب بھی مخفی و مستشیر رہے ہوں۔ جن کا انکشاف مجلس شوریٰ میں بوقت اجتماع تبادلۂ خیالات ہو کیونکہ بسا اوقات فرداً فرداً رایوں کے ملانے سے کوئی ایسا بھی احتمال پیدا ہو جاتا ہے جو اب تک کسی کے خیال میں نہیں آیا تھا۔ اس لئے میرے خیال میں جیسا کے یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو تنہائی میں خود غور کرنے کا موقع دیا جائے ایسے ہی اس کی ضرورت بھی ہے کہ مجلس شوریٰ میں بحثیت اجتماعی پیش کیا جائے۔ ایک حالت دوسری سے مستغنی کرنے والی نہیں مشورہ کی دونوں صورتیں لازم وملزوم ہیں۔

زمانہ حال میں طریقے کمیٹیوں اور پارلیمنٹوں میں عام مروج ہیں وہ امام ابوالحسن ماوردی کے فیصلوں کے موافق انہیں اصولوں کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں کمیٹیوں اور پارلیمنٹوں میں عام قاعدہ ہے کہ اول تمام امور مشورہ طلب کو لکھ کر ہر ایک ممبر کے پاس بھیج دیا جاتا اور ان سے تحریری رائے حاصل کرلی جاتی ہے پھر ایک تاریخ معین جمع ہو کر اس میں

بحث کر لیتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ممبر اپنی تحریری رائے نہیں بھیجتے۔ بلکہ غور وفکر کے بعد جو رائے قائم کرتے ہیں اس کو خود مجلس شوریٰ میں ظاہر کرتے ہیں اور یہ تو غالب رواج ہے کہ صرف رائے لکھ دیتے ہیں اس کے وجوہ نہیں لکھتے بلکہ مجلس میں ممبران کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ اور یہ بعینہ وہی طریقہ ہے جو امام ابوالحسن نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ دفعتاً پیش آجاتا ہے اور جداگانہ رائے حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے موقع میں ممبران کمیٹی یا پارلیمنٹ کو جمع کر کے معاملات مشورہ طلب میں رائے زنی کر لی جاتی ہے اور ایسا کرنا بالکل کافی ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات علاوہ ان معاملات کے جن کی بابت رائے حاصل کرتی ہے وقت اجتماع ومباحثہ کوئی جدید معاملہ پیش کر کے تبادلۂ خیالات کر لیا جاتا ہے ایسا کر لینا بھی کافی ہے اور ضرورت مشورہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشورہ کی ہر صورت کافی ہے البتہ احسن طریقہ یہی ہے کہ اول جداگانہ رائیں حاصل کر لی جائیں اور پھر مجلس میں ان پر بحث ومباحثہ ہو کر ایک جانب کو معین کر لیا جائے۔

مشورہ کو دہرانے اور دوبارہ کرنے کی ضرورت:

انسان فطرتاً تدریجی ترقی کرتا ہے۔ کوئی کمال اسکو دفعتاً حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے مشورہ میں صحیح رائے تک پہنچنا بھی بتدریج ہوتا ہے۔ کیونکہ صحیح نتیجہ تک بذریعہ مقدمات کے پہنچتا ہے اور تمام مقدمات کو اول وہلہ میں حاضر فی الذہن ہونا ضروری نہیں اس لئے بسا اوقات یہ امر پیش آتا ہے کہ ایک عاقل ومجرب معاملہ کو سنتے ہی کوئی رائے قائم کر لیتا ہے۔ اور پھر غور وفکر کے بعد اس سے منتقل ہو کر دوسری رائے پر جمتا ہے۔ اسی بناء پر عقلاء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اول وہلہ کی رائے کو قابل اعتماد نہ سمجھنا چاہیئے۔ تاوقتیکہ مکرر سہ کرر غور نہ کر لیا جائے۔ جب تنہا کسی ایک شخص سے رائے لی گئی۔ یا جماعت کے سامنے پیش ہو کر کوئی امر منقح کر لیا گیا۔ تو عمل کرنے میں اتنی تاخیر کرنی مناسب ہے جس سے اصل معاملہ

کونقصان نہ پہنچے۔ اہل الرائے کو آراء پر کامل غور کرنے کا موقع مل جائے اور وہ رائے پختہ ہو جائے۔

عامر ابن الظرب حکیم عرب کا مقولہ ہے۔

دعوا الرای یغبّ حتّی تخمّر وایّاکم والرای الفطیر یرید الاناۃ فی الرای والتثبّت فیه .

رائے کو اس وقت تک چھوڑ دو جب تک رات گزر کر اس کا خمیر نہ اٹھ جائے تم کو پہلی مرتبہ کی رائے سے پرہیز کرنی چاہیئے۔ عامر بن الظرب کی غرض اس سے یہ ہے کہ رائے میں تدبر و تثبت سے کام لیا جائے جلدی نہ کی جائے۔

ابن ہبیرہ نے اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:۔

لاتکن اوّل مشیر وایّاک والرای الفطیر ولا تشر علی مستبدٍ فانّ التماس موافقته لوم والا ستماع منه خیانةٌ .

سب سے پہلا مشیر نہ بن اور بچتا رہ اول منہ سے نکلی ہوئی رائے سے کبھی خود رائے کو مشورہ نہ دے کیونکہ اس سے موافقت کی خواہش کرنا دناءۃ میں داخل ہے اور اس کی بات کا سننا خیانت ہے۔

عبداللہ بن وہب کا قول ہے۔

ایاکم ولرأی الفطیر وکان یستعیذ باالله من الرأی الدری الخیر .

بچتے رہو رائے فطیر سے۔ اور پناہ مانگتے تھے وہ یعنی عبداللہ ابن وہب اس اچھی مفید رائے سے جو بعد از وقت دی جائے۔

حاصل یہ کے عقلاء کے نزدیک رائے کا رس رس کے پختہ ہونا اور قائم ہونا زیادہ قابل اعتبار و اعتماد ہے۔ اس لئے حتی الوسع رائے قائم کرنے اور اس پر عمل کرنے میں جلدی نہ کی جائے ہاں اس میں اس قدر تاخیر بھی سخت مہلک ہے کہ معاملات کا وقت ہی

فوت ہو جائے۔ اور تدبیر کا وقت نکل جائے کیونکہ اول وہلہ رائے پر عمل کرنے میں تو نقصان کا صرف احتمال ہے اور اس صورت میں یقین ہے۔

زمانہ حال کے پارلیمنٹوں میں مسودات قانون وغیرہ کو کئی بار پیش کرنا اور سنانا اور ممبران سے دوبارہ سہ بار رائے لینا اسی اصول پر مبنی ہے جو حکماء عرب وعلماء اسلام بہت زمانہ پہلے ممہد کر چکے ہیں۔

فیصلہ مشاورت

ان تمام مراحل کے بعد جو بیان کئے گئے ایک اہم اور نہایت اہم مسئلہ کی توضیح وتفصیل ضروری ہے جس پر مشاورۃ یا مجلس مشاورۃ کی کامیابی وناکامیابی کا مدار ہے اور وہ یہ کہ درصورت اختلاف فیصلہ قطعی کرنے اور چند آراء مختلفہ سے کسی ایک رائے کو معتمد علیہ۔ قابل عمل صحیح اور منتج قرار دینے کی کیا صورت ہے جب تک اس مسئلہ کو طے کر کے فیصلہ کی صورت نہ بتلائی جائے۔ تمام شرائط وآداب مشاورت اور انعقاد مجلس مشاورۃ لغو وبیکار ہے۔

ہمارا خیال ہے کے غالبًا ایک سطحی نظر والا سن کر یہ کہہ دے گا کہ اس مسئلہ میں اہمیت کیا ہے فیصلہ کا طریقہ ظاہر اور عقلاء زمانہ کا معمول بہا ہے وہ یہ کہ جس جانب کثرۃ رائے ہو وہی جانب حق ہے۔ اور اسی کے موافق فیصلہ استقرار رائے ہونا چاہیئے۔ اس میں نہ کوئی خلجان کی بات نہ تفصیل کی ضرورت اور نہ ایسی واضح بین اور معمولی امر کو تفصیل اور تشقق کی الجھنوں میں ڈالنے کی حاجت۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ مسئلہ فی الواقع مشکل ہے اور بغیر اس کے حل وتوضیح کے مشاورۃ کے سارے مراتب ناتمام ہیں۔ چاہے معیار صحت رائے کثرۃ آراء ہی ہو مگر تاوقتیکہ اس کو مدلل نہ بیان کیا جائے۔ اور اس کے تمام پہلوؤں کو واضح نہ کر دیا جائے کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔

علاوہ اس کے ہم کو رفتار زمانہ سے نظر اٹھا کر دیکھنا یہ ہے کہ شریعت نے مشورہ کو مہتم بالشان امر قرار دیا ہے اور درصورۃ مشاورۃ اختلاف ہونا ضروری ہے۔ تو آیا شریعت نے ایسی حالت میں فیصلہ کی کوئی صورت بیان کی ہے یا احکام ونظائر شرعیہ سے کسی صورت کا استنباط ہوسکتا ہے۔ اسی بناء پر ہم عقلی وشرعی دونوں جانب کا لحاظ کر کے اس مسئلہ کی اس قدر توضیح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ کسی فہیم کو حقیقت الامر کے انکشاف میں تردو تامل کی گنجائش نہ رہے گی۔

لیکن ہم اپنے بیان میں اول عقلی وشرعی طور پر فیصلے کی صورتوں اور کسی ایک صورت کی ترجیح پر بحث کریں گے اور اس کے بعد نتائج اخذ کریں گے۔

عقلی طور پر فیصلہ کی بحث:

اختلاف رائے کی صورت میں کسی رائے کو قابل عمل وقبول قرار دینے کے اندر کل دو احتمال ہیں قوت دلیل اور کثرت آراء لیکن جب ہم عقل کی میزان میں تولتے ہیں تو ہم کو مثل روز روشن واضح ہو جاتا ہے کہ اصل ترجیح اور فیصلہ قوت دلیل کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ کثرۃ آراء کو صحت رائے اور فیصلہ میں بذاۃ کچھ دخل نہیں ہے ہاں کثرۃ آراء چونکہ بسا اوقات قوت دلیل کی علامت ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو قائم مقام قوت دلیل کا سمجھ کر اسی کے موافق فیصلہ دیدیا جانا بعید از عقل نہیں ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کا وہ جوہر جس نے اس کو تمام ذوی الارواح اور حیوانات پر خواہ ملک وجن بھی اگرچہ اس کے شریک وسہیم ہوں مگر جس درجہ علم وعقل اسکو عطا ہوا ہے اس درجہ کا ان کو نہیں۔ اگر ناواقف یا ظاہری عقول کے پابند انسان کی برتری ملک وجن پر تسلیم نہ کریں یا وجود ملک وجن کی قائل ہی نہ ہوں۔ تب بھی اس کے تسلیم میں تو ان کو تامل نہیں ہوسکتا کہ تمام حیوانات، طیور و وحوش پر انسان کو عقل وعلم کی وجہ سے امتیاز وفوقیت حاصل ہے۔ اور یہ بات بھی تسلیم ہے کہ تمام افراد انسان عقل وعلم میں مساوی نہیں۔ بلکہ ان

کے درجات میں اسقدر تفاضل وتفاوت موجود ہے کہ بعض انسان بہ نسبت بعض کے درجہ حیوانیت وغیرہ ذوی العقول میں داخل معلوم ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی تسلیم ہے کہ استنباط، استدلال، دقیقہ سنجی، حقیقت شناسی، جزئیات سے کلیات تک پہنچنا، حاضر سے غائب کی طرف منتقل ہونا، چند معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا، چند مقدمات سے دلیل کا ترکیب دینا، دلیل سے نتیجہ کا برآمد ہونا سب عقل پر موقوف ہے۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ عقل کو تجربہ سے کیا غرض ہوتی ہے جب تمام امور مسلم ہیں تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے کہ کسی معاملہ کی کنہ وحقیقت تک پہنچنا اور اس کے تمام جوانب واحتمالات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح وسقیم میں امتیاز کرنا۔ پھر ہر ایک دعویٰ کو دلائل قویہ سے مبرہن ومدلل کرنا اسی شخص سے ہوسکتا ہے جس کو عقل خداداد نصیب ہو اور عقل کی پختہ کاری تجربہ سے ہوچکی ہو۔ اور پھر اہل عقل کی عقول میں جتنا تفاوت ہوتا جائے گا اتنا ہی ان امور میں تفاوت نظر بھی نظر آئے گا۔

جب یہ امور تسلیم ہوچکے تو اب فرض کر لیجئے کہ ایک شخص جس کی عقل کامل اور تجربہ تام ہے ایک جانب ہو۔ اور دنیا کے کل یا اکثر افراد جو عقل سے بے بہرہ یا قلیل البضاعت ہیں دوسری جانب تو عقل کا فیصلہ اس معاملہ میں کیا ہوگا صرف یہی کہ جس کی عقل کامل وتجربہ تام کا بمقابلہ ان افراد انسانی کے جو بالکل بے عقل وناتجربہ کار ہیں یا عقل وتجربہ سے کم حصہ لئے ہوئے ہیں قابل اقتداء تسلیم کرنا لازم ہوگا۔

زمین کے تمام طبقات پر جس قدر قومیں آباد ہیں۔ ابتداء آفرینش سے جس قدر دور منظر ارض پر ظاہر ہوکر مٹ چکے ہیں ان میں سے ہر ایک قوم اور ہر دور پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے یہی آئے گا کہ جب کسی ایک شخص کی عقل وتجربہ کو اول درجہ کا تسلیم کر لیا گیا تو ملک کے ملک اسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں وہ کچھ بولتا ہے یہ بھی بولنے لگتے ہیں وہ جو حکم بھی دیتا ہے اس کا اتباع کرتے ہیں وہ جس امر کا مشورہ دیتا ہے اس کے امتثال کو

اپنا فخر سمجھتے ہیں پھر یہ بات نہیں کہ وہ سارے کے سارے بے عقل و نا تجربہ کار ہیں نہیں۔ باوجود عقل و تجربہ رکھنے کے اس کے اتباع کو اس لئے اپنا فرض قرار دیتے ہیں کہ اس کی عقل کو اپنی عقل سے زیادہ کامل۔ اس کے تجربہ کو تام سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ سمجھتے تو ہرگز کوئی ایک عقل والا بھی (چہ جائیکہ تمام عقلاء) اس کا اتباع نہ کرتا۔

اب ہر ملک ہر ایک قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ موجودہ حالات کو خیال کر لیجئے کہ ہر ایک ملک وقوم میں ہر ایک زمانہ کے اندر ایسے افراد گزرے ہیں کہ نہ صرف زمانہ حیات میں وہ قابل اتباع وانقیاد سمجھے جاتے تھے بلکہ بعد کی نسلوں نے بھی ان کے طریقہ میں چلنا ان کے اصول پر کار بند ہونا موجب فخر وفلاح سمجھا ہے۔ اس کی ایک نہیں۔ دو نہیں ہزاروں مثالیں ملیں گی۔

پھر اگر کسی مسلم شخص کے اصول وطریقہ میں کسی دوسرے صاحب عقل وفراست نے کچھ ترمیم کی یا بجائے ان کے دوسرے اصول قائم کئے تو جبتک وہ اپنی عقل وعلم کی بدولت دلیل قوی اس کے خلاف نہ کریگا اپنے مشاہدات وتجربات سے جن سے استخراج نتیجہ بھی عقل ہی کا کام ہے سابق اصول وقواعد کے خلاف کچھ نہ دکھلا سکا۔ کسی نے اس کے قول کو تسلیم نہیں کیا۔ ان اصول وقواعد کو تسلیم کر کے سابق اصول وقواعد کو چھوڑا تو صرف اسی بناء پر کہ اس مؤخر الذکر شخص کے عقل وتجربہ کو اول سے فائق، اس کی دلیل وحجتہ کو اس سے قوی اس کے مشاہدہ وتجربہ کو اس سے زیادہ اور تام سمجھ لیا۔

غرض مدار اتباع وانقیاد واصابت رائے کا قوت دلیل پر ہمیشہ سے رہا ہے تمام عقلاء از ابتدا تا انتہا اسی پر کار بندر ہے ہیں۔ کثرت افراد تنہا کبھی ترجیح کا سبب نہیں ہے۔ ہاں کثرت افراد اور قوت دلیل دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے۔ اس کو اور وضاحت سے سمجھنا ہے تو زمانہ حال کے قواعد کو جو عقل وہمت کا زمانہ کہا جاتا ہے اور جس کو قرن مشرق کا خطاب دیا جاتا ہے دیکھ لیجئے پارلیمنٹوں، کونسلوں، بورڈوں، اور میونسپلٹیوں میں ایک

ملک ایک شہر یا ایک محلّہ یا ایک قوم کی طرف سے ایک یا دو قائم مقام ہو کر ممبر بنتے ہیں۔ اور اہل ملک یا شہر یا محلّہ یا قوم اپنی جانب سے ان کو تمام حقوق قائم مقامی دیکر سیاہ سفید کا مالک بنا دیتے ہیں۔ اس کا تسلیم کر لینا ان سب کا تسلیم کر لینا ہوتا ہے۔ اِن کا انکار، اُن کا انکار سمجھا جاتا ہے۔

یہ طریقہ اسی اصول کی بناء پر قرار دیا گیا ہے کہ ہر ایک فرد تو ممبر بن نہیں سکتا نہ ہر ایک کی رائے لی جاتی ہے تو لا محالا ان کو اختیار کر دیا گیا ہے کہ اپنے میں سے ایک یا دو ایسے افراد کو ممبر منتخب کر دیں جو مدبّر ہونے کے ساتھ ان کے حقوق و فرائض ان کے رسوم و عادات کا تجربہ تام رکھتا ہو پس ظاہر ہے کہ وہ لاکھوں اور ہزاروں افراد میں ایک شخص جو دانشمندی و فراست تدبیر و تجربہ میں ممتاز سمجھا جاتا ہے ایک قوم کی قوم کا نائب اسی وجہ سے بنا دیا جاتا ہے کہ سب کو اس کی عقل فراست پر اعتماد ہے۔ اس کی عقل کنہ اس معاملات کی تہہ تک پہنچنے کے قابل ہے۔ اس کا تجربہ ہر نازک موقع پر رہبری کرنا اور اپنے ملک یا قوم کو ورطۂ ہلاکت سے بچا کر کامیابی کی بلند سطح تک پہنچانے کے لائق ہے۔ اس شخص کی عقل تمام عقول کے ہم پلہ نہیں بلکہ سب سے زیادہ وزندار سمجھی جاتی ہے۔ گو ایک قوم کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے کثرت کو بھی وہ اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر اس کے انتخاب میں یہ کثرۃ کارآمد نہیں ہوتی اور نہ اس بناء پر اس کا انتخاب ہے۔ اگر انتخاب میں فقط یہی امر ملحوظ نظر ہوتا کہ وہ کثیر جماعت کا قائم مقام بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی ہدایت اس کثیر جماعت کی رائے سمجھی جائے تو اول یہ لازم ہوتا ہے کہ جب ممبران پارلیمنٹ یا کونسل میں اختلاف ہوا کرتا تو صرف ممبران کی قلت و کثرت پر نظر نہ کی جاتی بلکہ ایک نائب کے ساتھ اس کی قوم کی کثرت عدد کو بھی فیصلہ میں دخل ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دوسرے انتخاب کے لئے دانشمندی و تجربہ کاری کا وصف لازم نہ سمجھا جاتا قوم اپنے خیال پر مطلع کرنے کے لئے محض قاصد یا سفیر کے درجہ پر اس کو رکھتی اور اس کی رائے کو کبھی گوارا نہ کرتی۔

غرض اصل لحاظ اس انتخاب میں ممبر کی دانشمندی وتجربہ کاری ہمدردی کا ہے یہ دوسرا امر ہے کہ کوئی قوم یا ملک ان اصول کو پس پشت ڈال کر دوسرے اغراض ومقاصد کی بناپر دانشمند پر غیر دانشمند کو تجربہ کار کو ترجیح دیدے اور کسی ایسے شخص کو منتخب کردے جس سے زیادہ ہوشمند وتجربہ کار موجود ہیں یہ امر خلاف اوصول ہوگا جو حجت کے موقع پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں ہر ایک ملک وقوم اپنے لیڈروں کا اتباع صرف اسیوجہ سے کرتے ہیں کہ ان کی تجربہ وعقل کاری اور ساتھ ہی ان کی ہمدردی وخیر خواہی پر پورا اعتماد ہوتا ہے ان کو عقل وتجربہ میں اپنے سے زیادہ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہوتی ہے کے لیڈروں کے قول کو رد کرنا یا ان کے طریقہ کے سوا دوسری راہ اختیار کرنا قومی جرم سمجھا جاتا ہے ایک لیڈر قوم کی قوم بلکہ ملک کے ملک کا ذمہ دار ان کے نفع وضرر کا مالک ہوتا ہے۔اور قوم ان کے سامنے سر نیاز خم کئے ہوئے رہتی ہے۔

اس سے بھی ذرا نظر کو اونچا کیجئے تو نظام سلطنت کی ترکیب میں کو آپ کو بہت سے کیل پرزے دکھائی دیتے ہیں۔مگر سارے نظام کی حرکت کسی ایک ہی محور پر ہوتی ہے۔وزراء میں سے جو وزیر ہوشمندی۔دانائی۔فراست وتجربہ میں چلتا ہوا ہوتا ہے۔باقی وزراء اس ڈگری پر چلتے ہیں۔اول سے آخر تک ہر صیغہ ومحکمہ پر اسی وزیر کا رنگ غالب نظر آتا ہے یہ بھی صرف اس وجہ سے ہے کہ جب کسی کو عقل وتجربہ میں فائق وممتاز سمجھ لیا گیا تو اس کی آراء اور تدابیر پر بھی اعتماد کرلیا گیا ورنہ مساوی درجہ کے وزراء کو برابر حق حاصل ہوتا کہ اس کی جس بات کو چاہیں رد کردیں اور جس کو چاہیں قبول کریں قوانین سلطنت نے ان کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا ان کی آزادی مسلوب نہیں ہوئی۔اختلاف سے کوئی امر نہیں ہے۔باایںہمہ انقیاد ومتابعت جس امر میں خلاف کر بیٹھتے ہیں۔پھر کسی شخص واحد کی گو کتنے ہی بڑے درجہ کا معتمد اور قابل ہو ان کی کچھ نہیں چلتی۔خلاصۂ یہ کہ عالم کے نظام اور افراد کے طریقۂ عمل سے یہ ثابت ہے کہ جن کی عقل تام،نظر غائر،طبیعت دقیقہ سنج،اور تجربہ تام

ہے۔انہیں کی بات بھی تسلیم ہوتی ہے۔عقلاء زمانہ کا یہی طرز عمل ہے۔اسی بناء پر فیصلہ کی دونوں صورتوں میں سے جن کا ذکر اول کیا گیا تھا۔عقل کی رو سے فیصلہ صرف قوۃ دلیل پر مبنی ہونا چاہیئے۔کثرۃ آراء کو فی حد ذاتہ اس میں کچھ دخل نہیں ہے لیکن کثرت رائے بالکل نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ حمقاء، جہلاء، نادان ونا تجربہ کار افراد کی رائے کا نہ اعتبار ہے نہ وقعت۔ان کی کثرت قلت کا اثر حقیقتاً معاملات پر کچھ بھی نہیں پڑتا۔گفتگو ہے تو عقلاء کی رائے میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ گو عقلاء میں باہم فرق مراتب ہو۔اور اسی وجہ سے ان کے آراء کی قوت وضعیف میں بھی فرق ہو مگر چند عقلاء کی رائے میں وہ قوت ہوسکتی ہے جو ایک عاقل کی رائے میں نہیں ہوسکتی۔اب فرض کرلو کہ ایک جانب ایک عاقل کی رائے ہے اور دوسری جانب چند کی۔اس حالت میں فیصلہ کی صورت تو یہ ہی ہونی چاہیئے کہ جو رائے قوی ہے اسی کے موافق عمل کیا جائے اب اس عاقل کی رائے کی قوت کو دوسرے عقلاء اور اہل حل وعقد نے تسلیم کرلیا تب تو اس کی ترجیح میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔لیکن فرض کرلو کہ اختلاف قائم رہا۔اور ہمارے پاس کوئی معیار ایسا نہیں جس سے قوت وضعف کا اندازہ کرسکیں تو اس وقت مختلف آراء میں سے کسی رائے کو قوی اور مرجح قرار دینے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ چند عقلاء کی رائے کو ایک رائے کے مقابلہ قوی سمجھا جائے۔اور اس بناء پر فیصلہ اس جانب ہو جس جانب کثرۃ رائے ہے اور یہی وہ بات ہے جس کہ ہم اول عرض کر آئے ہیں کہ کثرت رائے کو گو فی حد ذاتہ ترجیح نہ ہو۔مگر علامتہ قوۃ دلیل ہے۔

اس ہمارے بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ عقل کی رو سے درصورت اختلاف آراء اصل فیصلہ قوۃ دلیل پر ہوگا۔اگر چہ یہ قوۃ کسی ایک رائے کو بمقابلہ بہت سے آراء کے حاصل ہو۔لیکن درصورتیکہ قوۃ رائے معلوم کرنے کا کوئی معیار ہمارے پاس نہ ہو تو اس وقت قوۃ کی علامتہ کثرۃ رائے عقلاء ہے اور کثرۃ رائے کے حق میں فیصلہ دینا حقیقتاً قوۃ دلیل ہی کی بنا پر ہوگا۔

اس کے علاوہ کثرت رائے کے حق میں ایک فیصلہ دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ جب آراء میں اختلاف ہے اور کوئی قوۃ جابر اس سے اوپر ایسی نہیں جو رائے مغلوب کو رائے غالب پر فوقیت دے دے تو اس اختلاف ونزاع کے مٹانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ ہر ذی رائے اپنی رائے پر مصر۔ اسی کو حق وصواب سمجھے ہوئے اسی کے موافق فیصلہ کا متمنی ہے۔

ادھر قوت رائے کوئی محسوس چیز نہیں جس کے ماننے پر ہر کسی منکر کو مجبور کیا جا سکے ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی رائے عمل نہیں کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے کیونکہ کثرت ایک محسوس چیز ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔)

اسلام میں مشورہ کی اہمیّت

(حصہ دوم)

تحریر: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ

الحمدللّٰہ و کفٰی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

امابعد:۔ یہاں تک عقلی طور پر صورت فیصلہ سے بحث کی گئی ہے اس کے بعد ہم مسئلہ کا دوسرا پہلو یعنی شرعی طریقہ اور سلف کا طرز عمل پیش کرتے ہیں اور حقیقت میں ایک مسلمان کے لئے یہی مشعل راہ ہے۔

نصوصِ قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ وتابعین پر نظر ڈالنے سے بالا جمال اتنی بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ شریعت اسلام نے مشورہ کا فیصلہ درصورت اختلاف کثرت رائے کے سپرد نہیں کیا بلکہ قوت رائے کا لحاظ کرتے ہوئے امیر مجلس کو اختیار دیا ہے کہ بجائے اکثریت کے اقلیت کو ترجیح دیدے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ حل ہوجائے گا کہ اسلامی خلافت ملوکیت وشخصیت کی شان رکھتی ہے یا جمہوریت کی پھر چونکہ یہ مسئلہ خود ایک مستقل بحث ہے۔ جو مدّت سے ملک میں چھڑی ہوئی ہے اس لئے ہم اس گزارش کو اسی عنوان کے ماتحت پیش کرتے ہیں۔ واللّٰہ الموافق للصواب و المیسر للعصاب۔

اسلامی خلافت ملوکیت ہے یا جمہوریت

اسلام جس توسط واعتدال کو اپنے ساتھ لایا ہے اس کے آثار تمام اسلامی احکام اعتقادات، اخلاق، معاملات، سیاسات ومعاشریات میں نمایاں طور پر مشاہد ہیں۔ اور

یہی اعتدال اس امت اُمیہ کا طغرائی امتیاز ہے۔

وكذالک جعلنا كم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط امت بنائی ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

مکہ معظمہ کی زاہدانہ زندگی کے بعد جب اسلام تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے اپنی سیاست اور تدبیر مما لک میں بھی اسی اعتدال اور توسط سے کام لیا۔

اور ملوکیت و جمہوریت کے افراط وتفریط کو اٹھا کر سلطنت وسیاست کا ایک ایسا محکم قانون تیار کیا جو تمام مفاسد سے پاک اور تدبیر مما لک کی تمام ضروریات کے لیے صحیح معنوں میں کفیل ہے۔

ملوکیت اور شخصیت کے مفاسد:

تو محتاج بیان نہیں کیونکہ مروّجہ ملوکیت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) تمام ملک ایک شخص کا غلام بلکہ غلاموں سے زیادہ پابند ہو۔

(۲) یہ شخص ظلم کرے یا انصاف کسی کو اس کے خلاف لب کھولنے کا حق نہ ہو۔

(۳) عہد سلطنت اسکی نسل میں متوارث ہو باپ کے مرنے کے بعد سارا ملک بیٹے کے قبضے میں آ جائے خوہ یہ کیسا ہی جاہل بدخلق اور نا اہل نالائق ہو۔

(۴) تمام ملک کی جان و مال اس کی ایک جنبش لب سے زیروزبر ہو سکتے ہوں الغرض شخصیت کا قانون محض بادشاہ کی زبان ہے اور تمام خلق اللہ کی موت وحیات محض اس کے رحم پر موقوف ہے۔ ساری مخلوق اس کی ذاتی خواہشات کی تختہ مشق ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت سے نظام سلطنت کیا قائم رہ سکتا ہے۔ اور لوگوں کے حقوق کیا ادا ہو سکتے ہیں۔

جمہوریت کے مفاسد:

آج کل کی مصطلحہ اور مروجہ جمہوریت میں اگر چہ وہ مفاسد نہیں جو ملوکیت میں بیان کئے گئے لیکن اس میں بعض دوسرے ایسے مفاسد موجود ہیں جو نظام عالم کے قطعًا خلاف ہیں:۔

(۱) پہلی بات تو یہی ہے کہ جمہوریت میں امیر و بادشاہ کی حقیقت ایک شطرنج کے بادشاہ سے زائد نہیں صرف اتنی عنایت اس کے حال پر کی جاتی ہے کہ اس کی رائے کو دورائے کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ اور بس حالانکہ عالم کا فطری مقام اوّل سے آخر تک اُسّی کا مقتضی ہے کہ نظام سلطنت کا ذمہ دار کوئی ایک بااختیار شخص ہونا چاہیئے جس کو حقیقی طور پر امیر و حاکم کہا جا سکے اور جو امور سلطنت کے حل وعقد کا مالک ہو۔ اور جس کی اطاعت تمام رعایا پر فرض ہو۔

(۲) دوسرے ممبران جمہوریت کے باہمی اختلاف رائے کے وقت جمہوریت کا فیصلہ کثرت رائے کے تابع ہوتا ہے۔ کثرت رائے کے مقابلہ میں نہ امیر کی کوئی ہستی ہے اور نہ دوسرے اہل رائے اور تجربہ کار لوگوں کی۔''

اور یہ ایک ایسی اصولی غلطی ہے جو سَیکڑوں غلطیاں اپنے دامن میں رکھتی ہے آج ہمارے یہاں کونسلوں اور بورڈ کے الیکشن میں جو طوفان بے تمیزی کے منظر سامنے آتے ہیں اور کثرت رائے کے فیصلوں کے جو ناگوار نتائج ہیں روز مرّہ بھگتنے پڑتے ہیں ان کے مفاسد سے شاید کوئی انسان آنکھ نہ چرا سکے۔ آٹھ آٹھ آنہ میں رائے بکتی ہے۔ ہر فریق کثرت رائے حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھیار کام میں لاتا ہے۔ تعلقات کے دباؤ زور زور کی نمائشوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔ اور بالآخر نتیجہ اس شخص کے ہاتھ ہوتا ہے جس کی گرہ میں روپیہ زیادہ ہو اور جو رسوئیوں میں بے دریغ خرچ کرنے کا عادی ہو۔ یا جس کے تعلقات سے یا زور سے لوگ مرعوب ہوں۔ یہ ایک

ایسی بداہت ہے کہ جس کا ہر شخص سالانہ مشاہدہ کرتا ہے۔

اور پھر یہ طوفان بے تمیزی اپنی برکات جو ملک میں چھوڑ جاتا ہے وہ سب سے زیادہ قابل غور ہیں۔ الیکشن کا فتنہ تو چند روز میں ختم ہو جاتا ہے، لیکن باہمی خانہ جنگیاں عداوتیں اور بغض وعناد جو اس وقت قلوب میں قائم ہو جاتی ہے وہ اکثر ایسا صدقہ جاریہ ہوتا ہے جو قبروں میں ساتھ جاتا ہے۔

اس سال کونسل کے الیکشن کے زمانہ میں ایک مقتدر باپ کو بیٹے کے شرمناک عیوب اخبارات واشتہارات میں شائع کرنے سے دریغ نہ تھا، ہونہار فرزند کو بھی ہم اس میدان کارزار میں باپ سے کسی طرح کم نہ پاتے تھے۔ بلکہ ہر گالی کا جواب اس سے زیادہ وزن کی گالی سے دیا جاتا تھا۔

خیر یہ تو اس حریت کا نتیجہ تھا جو یورپین تمدن کا لازمی اثر ہے اور جس کا خلاصہ نہ فقط مذہب سے آزادی بلکہ انسانیت کی ہر پابندی سے آزادی ہے۔

الغرض یہ سب اس جمہوریت اور کثرت رائے کے فیصلوں کی برکتیں ہیں جس کو آج سیاست کا اساسی قانون بنالیا گیا ہے۔

موجودہ اور مروّجہ جمہوریت کے فیصلوں پر اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو جمہوری حکومت کا خودسرا میر یا روپیہ نکلتا ہے اور یا جبر واستبداد اور مکروفریب کیونکہ جب کثرت رائے کا پردہ فاش ہوتا ہے اس کے پس پردہ یہی چیزیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ الیکشن کے تمام انتخابات میں عموماً وہ خودغرض، ہواپرست، نااہل لوگ، خلق اللہ کی جان ومال کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ جن کی نیت اور ہمت ابتداء سے اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ہمیں حکومت کی کرسی مل جائے۔ پھر مخلوق آرام سے رہے یا تباہ ہو۔ چنانچہ ان کے رائے زنی کا حاصل بھی اس سے زائد نہیں ہوتا کہ جس طرف زیادہ ہاتھ اٹھتے نظر آئے انہوں نے بھی اپنی جھنڈی اسی طرف کے لئے اٹھادی۔ اکثر انہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ

کس معاملہ کے متعلق ہم سے رائے لی گئی ہے۔

اوران تمام فتنوں کے طوفان کی ذمہ داری صرف کثرت رائے کے فیصلوں پر ہے اگر اختلاف رائے کے وقت فیصلہ امیر مجلس کے سپرد ہوتو ان میں سے اکثر مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

الغرض جس طرح شخصیت محض بادشاہ پرستی کا نام ہے اور نظام عام کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ اسی طرح آج کل کی مصطلحہ جمہوریت اس کے بالکل خلاف ایک غوغاء ناس کا نام ہے جس کے مفاسد بھی شخصیت سے کم نہیں۔

اسلام جو نظام عالم کا حقیقی ذمہ دار ہے اس کا فرض تھا کہ اس افراط وتفریط کے درمیان ایسا راستہ اختیار کرے جو ہر قسم کے مفاسد اور خطرات سے پاک ہو۔

چنانچہ اسلامی حکومت کی بنیاد ایک ایسے قانون پر رکھی گئی جو بعض اعتبارات سے شخصیت سے ملتا ہے اور بعض وجوہ سے جمہوریت کا ہمرنگ ہے۔

یعنی خذ ماصفاودع ماکدر

جو بات اچھی ہواس کو اختیار کرلو اور جو بری ہو چھوڑ دو

کے قانون پر عمل کرتے ہوئے شخصیت و جمہوریت دونوں کی وہ دفعات جو مفاسد پر مشتمل ہیں اسلام نے ان سب کو نظر انداز کر دیا اور جن دفعات کے ماتحت نظام عالم درست ہو سکے ان کو اختیار کرلیا۔ جس کی اجمالی صورت یہ ہے۔

۱)...... اسلامی خلافت میں وراثت نہیں چلتی۔ یہ ضروری نہیں کے باپ کے بعد بیٹا یا اسی کو نسل کا کوئی اور آدمی خلافت وامارت کا جاگیر دار ہو۔ بلکہ بیعت عامہ یا مشورہ سے انتخاب ہو جائے اور یا سابق خلیفہ کسی شخص کو اپنی رائے سے مقرر کر دے (وہ ہی اس عہدہ پر فائز ہوگا (ازالۃ الخفاء)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اسی دفعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لا خلافة الا عن مشورة (کنز العمال ۳\۱۳۹)

کوئی خلافت بغیر مشورہ کے نہیں ہوسکتی۔

۲)...... مہم معاملات میں تنہا خلیفہ بغیر مشورہ کے طے نہیں کرسکتا۔ آیہ کریمہ " و شاورھم فی الامر" (اور معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیجئے۔) میں خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ کا حکم فرما کر امت کے لئے اسوہ بنا دیا گیا ہے۔

۳)...... اگر خلیفہ کوئی خلاف شرع فعل اختیار کرے تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو حق ہے کہ امر بالمعروف کے قواعد و آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ناصحانہ طور پر کلمہ حق اسکے سامنے پیش کردے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ازالۃ الخفاء میں اس کے متعلق فرماتے ہیں " واز اعظم انواع جہاد است امر کردن خلیفہ بمعروف ونہی اواز منکر بغیر خروج سیف ومی باید کہ بلطف باشد دون العنف و در خلوت باشد دون الجلوۃ تا فتنہ برنخیزد۔"، خلفاء راشدین اور صحابہ کے بہت سے واقعات اس کے شاہد عدل ہیں۔

۴)...... خلیفہ وقت اگر کسی کو صریح خلاف شرع کام کرنے کا حکم دے تو اس پر اس کام میں خلیفہ کا اتباع واجب نہیں۔ حدیث میں اسی دفعہ کے متعلق ارشاد ہے۔"لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔)

۵)...... امیر اگر اسلام کو ترک کرکے مرتد ہوجائے تو وہ امارات سے معزول ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں پر اس سے جہاد کرنا فرض ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی امیر عام طور پر بے دریغ قتل و غارت اور عورتوں کی عفت دری اور غصب مال کرنے لگے اور شریعت کے قانون کا کوئی لحاظ نہ رکھے تب بھی جائز ہے کہ مسلمان اس کے خلاف جمع ہوکر اسے معزول کردیں۔ کیونکہ اس کا حکم ڈاکوؤں کا سا حکم ہے (ازالۃ الخفاء ص ۷) لیکن جب تک یہ نوبت نہ آئے بلکہ شخصی طور پر ظلم کرے اس وقت تک اس کی بغاوت ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ اس کی اطاعت پر صبر کرنا فرض ہے جس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

یہ چند اصولی دفعات ہیں جو جمہوریت سے ملتی جلتی ہیں شخصی سلطنت میں یہ صورتیں موجود نہیں ہوتیں:۔

اور دفعات ذیل شخصیت کی ہمرنگ ہیں۔

۶)......مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرت رائے کے سپرد نہیں۔ بلکہ امیر کی رائے پر ہے اور اس کو اختیار ہے کہ اقلیت کو اکثریت پر ترجیح دیدے۔ قرآن عزیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم فرمانے کے بعد:

فاذاعزمت فتوکل علی اللّٰہ

(پھر جب آپ عزم کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کریں)

بصیغہ واحد حاضر فرما کر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد کسی جانب کو ترجیح دے کر اس کا عزم کرنا یہ فقط آپ کی رائے پر ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور دوسرے خلفاء کے بہت سے معاملات اس کے شاہد ہیں جن کو انشاء اللہ تعالیٰ تبفصیل عرض کیا جائے گا۔

۷)......امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے ذمہ سراً وعلانیتہً فرض ہے۔ جب تک کہ وہ کسی صریح حرام کا حکم نہ کرے۔ قرآن عزیز میں اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

اطیعو اللّٰہ و اطیعو االرّسول و اولی الامر منکم

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو۔

۸)......امیر اگر کوئی ظالمانہ حکم نافذ کرے تب بھی رعایا پر فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ ان کو اس وقت صرف اتنا حق ہے کہ امر بالمعروف کے ذریعہ حق بات اس کے سامنے پیش کردیں اور بس۔ لیکن اگر امر بالمعرف کے بعد بھی امیر اپنے اس حکم پر قائم رہے تو رعایا کا فرض ہے کے صبر کے ساتھ اس کی اطاعت کرے۔ اس کی سرکشی اور بغاوت کے لئے آمادہ ہونا اس وقت بھی جائز نہیں۔ حدیث میں اس دفعہ کے متعلق

بکثرت تصریحات موجود ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ روایت فرماتے ہیں کہ چند گاؤں والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ بعض صدقات کے[1] زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ (یعنی مقدار واجب سے زیادہ ہم سے وصول کرتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا۔

ارضوا مصدقیکم (ابوداؤد)

اپنے عامل صدقہ کو راضی کرو۔

انہوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تب بھی ہم ان کو راضی کریں آپ نے ارشاد فرمایا۔

ارضوا مصدقیکم وان ظلمتم

اپنے عاملین صدقہ کو راضی کرو اگرچہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یہ عاملین صدقہ چونکہ خلیفہ اور امیر وقت کے نائب ہو کر ان لوگوں کے پاس جاتے تھے اس لئے ان کو مجبور کیا گیا ہے کہ ہر حال میں ان کی اطاعت کریں۔ وہ ظلم کریں تب بھی ان کے ذمہ ان کی اطاعت ضروری ہے۔

اسی کے متعلق ایک دوسری حدیث میں حضرت جابر بن عتیک راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سیاتیکم رکیب مبغضون فاذاجاؤکم فرحبوابھم وخلّوا

---

[1] ...... اموال ظاہرہ یعنی مال تجارت اور جانوروں کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے خلیفہ وقت کی طرف سے کچھ لوگ ملازم ہوتے تھے جو تمام صدقات وصول کر کے خلیفہ کے پاس جمع کرتے تھے اور پھر خلیفہ ان کو مصرف زکوٰۃ میں اپنے انتظام سے خرچ کرتا تھا ان لوگوں کو عامل صدقہ کہا جاتا تھا جو امیر وقت کے نائب ہو کر صاحب نصاب لوگوں کے پاس جاتے تھے ۱۲ منہ

بینھم وبین ما یبتغون فان عدلوا فلانفسھم وان ظلموا فعلیھم وارضوھم فان تمام زکوتکم رضاھم ولیدعوالکم

(رواہ ابوداؤد از مشکوٰۃ)

قریب ہے کہ تمہارے پاس چند مبغوض لوگ آئیں گے۔ پس جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ فراخدلی سے پیش آؤ اور جو کچھ وہ طلب کریں ان کو دیدو۔ اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور اگر انہوں نے ظلم کیا تو اس کا ضرر بھی بھگتیں گے تم ان کو راضی کرو اس لئے تمہاری زکوٰۃ کا اتمام ان کی رضا پر موقوف ہے (اور تم ان کے ساتھ اس طرح پیش آؤ) کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔

ان احادیث سے بصراحت معلوم ہوا کہ امیر وقت اگر ظلم بھی کرے تب بھی رعیت کے لئے اطاعت کے سوا کسی جزیہ کا استعمال جائز نہیں۔ جب تک اس کا ظلم و جور اور بد دیانتی عام خلق اللہ کو محیط ہو کر اس درجہ کو نہ پہنچ جائے کہ اس کو ڈاکوؤں کی فہرست میں داخل سمجھا جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

لیکن یہ مطلب اس کا ہرگز نہ سمجھا جائے کہ اسلام نے خلیفہ اور امیر وقت کے لئے ظلم کا میدان وسیع کر کے امراء کو ظلم کرنے پر جری اور بیچاری رعیت کو ظلم سہنے پر مجبور کر دیا ہے اور یہ وہی عجمی ملوکیت و شخصیت ہے جس کے مفاسد اوپر بیان کئے گئے ہیں۔

کیونکہ نظام معاملات کی درستی کے لئے اسلام کا ایک خاص حکیمانہ اصول ہے جس کے تمام پہلو دیکھنے کے بعد ہر فہیم انسان یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ لوگوں کے باہمی معاملات کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے ایک طرف اگر رعایا کو اس پر مجبور کیا ہے کہ امیر وقت کے ظلم و ستم کے

وقت بھی تم اس کو راضی کرنے کی کوشش کرو اور ہر حال میں اس کی اطاعت تمہارا فرض ہے۔تو دوسری جانب امراء کو بھی آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کو اپنی جگہ میں اتنا پابند بنایا ہے کہ ان کی کوئی حرکت وسکون عدل کے خلاف نہ ہو سکے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب آنحضرت ﷺ نے والی یمن بنا کر رخصت کیا ہے۔تو مفصل وصیتوں کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے۔

ایاک و کرائم اموالهم و اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب .

زکوٰۃ میں لوگوں کو عمدہ عمدہ مال منتخب کرنے سے بچو اور مظلوم کی بددعا سے ڈرو۔کیونکہ اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔

نیز حضرت جابر بن عتیک والی حدیث میں جس جگہ رعایا کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں امیر کی اطاعت کریں، وہیں ان امراء کو جو لوگوں پر ظلم کریں۔ مبغوض ومردود فرمایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سیکڑوں احادیث ہیں جن میں سے ذراء سے ظلم کرنے والے امیر کے لئے ایسی سخت سخت وعیدیں فرمائی گئی ہیں کہ ان کو سن کر پتہ پانی ہوتا ہے الغرض ادھر امیر کو اپنی جگہ میں ظلم کے پاس جانے سے روکدیا گیا۔اور ادھر رعایا کو اس پر مجبور کیا گیا کہ اگر وہ اپنے فرائض کو چھوڑ کر ظلم کرنے پر اُتر آئیں تمہیں اس وقت بھی اپنے فرائضِ اطاعت کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔اسلام نے بیشتر تدبیر منزل وتدبیر ملک وغیرہ میں اسی زرین اصول سے کام لیا ہے باپ بیٹے کے معاملات میں ایک طرف بیٹے کو مجبور کیا کہ اگر باپ ظلم کرے تب بھی اس کی اطاعت تمہارے ذمہ فرض ہے۔اور دوسری طرف باپ کو حکم کیا کہ اپنی اولاد کے ساتھ شفقت ورحمت سے کام لے اور جو ایسا نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ اسی طرح خاوند بیوی کے معاملات میں بیوی کو مجبور کیا کہ خاوند اگر ظلم بھی کرے تب بھی تم

اس کی اطاعت نہ چھوڑو۔ ادہر خاوند کو سخت تاکید کی کہ بیوی کے حقوق کی پوری نگرانی کرے اور اگر اس میں کوتاہی کی تو قیامت میں اس کی جزاء کے لئے تیار ہو جائے۔ اور یہ ایک ایسا حکیمانہ اصول ہے کہ جس سے تمام باہمی نزاع کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ذراء غور سے کام لیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اختلاف اور جھگڑوں کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی حدود اور اپنے فرائض کو چھوڑ کر دوسرے کی حدود میں گھسنا چاہتا ہے۔

مثلاً معاملات میں عدل وانصاف کرنا امیر کا فرض منصبی ہے۔ مامور رعایا کو اس میں اس سے زیادہ مداخلت جائز نہیں کہ آداب امر بالمعروف کا لحاظ رکھتے ہوئے حق بات امیر تک پہنچادے۔ امیر اگر اپنے فرض کو ترک کرے تو کسی طرح عقل کا مقتضا نہیں کہ مأمور بھی اپنے حدود سے باہر نکل کھڑا ہو اور اپنے فرائض کو چھوڑ دے۔

کیونکہ یہ انتقامی جذبہ کسی طرح مأمور کے حق میں مفید نہیں اور نہ اسکے ذریعہ سے وہ اپنے حقوق امیر سے وصول کر سکتا ہے۔

فرض کرو کہ اگر اسلام اس وقت مظلوم کو ترک اطاعت کی اجازت دیدے اور اس کو بغاوت وسرکشی سے نہ روکے اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ اگر یہ مظلوم کوئی قوت وشوکت نہیں رکھتا تو بغاوت کر کے پہلے سے زیادہ مصائب ومظالم میں گرفتار ہو جائے گا اور اگر اس نے کوئی قوت وشوکت حاصل کر لی جس کے ذریعہ سے امیر کے مقابلہ پر آسکے تو یہ فتنۂ عظیم ہوگا جس میں سارے ملک کی جانیں اور مال خطرہ میں پڑ جائیں گے اور جانبین کی بہت سی جانیں اور مال ضائع ہوں گے۔

بغاوت سے پہلے اگر صرف ایک شخص کا نقصان تھا تو بغاوت کرنے میں سارے ملک کا اس سے سوگنا زائد نقصان ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر سارا ملک عام طور پر اس کے مظالم کا شکار ہو جائے اور قتل وغارت میں اسے کسی شرعی حکم کا لحاظ نہ رہے تو پھر اس کے خلاف

کرنے اوراس سے بدلہ لینے کواسلام نے بھی جائز رکھا ہے۔ کمامرّ

ان نتائج پرنظر کرتے ہوئے اسلام نے حکمت کے مشہور قانون پرعمل کیا کہ:۔

اذا بتلی المؤمن بِبَلِیّتین فلیختر اھونھما

جب آدمی دو بلاؤں میں گرفتار ہوتو دونوں میں سے جو سہل ہواس کو اختیار کر لینا چاہیئے۔

جب امیر وقت ظلم کرے تو ہمارے سامنے دو مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ مظلوم ظلم پرصبر کرے اور دوسرے یہ کہ علم بغاوت بلند کر کے خود بھی اس سے زیادہ مصیبت میں گرفتار ہو اور دوسروں کو بھی بلا میں مبتلا کرے۔ ظاہر ہے ان دونوں مصیبتوں کے مقابلہ کے وقت پہلی شکل کا اختیار کرنا ہی عقل سلیم کا مقتضی ہوگا۔ اور میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں مظلوم کوظلم پرصبر کرنیکی تلقین کا ذمہ دار فقط شخصیت یا اسلام نہیں۔ آج اگر موجودہ جمہوریتوں میں کسی شخص پرظلم ہواور کثرت رائے اس کے خلاف فیصلہ کردے تو بتلائے کہ یہ شخص کیا کرے گا۔ اوراس وقت سیاسی مدبرین اس کے لئے کیا فتویٰ دیں گے۔

کیا کسی عاقل کے نزدیک اس کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ جمہوریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے خود بھی پہلے سے زیادہ مصائب کا تختہ مشق بنے اور دوسرے لوگوں کو بھی مصیبت میں ڈالدے۔

بلکہ ہر عقلمند ایسی حالت میں اس کے لئے صبر کی تلقین کے سوا کوئی چارہ کار نہ سمجھے گا لیکن اس تلقین صبر کا کسی کے نزدیک مطلب نہ ہوگا کہ وہ جمہوریت کے ظلم کا حامی ہے یا امراء کے لئے ظلم کا میدان وسیع کررہا ہے۔

پس اگر اسلام نے ایسی حالت میں مظلوم کواطاعت امیر پر مجبور کیا تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ظلم کا دروازہ امراء کے لئے کھول دیا۔ خصوصاً جبکہ دوسری جانب امراء کو بھی اتنا کس دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے اور ادھر رعایا کے ہر فرد کو یہ حق دیا ہے کہ

امر بالمعروف کے ذریعہ سے کلمۂ حق اس کو پہنچادے اور اس کو اپنے فرائض یاد دلائے۔

الغرض اسلامی قانون سیاست کی آٹھویں اصولی دفعہ یہ ہے کہ اگر خلیفہ وقت ظلم بھی کرے تب بھی رعایا پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ البتہ امر بالمعروف کرنے کا حق ہر شخص کو ہر وقت حاصل ہے۔

۹)......انتخاب امیر کے وقت ضروری ہے کہ خلافت وامارت کی شرطوں پر نظر رکھی جائے جن میں سے عدالت بھی ایک شرط ہے۔ اس لئے کسی فاسق کو اپنے اختیار سے خلیفہ بنانا جائز نہیں۔ لیکن اگر کوئی فاسق زبردستی سلطنت پر قابو پالے یا پہلے بوقت انتخاب فاسق نہ تھا بعد میں فاسق ہو گیا۔ تو باوجود اس کے فسق کے اس وقت تک اس کے خلاف علم بلند نہ کیا جائے گا۔ جب تک کہ کفر صریح میں مبتلا نہ ہو جائے۔

(ازالۃ الخفاء حضرت شاہ ولی اللہ)

البتہ اگر کفر صریح میں مبتلا ہو جائے تو وہ خلافت سے معزول ہے اور مسلمانوں کو اس کا علیحدہ کرنا ضروری ہے۔

۱۰)......مسائل مجتہد فیہا جن میں جانبین میں ادلۂ شرعیہ موجود ہیں جیسے حنفی شافعی وغیرہ کے مختلف فیہ مسائل ان میں سے اگر امیر کسی ایک جانب کو متعین کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا اس کا اتباع کریں اگرچہ بحیثیت حنفیت یا شافعیت وہ اس کے مذہب کے خلاف ہو۔

۱۱)......ارکان مجلس شوریٰ کا انتخاب بھی اسلامی سیاست میں اس طوفان بے تمیزی کے ساتھ نہیں ہوتا جو موجودہ جمہوریت کا طغرائے امتیاز ہے اور جس کی بدولت تمام ملک جنگ وجدل بغض وعناد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے بلکہ یہ انتخاب عموماً امیر خود اپنی رائے سے کرتا ہے۔ یہ چند دفعات ہیں جو شخصیت کے ہم رنگ نظر آتی ہیں۔

مجھے اسلام کا سیاسی قانون پیش کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھلانا مقصود تھا کہ اسلامی

سیاست نہ در حقیقت وہ شخصیت وملوکیت ہے جو کسریٰ وقیصر اور ملوک عجم کا طریق تھا۔ اور نہ جمہوریت جس کا آجکل عالم میں دور دورہ ہے کیونکہ یہ دونوں طریق نظام عالم کی اصلاح کے لئے کافی نہیں بلکہ اسلام نے اپنے اساسی اصول اعتدال کو پیش نظر رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک صراط مستقیم اختیار کیا ہے جو نظام عالم اور معاملات خلق کی اصلاح کے لئے بہترین کفیل ہے۔ اور اس تمام بحث میں بھی اصل غرض صرف اس جزو سے متعلق تھی کہ مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرت رائے کے سپرد نہیں بلکہ امام کی رائے پر موقوف ہے۔ جس کو اجمالاً دفعہ (۶) میں عرض کیا گیا ہے۔ اس وقت ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے پر ہے یا امیر مجلس کی رائے پر

اصولی طور پر اس بحث میں بھی ہمیں سب سے پہلے قرآن عزیز کو حَکَم بنانا چاہیئے اور اسی کے فیصلہ کو محکم اور مختتم فیصلہ سمجھنا چاہیئے جس کی چند آیات اس وقت درج ذیل کی جاتی ہیں۔

مشورہ کے متعلق قرآن عزیز کی سب سے زیادہ مشہور آیت یہ ہے۔

وشاور هم فی الا مر فاذا عزمت فتو کل علی اللّٰہ

آپ (معاملات میں) صحابہ اور مسلمانوں سے مشورہ لیجئے اور جب پختہ ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ واصحابہ وسلم کو حکم فرمایا گیا ہے کہ اہم معاملات میں (جن میں صریح وحی نہ آئی ہو) صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد جب آپ کسی ایک جانب کا عزم فرمائیں تو اس میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں۔ اپنی رائے یا، مشورہ پر بھروسہ نہ کریں۔

جس سے صاف معلوم ہوا کہ مشورہ کے بعد کسی ایک جانب کو ترجیح دینا اور اس کا

عزم کرنا یہ فقط امیر مجلس کی رائے پر موقوف ہے۔ اور اگر مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے کے سپرد ہوتا تو مناسب تھا۔ عزم کے لئے بھی جمع کا صیغہ استعمال کر کے یوں فرمایا جاتا ''فاذا عزموا'' (یعنی جب صحابہ کسی جانب کا عزم کریں)۔

الغرض آیت میں بجائے صیغہ جمع کے مفرد کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کو بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کی صورت امیر مجلس کی رائے پر چھوڑی امیر اپنی دیانت اور فہم سے رائے کو زیادہ صائب سمجھے اس کو نافذ کر دے۔

مشورہ کے متعلق دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

وامرهم شوریٰ بينهم (شوریٰ ۲۵)

یعنی مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

جس میں صحابہ کرام ﷺ اور سچے مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کا اجمالی نقشہ دکھلاتے ہوئے ان کے اس طرز عمل کی مدح کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں خودرائی سے کام نہیں لیتے بلکہ مشورہ کر کے طے کرتے ہیں۔

اس میں اگرچہ مسئلہ زیر بحث یعنی درصورت اختلاف فیصلہ مشورہ کے متعلق صراحۃً کوئی حکم مذکور نہیں لیکن جن حضرات کے مشوروں کی اس آیت میں مدح فرمائی گئی ہے جب ہم ان کے تعامل پر نظر ڈالتے ہیں تو بلا شائبہ اختلاف بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مجلس شوریٰ پر کثرت رائے کی حکومت نہ تھی۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم اور صحابہ کرام ﷺ کے مشاورات جن کا ایک حصہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان میں سے کسی ایک میں آپ نہ دیکھیں گے کہ مشورہ کے بعد موجودہ طرز پر ووٹ لئے گئے ہوں اور آراء کو شمار کر کے ان کی کثرت پر فیصلہ کیا گیا ہو۔ آیات قرانیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور پھر تعامل صحابہ کا درجہ ہے۔ جو درحقیقت آیات قرانی ہی کی صحیح تفسیر اور واضح شرح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاورات اور فیصلہ کی صورت

غزوہ بدر مسلمانوں کی شاندار فتح پر ختم ہوا اور قریش کے بڑے بڑے ستر آدمی گرفتار ہو کر دربار نبوت میں حاضر کئے گئے تو یہ سوال پیش ہوا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت اس کے لئے مجلس شوریٰ طلب کی اور صحابہ کو جمع کر کے مسئلہ زیر بحث فرمایا۔ اتنی بات پر تمام روایات حدیث متفق ہیں کہ اس بارہ میں صحابہ کرام کی جانب سے مختلف رائیں پیش کی گئیں اور صدر الصدور سید الاولین والآخرین نے ایک جانب کو ترجیح دے کر حکم نافذ فرمایا۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اگر اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان کی صحیح تعداد اور ان کی رائیں معلوم ہو جائیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم نے اس اختلاف کو کس طرح رفع فرمایا۔ کثرت رائے کا اعتبار کیا یا قوت کا اور اکثریت کو ترجیح دی یا اقلیت کو تو ہماری بحث کا اسی پر خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ اس مشہور واقعہ کو بہت سے راوی روایت فرماتے ہیں۔ مگر صحیح طور اس کی کوئی خبر نہیں دیتا کہ اس جلسہ شوریٰ کے شرکاء کتنے حضرات تھے اور انہوں نے کیا کیا رائیں پیش فرمائیں۔ بلکہ عام طور پر صرف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اختلاف رائے ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ کتب حدیث وتفسیر اور سیر کی ورق گردانی کے بعد چند حضرات کے اسماء گرامی اور ان کی رائیں اور وہ تقریریں جو انہوں نے اس مجلس میں کیں ہیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ جس سے مسئلہ زیر بحث کا علی وجہ بصیرت فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

روایت حدیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجلس شوریٰ ایک معتد جماعت پر مشتمل تھی جن میں سے حضرات ذیل کے اسماء گرامی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ، حضرت

عبداللہ ابن رواحۃ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ۔

ان حضرات میں سے صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے تھی کہ ان سب کو چھوڑ دیا جائے۔ باقی حضرات میں سے کسی نے ان کی تائید نہیں کی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر فرمائی۔

''یا رسول اللہ یہ وہ لوگ نے جنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کو وطن سے نکالا۔ اور آپ کے ساتھ قتل وقتال کیا۔ میری رائے میں تو ان کو بلا کر سب کی گردن ماری جائے''۔

(ترمذی ابن ابی شیبہ امام احمد عن عبداللہ ابن مسعود داز درمنثور صفحہ ۲۰۱)

حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اس سے زیادہ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ میری رائے تو ہے کہ ان سب کو کسی ایسی وادی میں داخل کیا جائے جہاں سوختہ زیادہ ہو۔ اور پھر اس میں آگ لگا دی جائے ۔(روایت مذکورہ)

حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ سے کوئی خاص تقریر منقول نہیں مگر ابن جریر نے بروایت محمد ابن اسحاق اتنا نقل فرمایا ہے کہ ان کی رائے بھی یہی تھی، سب کو قتل کر دیا جائے (تفسیر روح المعانی ص ۲۲۱ ج ۲)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شرکت جلسہ کو تو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر[1] فرمایا ہے مگر اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا کہ ان کی رائے کس طرف تھی۔

بہر حال جن حضرات کے اسماء گرامی مذکور ہیں ان میں سے صرف ایک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے منقول ہے کہ ان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ باقی کسی کی تائید منقول

[1]:.....اخرجہ ابن ابی شیبہ واحمد ومسلم وابوداوٗد والترمذی وغیرہ ہم کذا فی الکنز ص ۲۶۵ ج ۵

نہیں۔البتہ حضرت عبداللہ ابن عمر کی ایک روایت میں اجمالاً اس قدر منقول ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی مختلف رائیں مجلس میں پیش ہوئیں تو بعض حضرات نے ان کی موافقت کی اور بعض نے ان کی مخالفت کی۔

(اخرجہ ابن المنذر وابوالشیخ وابن مردویہ کذافی الدرص ۲۰۲ ج ۳)

لیکن اس روایت میں نام کسی کا نہیں لیا گیا۔بہر حال جن حضرات کے ناموں کی صراحت ملتی ہے ان میں صرف ایک رائے چھوڑ دینے کی طرف ہے اور باقی ان سے بدلہ لینے اور قتل کرنے کی طرف۔

یہاں تک تو شوریٰ کی رائیوں کا تذکرہ تھا۔اب یہ دیکھنا ہے کہ اس مجلس کے امیر حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ کس طرح فرمایا۔اس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کی آراء مختلفہ سن کر گھر میں تشریف لئے گئے۔اور کسی کو کچھ جواب نہیں دیا۔ادہر صحابہ میں رائے زنی شروع ہوئی کوئی کہتا تھا کہ آپ حضرت صدیق کی رائے کو اختیار فرمائیں گے اور کسی کا خیال تھا حضرت فاروق کی رائے قبول کی جائے گی۔کچھ دیر کے بعد آپ باہر تشریف لائے اور ایک مختصر تقریر فرمائی (یہ تقریر حدیث عبداللہ ابن مسعود میں مفصل مذکور ہے) جس میں فریقین کی دلجوئی کے الفاظ تھے اور پھر آپ نے آخری فیصلہ حضرت صدیق کی رائے پر فرمایا۔

(رواہ احمد والترمذی وحسنہ الطبرانی والحاکم وصححہ کذافی روح المعانی ص:۲۶ ج ۲)

خود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اس واقعہ کی روایت کی تو فیصلہ کے متعلق یہ الفاظ ذکر فرمائے ہیں:۔

فھوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قال ابوبکر

ولم یھو ماقلت و اخذ منھم الفداء

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے قول کو پسند فرمایا۔اور میرے قول کو پسند نہ فرمایا اور قیدیوں سے فدیہ لیکر چھوڑ دیا ۔(رواہ ابن ابی شیبہ واحمد ومسلم وابوداؤد والترمذی وغیرہم عن ابن عباس عن عمر رضی اللہ عنہ)(کنز العمال ص۲۶۶ ج۵)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اور فاروق اعظم کو خطاب کر کے فرمایا۔

لوا جتمعتما ما عصیتکما (اخرجه ابن مردویه عن ابن عباس رضی اللہ عنہ (درمنثور ص ۲۰۲ ج ۳)

اگر تم دونوں ایک رائے پر جمع ہو جاتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے ان ارشادات نے ہمارے زیر بحث مسئلہ کا بچند وجوہ قطعی فیصلہ فرما دیا ہے:۔

(الف) شرکاء مجلس میں سے جن حضرات کی رائیں روایات میں مذکور ہیں ان میں اکثریت بلکہ ایک رائے کو سوا تمام رائیں اس طرف تھیں کہ ان قیدیوں سے انتقام لیا جائے اور قتل کر دیا جائے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اکثریت کی کچھ پروانہ کی بلکہ قوت رائے پر اعتماد کرتے ہوئے حضرت صدیق کی رائے کو ترجیح دیدی۔

(ب) اور اگر اس سے بھی قطع نظر کی جائے تو فیصلہ کے متعلق جو الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر کئے ہیں وہ خود ہمارے لئے ایک مستقل وکیل ہیں جن میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور فاروق

ﷺ کی رائے کو پسند نہیں فرمایا ان الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ درصورت اختلاف مشورہ کا فیصلہ امیر مجلس کی رائے پر ہے۔ اس کے نزدیک قوت رائے کے اعتبار سے جو پسندیدہ ہو اس کو نافذ کرے خواہ اکثریت اس کے موافق ہو یا مخالف۔

(ج) عام صحابہ کرامؓ نے جو فیصلہ کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے الفاظ بھی تقریباً حضرت فاروق ﷺ کے بیان کے ساتھ ملتے جلتے ہیں جن میں ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ کوئی کہتا تھا کہ آپ حضرت صدیق ﷺ کی رائے کو قبول فرمائیں گے اور کسی کا خیال تھا کہ اس بحث میں رائے فاروق کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ کسی نے نہ کہا کہ مجلس کے موجودہ ارکان کو شمار کر کے کثرت رائے سے صورت فیصلہ کی تعیین کر لیتا یہ صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی مجالس مشورہ پر کثرت رائے کی حکومت نہ تھی ورنہ صحابہ کو اس رائے زنی کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا کیونکہ صورت فیصلہ خود بخود متعین تھی۔

(د) حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت میں شیخین کے متعلق خود حضرت نبوت کے یہ الفاظ ابھی نقل کئے گئے ہیں کہ ''اگر تم دونوں کسی رائے پر متفق ہوتے تو میں تمہارا خلاف نہ کرتا۔'' اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اختلاف آرا کی صورت میں آپ کثرت رائے کے پابند نہ ہوتے تھے۔ ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ میں تم دونوں کا خلاف نہ کرتا۔

اس ایک واقعہ نے اتنی متعدد وجوہ سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی سیاست میں کثرت کے بجائے قوت رائے کا اعتبار ہے۔ اور امیر مجلس کثرت رائے کا پابند نہیں کیا جاتا۔

ایک شبہہ اور اس کا ازالہ

یہاں پر اگر یہ کہا جائے کہ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں اگر چہ رسول صلی اللہ

علیہ وسلم نے اکثریت کے مقابلہ میں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل فرمایا تھا۔لیکن خداوند عالم کے نزدیک یہ فعل مقبول نہ ہوا بلکہ اظہار ناراضی کے کلمات قرآن کریم میں نازل ہوئے جس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک اجتہادی لغزش تھی جس کا ہونا شان نبوت کے خلاف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ناراضی کا سبب نہ کثرت رائے کو چھوڑنا ہے۔اور نہ یہ کہ جس رائے کو اختیار کیا گیا ہے وہ فی نفسہ غلط تھی ،اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں بھی حکم وہ ہی باقی رہا جو اس واقعہ میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے رائے کے موافق جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حدیبیہ میں ستر قیدیوں کو چھوڑا ہے۔ نیز ثمامہ ابن اثال کو قید کرنے کے بعد رہا فرمایا ہے بلکہ یہ ناراضی دوسرے اسباب کی بناء پر تھی ،(جن کے بیان کا یہ موقع نہیں) یہی وجہ ہے کہ اظہار ناراضی کے الفاظ میں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ نے کثرت رائے چھوڑ کر اقلیت کو کیوں ترجیح دی۔ بلکہ دوسرے اسباب ذکر کئے گئے ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ زاد المعاد میں اس بحث کے متعلق لکھتے ہیں۔

وقد تکلم الناس فی ای الرأیین کان اصوب فرجحت طائفة قول عمر رضی اللہ عنہ لهذا الحدیث ورجحت طائفة قول ابی بکرؓ لا ستقرار الا مر علیه و موافقة الکتاب الذی سبق من اللّٰه با حلال ذلک لهم ولموافقه الرحمته اللتی علیت الغضب (زاد المعاد ص ۳۲۳ ج ۱)

(ترجمہ)لوگوں نے اس میں کلام کیا ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کونسی رائے درست اور صواب تھی۔سو بعض حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو صواب قرار دیا ہے۔ بوجہ اسی حدیث کے(جس میں خداوند عالم کی جانب سے اس فیصلہ پر اظہار ناراضی کا ذکر ہے) ،اور دوسرے حضرات نے صدیق کبر رضی اللہ عنہ کی رائے ہی کی صواب قرار دیا

ہے کیونکہ بالآخر شرعی حکم وہ ہی قرار پایا ہے جو حضرت صدیق ؓ کی
رائے تھی یعنی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دینا، نیز یہ رائے اس ازلی فیصلہ کے
مطابق تھی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مقدر تھا۔ نیز یہ رائے اس رحمت الٰہیہ
کے موافق بھی ہے جو غضب پر غالب ہے۔

الغرض یہ اظہار ناراضی بعض وقتی امور کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ ورنہ خداوند عالم نے بھی ہمیشہ کے لئے اسی حکم کو جاری رکھا ہے جو اس فیصلہ میں حضرت صدیق ؓ کی رائے پر کیا گیا تھا۔

ایک اور واقعہ

اسی غزوۂ بدر میں جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کی مختصر جمعیت کے ساتھ محاذ جنگ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان اپنے قافلہ کو لے کر نکل گیا ہے۔ مگر قریش کا بڑا لشکر جو اس قافلہ کی امداد کے لئے مکہ سے آیا ہے ابھی اس میدان کے کنارے پڑا ہے۔ تو آپ نے صحابہ کرام ؓ سے مشورہ کیا کہ اب جنگ کو شروع کیا جائے یا ملتوی کر دیا جائے اس مجلس شوریٰ کی روداد حضرت انس ؓ اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شاور حیث بلغه
اقفال ابی سفیان .فتکلم ابوبکر فاعرض عنه ثم تکلم
عمر فاعرض عنه فقال سعد ابن عبادة ایانا ترید یا
رسول اللّٰہ والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخیضها
البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی
برک للغماد لفعلنا (رواہ ابن ابی شیبۃ۔ وکذا فی الکنز صفحہ ۲۷۳ جلد ۵)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوسفیان کے نکل جانے کی اطلاع
ملی تو آپ نے صحابہ کرام ؓ سے مشورہ فرمایا۔ اول صدیق اکبر رضی اللہ
عنہ نے رائے پیش کی تو آپ نے ان سے رخ پھر لیا۔ پھر حضرت عمر

ﷺ نے اپنا خیال ظاہر کیا تو ان سے بھی اعراض کیا۔ پھر سعد ابن عبادہ ﷺ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ ہماری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر آپ یہ حکم فرمائیں کہ ہم اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں تو ہم فوراً کود پڑیں گے اور اگر یہ امر فرمائیں کہ مقام برک عماد تک گھوڑے دوڑائیں تو یقیناً ہم اطاعت کریں گے۔

اس مجلس مشورہ کے طرز عمل سے بھی قطعی طور پر معلوم ہوا کہ اسلامی شوریٰ موجودہ جمہوریت کی طرح کثرت رائے کا محکوم نہ تھا۔

تیسرا واقعہ

غزوہ اُحد میں جب کفار مکہ کا لشکر مدینۃ الرسولؐ کے قریب آ پہنچا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اس مشورہ میں بھی اختلاف رائے کی نوبت آئی۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ مسلمانوں کا لشکر شہر مدینہ سے باہر نہ نکلے بلکہ جب کفار شہر میں داخل ہونے لگیں تو گلی کوچوں میں متفرق طور پر مقاتلہ کیا جائے اور چھتوں کے اوپر سے عورتیں ان کی امداد کریں۔ خود حضرت اقدس صلی اللہ وآلہ وسلم کی بھی رائے تھی اور بعض صحابہ اس کے خلاف تھے وہ کہتے تھے کہ ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ مختلف رائیں سن کر گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے اور ان لوگوں کی رائے کے موافق تیاری شروع کی جو مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کو مشورہ دیتے تھے۔ لیکن جب ادہر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم پر اصرار کر کے آپ کو اپنی رائے کے خلاف پر مجبور کر دیا۔ یہ مناسب نہیں یہ سوچ کر ان سب کی رائے بدل گئی اور جب آپ باہر تشریف لائے تو متفقہ طور پر یہ عرض کی کہ مدینہ کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مـاینبغی لنبی اذالبس لأمته ان یضعها حتی یحکم الله

بینہ و بین عدوہ.

کسی نبی کے لئے مناسب نہیں جب وہ اپنی ذرہ پہن لے کہ اس کو پھر نکال دے جب تک کہ حق تعالیٰ اس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ فرمائے۔

الغرض آپ نے اسی رائے کو نافذ فرمایا۔ اور ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر باہر تشریف لے گئے۔ (کذافی زادالمعاد صفحہ ۴۳۸ جلد ا)

اس واقعہ میں بھی چند وجوہ سے ہمارے مسئلہ زیر بحث پر روشنی پڑتی ہے۔

۱)......اوّل اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ ابتداءً فرمایا تھا اس میں کثرت وقلت کی کوئی گفتگو درمیان میں نہیں آئی۔ بلکہ جس رائے کو آپ نے نافذ فرمایا تھا اس کی ترجیح کی وجہ روایات کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتی ہیں۔ کہ یہ جماعت فضلائے صحابہ پر مشتمل تھی اور ان کی قوت رائے باعث ترجیح ہوئی روایات کے الفاظ یہ ہیں۔

فبادر جماعة من فضلاء الصحابة ممن فاته الخروج يوم بدر و اشاروا عليه بالخروج والحوا عليه في ذلك.

(زادالمعاد ص ۳۴۸ ج ا)

ان فضلاء صحابہ کی ایک جماعت آگے بڑھی جن کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں مل سکا تھا تو انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ آپ باہر نکل کر جنگ کریں اور اس رائے پر اصرار کیا۔

۲)......دوسرے یہ کہ بعد میں جب ان حضرات کی رائے بدلی اور سب نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ شہر کے اندر ہی مقابلہ کیا جائے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے خلاف خروج ہی کے حکم کو نافذ فرمایا۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے حضرت نبوت کی مجلس شوریٰ کے طرز عمل کا صحیح اندازہ

ہوسکتا ہے اور بالجملہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشوروں میں اہل شوریٰ کی رائیں شمار کرنے اور پھر کثرت پر فیصلہ کرنے کی ایک نظیر بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

اس کے بعد ہم خلفاء راشدین کی مجلس شوریٰ اور اس کے طرز عمل کو چند واقعات کے ذریعہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

خلفائے راشدینؓ کی مجالس شوریٰ

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاورات اور ان کے طرز عمل اگرچہ قواعد اصول کے مطابق تمام امت کے لئے اسوہ ہیں۔ اور جب تک تخصیص کی کوئی صریح دلیل معلوم نہ ہو اس وقت تک اس طرز عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

لیکن تاہم کسی کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ آپ تو بوجہ عہدہ نبوت خود مشورہ کے بھی محتاج نہیں تھے۔ اور اسی وجہ سے تمام امت کے مقابلہ میں آپ کی تنہا رائے راجح ہوسکتی ہے۔ لیکن نبی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لئے یہ اختیار ثابت نہیں ہوسکتا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کے بعد ہم خلفاء راشدین کا طرز عمل اور ان کی مجالس شوریٰ کا اجمالی نقشہ بھی ناظرین کے لئے پیش کردیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ

فریضہ زکوٰۃ چھوڑنے والوں پر جہاد اور صحابہ کی رائیں

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مدینہ میں نفاق پھیل گیا اور عرب مرتد ہونے لگے ادھر عجم میں بھی یہی سمی ہوا اثر کرگئی اور مرتد ہوکر مقابلہ کی دھمکیاں دینے لگے۔ اور ان کے زبانوں پر یہ باتیں آگئیں

کہ یہ شخص جس کی وجہ سے مسلمان تمام اقوام پر بھاری تھے۔ اور جس کی وجہ سے ہر جنگ میں ان کی مدد ہوتی تھی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وفات پاگئے اور اب مسلمانوں کا مٹا دینا سہل ہوگیا ہے۔

خلیفہ وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھ کر مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور یہ تقریر فرمائی کہ:

> آپ کو معلوم ہے کہ عرب نے زکوٰۃ ادا کرنی چھوڑ دی اور وہ اپنے دین سے مرتد[1] ہوگئے۔ ادھر عجم نے تمہارے مقابلہ کے لئے نہاوند کو تیار کر رکھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان جس شخص کی وجہ سے ہمیشہ مظفر و منصور ہوتے تھے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آج انتقال کر گئے ہیں اس وقت موقع ہے کہ مسلمانوں کو دنیا سے مٹا دیا جائے آپ مجھے مشورہ دیں کہ اس حالت میں کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ میں بھی تمہیں میں سے ایک شخص ہوں۔ اور مجھ پر بہ نسبت تمہارے اس مصیبت کا بوجھ زیادہ ہے۔

اعیان صحابہ مہاجرین وانصار کا مجمع ہے لیکن یہ واقعہ سن کر سب پر ایک سکتہ طاری ہے اور کوئی کچھ نہیں بولتا یہاں تک کہ ایک طویل سکوت کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر شروع کی اور فرمایا:

> اے خلیفۂ رسول صلی اللہ وعلیہ وسلم بخدا میری رائے تو یہ ہے کہ آپ وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اس وقت عرب سے نماز ادا کرنے ہی کو غنیمت سمجھیں۔ اور فریضۂ زکوٰۃ کو چھوڑنے پر مواخذہ نہ کریں۔ اس لئے

(۱)...... ارتداد کی وجہ یہی زکوٰۃ کا انکار تھا کیونکہ فرض قطعی کا انکار کفر ہے۔ اور یہ لوگ بھی اس فرض کے منکر ہوگئے تھے۔ اس لئے مرتد قرار دیئے گئے۔ ورنہ فقط زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے کافر نہیں ہوتا بلکہ سخت گنہگار اور فاسق ہوتا ہے ۱۲ منہ

کہ یہ لوگ اسلام میں ابھی ابھی داخل ہوئے ہیں اب تک اسلام ان کے دلوں میں رچا نہیں۔ پھر یا تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کی طرف پھیر دے گا اور یہ تمام اسلامی فرائض و احکام کو تسلیم کر کے سچے مسلمان ہو جائیں گے۔ اور یا اللہ تعالیٰ اسلام کی قوت دے دیگا تو ہم ان کے مقابلہ پر قادر ہو جائیں گے اس وقت مقابلہ کیا جائے گا۔ اس وقت تو موجودہ مہاجرین و انصار میں تمام عرب و عجم کے مقابلہ کی سکت نہیں۔

حضرت فاروق کی رائے سننے کے بعد صدیق اکبرؓ حضرت عثمان کی طرف توجہ ہوئے۔ انہوں نے بھی حرف بحرف حضرت فاروق کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی اسی کی تائید کی۔ ان کے بعد تمام مہاجرین اسی رائے کی تائید میں یک زبان ہو گئے۔

یہ دیکھ کر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بھی متفقہ طور پر یہی رائے کی کہ اس وقت ان سے مقاتلہ قرین مصلحت نہیں۔ یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تقریر کے لئے منبر پر چڑھے۔

یہ افضل الناس بعد الانبیاء حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس شوریٰ کا ایک واقعہ ہے جس میں شوریٰ کے تمام ارکان بلا استثناء امیر کی رائے کے خلاف رائے پیش کرتے ہیں۔ اب سنئے کہ یہ مسلمانوں کا سب سے پہلا امیر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خلیفہ اس واقعہ میں کیا فیصلہ دیتا ہے۔ تا کہ ہمارے مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ صاف طور پر خلیفہ اول کے عمل سے ہو جائے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا یہ خطبہ چونکہ فصاحت و بلاغت اور شوکت و جلالت کا ایک خاص نمونہ ہے اس لئے عربی دان طبقہ کی دلچسپی کے لئے اس کے الفاظ بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

امابعد فان اللّٰہ بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم والحق قُلٌّ شرید و الاسلام غریب طوید قد رثّ حبلہ و قلّ اہلہ فجمعھم اللّٰہ علیہ عجمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم و جعلھم الامۃ الباقیۃ الوسطی واللّٰہ لا ابرح اقوم بامرللّٰہ واجاھد فی سبیل اللّٰہ حتی ینجز اللّٰہ تعالیٰ لنا ویفی لنا عھدہ فیقتل من قتل منا شھیدًا فی الجنۃ ویبقیٰ من بقی خلیفۃ اللّٰہ فی ارضہ ووارث عبادہ الحق فان اللّٰہ قال ولیس لقولہ خلف" وعداللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم" واللّٰہ لو منعو نی عقالاً کانوا یعطون رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ثم اقبل معھم الشجر و المدروالجن والانس لجاھد تھم حتی تلحق روحی باللّٰہ ان للّٰہ لم یفرق بین الصلوٰۃ و الزکوٰۃ ثم جمعھما رواہ الحظابی فی رواۃ مالک. رکذافی الکنز ص ۱۴۲ ج ۲

حمد ونعت کے بعد ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے وقت مبعوث فرمایا جب کہ دنیا میں حق نہایت قلیل اور گمنام تھا اور اسلام محض اجنبی اور غیر مقبول تھا۔ اسی کی رسی بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کے اہل کم رہ گئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں جمع فرمایا اور انھیں قیامت تک باقی رہنے والی معتدل امت بنادی۔ خدا کی قسم میں برابر امر الٰہی پر قائم رہوں گا اور خدا کے راستہ میں جہاد کرونگا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمادیں۔ اور ہم میں سے

جو قتل ہو وہ شہید ہو کر جنت میں جائے اور جو زندہ رہے وہ خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے بندوں کا وارث ہو کر رہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا، کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ خدا کی قسم اگر وہ لوگ جو زکوٰۃ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اس میں سے ایک رسی بھی رد کیں گے تو میں ان سے برابر جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میری روح خدا تعالیٰ سے جا ملے اگر چہ اس وقت ان کی امداد کے لئے دنیا کا ہر درخت اور پتھر اور جن وانس میرے مقابلہ کے لئے جمع ہو جائیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا بلکہ دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے۔

حضرت صدیق کے اس پر شوکت خطبہ نے مجمع کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ تقریر ختم ہوتے ہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے زور سے اللہ اکبر کہا! اور فرمایا کہ جس کے کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کا شرح صدر فرمایا ہے میرا بھی اس پر شرح صدر ہو گیا۔

لیکن اس وقت بھی صرف فارق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت منقول ہے اور کسی کی تائید میری نظر سے نہیں گزری۔ بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بدستور اس کی مخالفت پر قائم رہنا اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جہاد پر عزم مصمم کر کے مدینہ سے چل کھڑے ہوئے۔ اور مقام ذی القصہ تک پہنچ گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ تھام لی اور فرمایا کہ اے خلیفہ رسول اللہ آپ کدھر جاتے ہیں۔ آج میں بھی آپ سے وہی کہتا ہوں جو غزوہ اُحد میں آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا یعنی:

شِم سیفک ولا تفجعنا بنفسک فواللّٰہ لئن اُصِبنَابک لایکون للاسلام بعدک نظام ابداً رواہ الدار قطنی فی غرائب مالک (کنز صفحہ ۱۴۳ ج ۳)

اپنی تلوار کو میان میں کیجئے اور ہمیں اپنی ہستی سے محروم نہ کیجئے کیونکہ خدا کی قسم اگر آپ کے قتل کی مصیبت ہم پر پڑ گئی تو پھر آپ کے بعد اسلام کا کبھی نظام درست نہ ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس تقاضا و اصرار پر خلیفہ اول خود تو واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ مگر اصل عزم کو نہیں چھوڑا۔

بلکہ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر ان مرتدین کی طرف روانہ فرمادیا۔

اس واقعہ میں خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے فیصلہ نے ہمارے مسئلہ زیر بحث کا نہایت وضاحت سے فیصلہ کردیا ہے کہ اگر مشورہ میں اختلاف آراء کی نوبت آئے تو ان سب آراء مختلفہ کو سننے کے بعد امیر کی رائے جس جانب پر قائم ہوجائے بس وہی قابل انفاذ ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انتظامی خصوصیت اور اس میں انتہائی قابلیت فقط اہل اسلام میں نہیں۔ بلکہ تمام دنیا کے قدیم و جدید سیاسی طبقوں میں بلا خلاف تسلیم کی جاچکی ہے۔ اور اسی لئے ہمارے مسلمانوں میں بھی جن حضرات کے نزدیک یورپین تمدن و معاشرت ہی تمام خوبیوں کا معیار ہے اور روشن خیالی اسی کا نام ہے کہ اسلامی قباء کو کھینچ تان کر اس جسم نازیبا پر راست بنادیں اگرچہ اس کھینچا تانی سے خود قبا پھٹ جائے انہوں نے یورپ کی موجودہ جمہوریت کو بھی جب اسلام کے سر تھوپنے کی ٹھانی تو اس کا ذمہ دار حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ٹھہرایا ہے۔

اس لئے عہد فاروقی کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مجموعہ سے اس میں شبہ نہیں رہتا کہ خلافت فاروقی کے زمانہ میں بھی جب کہ سیاسی انتظامات کمال کو پہنچ چکے تھے خلیفہ وقت کثرت رائے کا محکوم نہ تھا، بلکہ صحیح معنی میں حاکم تھا اور ہر مختلف فیہ مسئلہ میں آراء مختلفہ سننے کے بعد جس جانب کی ترجیح پر اس کا شرح صدر ہوتا تھا۔ وہی تمام ممالک کے لئے نافذ ہوتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ امیر کے شرح صدر کا سبب کبھی کثرت رائے ہی ہو جائے اور کبھی دوسری وجوہ۔

امام ابو جعفر طبری بحوالہ صحیح بخاری و مسلم نقل فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ شام کی طرف چلے اور مقام سرغ [1] تک پہنچ گئے تو شام کے اسلامی حکام اور فوجی سردار آگئے بڑھ کر یہاں آ ملے۔ اور خبر دی کہ آجکل شام میں وباء (طاعون) پھیلی ہوئی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ خبر سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مہاجرین اولین کو جمع کرو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ جب سب جمع ہو گئے تو وباء کی خبر سنا کر ان سے مشورہ طلب کیا۔ ان کے آپس میں اختلاف ہوا۔ بعض نے عرض کیا کہ آپ ایک اسلامی کام کے لئے نکلے ہیں اس لئے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ اب اس کو چھوڑ کر واپس ہو جائیں۔ اور بعض نے کہا کہ آپ کی ساتھ خدا کی ایک عظیم مخلوق اور تمام صحابہ کرام کا جتھا ہے ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے کہ آپ ان سب کو وباء میں ڈالدیں خلیفہ وقت نے یہ اختلاف رائے سن کر نہ دونوں کے عدد شمار کئے اور نہ کثرت وقلت کو دیکھا بلکہ سب کو رخصت کر دیا۔ اور پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انصار کو جمع کرو۔ جب وہ جمع ہو گئے تو ان سے بھی یہی مشورہ طلب کیا۔ ان میں بعینہ یہی اختلاف رائے پیش آیا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے

(۱)...... مدینہ طیبہ سے تیرہ منزل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ گاؤں وادی تبوک میں واقع ہے۔ (الریاض النضرہ ص ۷۱ ج ۲) ۱۲ منہ

ان کو بھی رخصت کر دیا۔

اور پھر حضرت ابن عباس ﷺ سے فرمایا کہ اب ان سن رسیدہ قریشی مہاجرین کو جمع کرو جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے ان کو جمع کیا۔ ان سب نے یہ معاملہ سن کر یک زبان ہو کر کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ آپ واپس لوٹ جائیں اور اس تمام خلق اللہ کو وباء کی آگ میں نہ ڈالیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر لشکر میں اعلان فرما دیا کہ ہم علی الصباح یہاں سے مدینہ کو واپس ہو جائیں گے۔

صوبہ شام کے امیر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ تقدیر خداوندی سے بھاگتے ہیں۔ فاروق اعظم چونکہ ان کی بہت قدر کرتے اور ان کے خلاف کو پسند نہ کرتے تھے۔

اس لئے فرمایا کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور ایسا کہتا تو بعید نہ تھا (لیکن تم جیسے فہیم آدمی سے ایسا اعتراض بعید ہے) سن لو کہ بیشک ہم تقدیر خداوندی سے تقدیر خداوندی ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ خلق اللہ کو ہلاکت اور مضرت کی جگہوں سے بچانا بھی حکم خداوندی ہی ہے لہٰذا ہم ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں اس میں کیا مضائقہ ہے؟)

اور پھر فرمایا کہ اگر آپ کسی جنگل میں اپنے اونٹ چرانے کے لئے لے جائیں اور ایسی جگہ میں جا کر اتریں جس کے دو حصے ہوں ایک قحط زدہ اور خراب اور دوسرے میں سبزہ لہلہاتا ہو تو کیا یہ بات صحیح نہیں کہ اگر آپ خراب حصہ میں چرائیں گے وہ بھی تقدیر خداوندی سے چرائیں گے۔ اور اگر اچھے سبزہ زار میں چرائیں گے تو وہ بھی تقدیر الٰہی سے ہوگا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے اتفاقاً اس وقت پہنچ گئے اور واقعات سن کر فرمانے لگے کہ مجھے اس کا شرعی حکم معلوم ہے۔ کیونکہ میں

نے خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ:۔

اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا عليه اذا وقع بارض و انتم بها فلا تخرجو فرارًا منه

جب سنو کہ کسی شہر میں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر جس جگہ تم پہلے سے موجود ہو وہاں آجائے تو وہاں سے نہ نکلو

حضرت فاروق ﷺ نے یہ سن کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور حسب ارادہ واپس ہو گئے اس واقعہ نے صاف طور پر بتلا دیا کہ مشورہ کا فیصلہ اسلامی خلافت میں کثرت رائے کے حوالہ نہ تھا۔ بلکہ مشورہ کی غرض محض یہ ہوتی تھی کہ لوگوں کی رائیں سنکر مسئلہ کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں اور پھر جس چیز پر امیر کا شرح صدر ہو وہ عمل میں لایا جائے۔ اس واقعہ میں جب تک حضرت فاروق ﷺ کو شرح صدر حاصل نہیں ہوا مجلس شوریٰ کو بدلتے رہے۔ لشکر کی تنظیم اور مال غنیمت وغیرہ کی تقسیم کے بارہ میں بھی جب حضرت فاروق ﷺ نے مجلس مشورت طلب فرمائی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عثمان ﷺ اور ولید ابن ہشام ابن مغیر ﷺ وغیرہم کی مختلف رائیں مجلس میں پیش ہوئیں۔ اس وقت بھی حضرت فارق ﷺ نے کثرت وقلت کی طرف کوئی التفات نہیں فرمایا۔ بلکہ ولید ابن ہشام کی رائے کو زیادہ قوی اور مفید سمجھ کر اسی کو نافذ فرما دیا۔ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں اس مشورہ کے فیصلہ کے متعلق جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ اس کے لئے شاہد عدل ہیں۔ وہی ہذا۔

فاخذ بقوله. (اى بقول وليد)

آپ نے ولید کے قول کو قبول کر کے نافذ کیا۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۰۲

یہ چند واقعات ہیں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مجالسِ مشورت کے جن کے دیکھنے کے بعد ایک مسلمان کو اس میں تردد نہیں رہ سکتا کہ اسلامی مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے کا محکوم نہیں ہوتا۔

خیال تھا کہ اسلامی تاریخ سے اس سلسلہ کی پوری تکمیل کی جائے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے بعد جمہور خلفاء اسلام کی مجالس مشاورت کی روداد یں پیش کر کے مسئلہ زیر بحث کو مؤید و مشید کیا جائے۔ لیکن ایک طرف تو ہجوم افکار وحوادث اور ضیق وقت وقلت فراغت اس میں سنگ راہ ہو رہی تھی دوسری طرف یہ بھی خیال ہوا کہ ایک حق طلب مسلمان کی تشفی واطمینان کے لئے تو اس قدر بھی کافی ہے ۔اور معاند و مخالف کے لئے ہزار دفتر بھی مفید نہیں ۔اس لئے تاریخی سلسلہ کو یہیں ختم کر دینا مناسب معلوم ہوا۔آخر میں کثرت رائے کی حقیقت اور اس کے ایک گونہ فائدہ پر بھی متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

کثرت رائے کی حقیقت اور اس کا فائدہ

اگر مشورہ کی حقیقت اور اس کی اصلی غرض پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ زیرغور معاملہ کی تمام جوانب منافع اور مضار روشنی میں آجائیں اور پھر مشورہ لینے والا جس جانب کو اختیار کرے علی بصیرۃ اختیار کرے ۔کیونکہ بہت مرتبہ ایک کام کے منافع انسان کے سامنے ہوتے ہیں اور اس کی مضرتوں کا اس کو علم نہیں ہوتا یا ان سے ذہول ہوتا ہے مشورہ سے اس کے تمام مضر اور نافع پہلو واضح ہو کر ایک جانب کو علی بصیرۃ ترجیح دینے پر قدرت ہو جاتی ہے یہ ہے مشورہ کی اصلی غرض اور مقصد۔اس کا مقتضیٰ خود یہ ہے کہ مشورہ طلب کرنے والا بعد مشورہ کے بھی ایسا ہی آزاد ہے جیسا قبل از مشورہ تھا۔قلت و کثرت کا محکوم نہ ہو بلکہ مسئلہ کے تمام جوانب کو دیکھ کر جو اس کی رائے قائم ہو اسی کو توکلاً علی اللہ اختیار کرے۔

اور در حقیقت کسی رائے کے صائب اور مفید ہونے کو کثرت وقلت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعید نہیں کہ کثرت رائے اکثر غیر مفید بلکہ مضر جانب پر ہوا کرے۔

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سرسید احمد خاں صاحب سے اس مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب لطیفہ بیان کیا۔ کہ اس عالم میں باتفاق عقلائے دنیا اچھی چیزیں کم ہیں اور بری زیادہ۔ تمام طبقات عالم میں یہ کلیہ مشاہد ہے بالخصوص انسان میں تو بہت ہی واضح ہے۔ دنیا کی تمام مردم شماری کے ساتھ جب اہل علم وفضل اور کسی طبقہ کے اہل کمال اور صائب الرائی لوگوں کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ہزار میں ایک بھی بمشکل نکلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بے وقوف اور ناتجربہ کاروں کی بہت کثرت ہے اور عقلاء وتجربہ کاروں کا سخت قحط لہذا اکثرت رائے کا فیصلہ اکثر حماقت اور بیوقوفی کے فیصلہ کا مرادف ہوگا۔

اور حقیقت یہی ہے کہ ذرا سے غور کرنے پر یہ بات مشاہد ہو جاتی ہے۔ کسی رائے کے صواب اور قابل عمل کے لئے کثرتِ کا اس کی طرف ہونا ہرگز معیار نہیں ہوسکتا۔ اور نہ کثرت وقلت کو اس سے کچھ تعلق ہے۔ ایک ماہر اور تجربہ کار انسان کی انتہا رائے ایسے سیکڑوں انسانوں کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے جنہیں مہارت وتجربہ نہیں۔

الغرض رائے کی خطا وصواب معلوم کرنے کے لئے کثرت کی طرف جانا بالکل عقل سلیم کے خلاف ہے۔

البتہ کثرت رائے پر عمل کرنے میں ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ اس سے بظاہر نزاع قطع ہو جاتا ہے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا کہ امیر نے کسی فریق کی جانب داری کی۔ لیکن اس نزاع اور پھر قطع نزاع کی صورت وضرورت جبھی پیش آتی ہے جب کہ لوگوں کے قلوب آجکل کی بے معنی آزادی سے متاثر ہوں کہ انھیں اپنی رائے پر چھوڑ دینا اور خلق اللہ کے مفاد پر اپنی شخصی رائے کا ایثار کر دینا مصیبت گزرتا ہو ہر شخص اپنے آپ ہی کو متبوع ومطاع سمجھتا ہو۔

مگر جس مذہب کی تمام تعلیم کا خلاصہ ایثار واخلاص اور تواضع ومسکنت ہو اس کو کیا

ضرورت ہے کہ یہ صورت اختیار کرے جو لوگ اس تعلیم سے متاثر ہوں گے وہ تو اپنی رائے کے خلاف پر بھی بعد حکم امیر اسی طرح راضی ہوں گے جس طرح موافقت پر۔ اور جو لوگ اس سے متاثر نہیں انھیں سلطنت کی قوت متاثر کرے گی۔

خلاصہ یہ کہ کثرت رائے کو ترجیح دیدینا درحقیقت قرعہ کی مثال ہے کہ اس سے نزاع ایک حد تک قطع ہو جاتا ہے لیکن وضوح حق کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ پس الحمدللہ ثابت ہو گیا کہ نظام عالم کی درستی کے لئے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ہرگز ہرگز مفید نہیں ہے۔

آزادی اور غلامی کا بے معنی راگ

حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ کے روشن خیال حضرات اطاعت امیر کو غلامی کہتے اور اس کے مقابلہ میں موجودہ جمہوریت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جمہوریت آزادی خیال اور حریت کی حامی ہے لیکن اگر ذرا عقل سے کام لیں تو اس بارہ میں دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا کیونکہ اطاعت امیر اگر آزادی کے خلاف اور ایک گونہ غلامی ہے تو پارلیمنٹ یا ممبران کونسل کی اطاعت میں کونسی فضیلت ہے کہ اس کو غلامی نہ کہا جائے صرف اتنا فرق ہے کہ خلافت اسلامیہ میں تمام (رعایا ان کے قول پر) ایک شخص کی غلام بنتی ہے تو یہاں جمہوریت میں دس آدمیوں کا غلام بننا پڑتا ہے کیونکہ جس طرح اسلامی خلافت میں امیر کے خلاف کسی شخص کو کوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں اسی طرح جمہوریت میں بھی ممبران مجلس میں سے اکثر نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ ہی سارے ملک کو ماننا پڑتا ہے اگرچہ سب کی رائے کے خلاف ہو۔ اس وقت ان آزاد خیال اخرار سے کوئی پوچھے کہ یہ کون سی آزادی ہے جس کی خاطر اصول اسلامیہ کو چھوڑا جاتا ہے۔ آزادی اور حریت تو جب تھی کہ آپ اپنی اپنی رائے کے پابند ہوتے۔ اور جو چاہتے کرتے۔

الغرض اگر آزادی کے یہ معنی ہیں کہ انسان جو چاہے کرے اور اپنی رائے کو کسی وقت نہ چھوڑے تو جب تک آدمی سیاست و نظام کا پابند ہو اس کو آزاد کہنا بالکل بے معنی ہے

نہ شخصیت کے ماتحت رہ کر ایسا آزاد ہو سکتا ہے اور نہ جمہوریت کے ماتحت۔ اور اگر آزادی اور آزاد خیالی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی رائے پیش کرنے میں آزاد ہے تو آزادی دونوں صورتوں میں کہیں نہیں جاتی اور جس طرح جمہوریت میں اس کی رائے سنی جا سکتی ہے۔ اس طرح بلکہ ان سے زیادہ ٹھنڈے دل سے اسلامی خلافت کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بلکہ اگر حالات کی تفصیل پر نظر ڈالی جائے تو موجودہ جمہوریت میں آزادی رائے کا نام نہیں سارے ملک میں سے صرف چند ممبروں ہی کو اہل الرای قرار دیا گیا ہے اور بس یہی وجہ ہے کہ اگر رعایا کے افراد میں سے کوئی شخص نہایت تجربہ کار اور ماہر سیاست عالم فاضل اپنی رائے پیش کرنا چاہے تو اگر یہ باضابطہ ممبر نہ ہو تو اس کی رائے کو رائے ہی نہیں سمجھا جاتا اور نہ قصر جمہوریت تک اس غریب کی آواز پہنچ سکتی ہے۔ بلکہ اگر قانون انتخاب، ممبران کو دیکھا جائے تو اکثر ایسے شخص کو ممبری میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہاں تو ممبری کا مدار کثرت مال اور حیثیت اور جائداد وغیرہ پر ہے۔ گویا اہل الرای اور عاقل کی تعریف جمہوریت کے قانون میں یہ ہے کہ زیادہ پیسہ والا ہو۔ یا للعجب کثرت مال کو اہل الرائے اور صائب الفکر ہونے سے کیا تعلق۔ بلکہ اقوام عالم کا اکثری تجربہ بالکل اس کے خلاف ثابت کرتا ہے کہ مالداری کی ہوس اور ثروت کا نشہ انسان کے قوی دماغیہ پر عموماً اس طرح چھا جاتا ہے کہ اسے دوسروں کی راحت و آرام کی مطلق پروا نہیں رہتی۔

الغرض جمہوریت کے قانون میں رائے پیش کرنے کا بھی صرف وہی شخص مجاز ہے جس کی گرہ میں ٹکے زیادہ ہوں چاہے دماغ و عقل سے خالی ہو اور پھر رائے پیش کرنے کے بعد وہ بھی آزاد نہیں بلکہ کثرت کے فیصلہ کا پابند ہے چاہے اس کے موافق ہو یا مخالف۔

بخلاف اسلامی خلافت کے کہ وہاں آزادی رائے میں مساوات کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ اور جو شخص اپنی رائے کسی معاملہ میں پیش کرنا چاہے اس کو ٹھنڈے دل سے سنکر اس پر بھی اسی طرح غور کیا جاتا ہے جس طرح ممبران شوریٰ کی رائے پر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

مدار کار ممبران شوریٰ کی رائیں ہوتی ہیں۔ اور ان سے مشورہ طلب کرنا ضروری ہوتا ہے، دوسروں سے طلب کرنا ضروری نہیں لیکن اگر وہ خود پیش کرنا چاہیں تو کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو حقیقی آزادی رائے اسلامی خلافت میں ہے نہ موجودہ جمہوریت میں پائی جاتی ہے اور نہ ملوک عجم کی شخصیت میں اور اسی سے ہمارا اصلی دعویٰ بھی بحمد اللہ ثابت ہو گیا کہ۔

خلافت اسلامیہ نہ موجودہ جمہوریت کا نام ہے نہ شخصیت کا

بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور محکم قانون کا نام ہے جو نظام عالم کی اصلاح کے لئے بہترین کفیل ہے۔ جس میں ایک حد تک تمام رعایا کو حقوق مساوات دیئے گئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی فرقِ مراتب کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا گیا بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے انسان کے لئے کچھ حدود مقرر کی تھی اپنی حدود میں ہر شخص مکمل آزاد ہے۔ البتہ اس حد سے آگے آزادی دنیا چونکہ دوسروں کے حقوق ضائع کرنے کا مرادف اور نظام عالم کے خلاف ہے اس لئے بالکل شتر بے مہار بھی نہیں کر دیا گیا۔ ایک طرف تو تمام رعایا پر اطاعت امیر فرض کی دوسری طرف رعایا کے ہر چھوٹے بڑے کو اس کا بھی حق دیا کہ اگر امیر کو کوئی کام خلاف شروع کرتا ہوا دیکھے تو (آداب امر بالمعروف کا لحاظ رکھتے ہوئے) صاف صاف اس کو غلطی پر متنبہ کر دے۔

اگر ایک طرف تمام اموال مسلمین اور بیت المال پر تنہا امیر کے تصرف کو نافذ فرمایا تو دوسری طرف یہ بھی قاعدہ رکھا گیا کہ امیر بھی بیت المال کے لئے مثل ایک ملازم کے ہے اور صرف اس قدر اپنے لئے لے سکتا ہے کہ توسط کے ساتھ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ چلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاء راشدین اور مابعد کے خلفاء کے مجموعی مصارف ایک متوسط الحال فرد رعایا سے نہیں بڑھتے حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت اور

ملوکیت میں فرق کا معیار ہی یہ رکھا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ ''میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ'' انہوں نے جواب دیا کہ اگر آپ بیت المال کا کوئی درہم بے جگہ صرف کرتے ہیں تو خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ ہیں اور اگر اس کے ایک ایک پیسہ کو ٹھکانے لگاتے ہیں تو خلیفہ ہیں (تاریخ الخلفاء للسیوطی)

یہ ہے حقیقی جمہوریت کی روح جس کو اسلام نے اور صرف اسلام نے ہی مضبوط پکڑا ہے۔ دنیا کی جمہوریتیں جس مساوات کے دعویٰ کرتی ہیں اسلام نے اس کو عمل سے دکھلایا ہے۔ آج یورپ کو اپنی جمہوریت اور اس کی ماتحت رعایا کی آمد وخرچ میں کیا نسبت ہے کچھ عرصہ گزرتا ہے کہ میں نے اخبارات میں دول یورپ اور اس کے امراء دولت کے مصارف کی فہرست پڑھی تھی جس کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ جس کی رعایا میں ہزاروں انسان بھوک اور فاقہ سے ہلاک ہورہے ہوں اور بری سے بری غذا سے بھی پیٹ نہ بھر سکتے ہوں اس کا حکمران بادشاہ اس طرح سونے میں کھیلتا ہے اور اور پھر مساوات کا دعویٰ اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔

اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۹ محرام الحرام ۱۳۴۶ء میں بعض یورپین تاجداروں کے مصارف کی فہرست چھپی تھی جس کا اجمالی نقشہ درج ذیل ہے۔

شاہ سیام	۳۵ لاکھ روپیہ سالانہ	شاہ جاپان	$\frac{1}{2}$ ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ
شاہ سیام	۳۵ لاکھ روپیہ سالانہ۔	شاہ جاپان	۲۲/۲۲۱ لاکھ روپیہ سالانہ
شاہ اٹلی	۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ۔	شاہ ہسپانیہ	۱۸ لاکھ روپیہ سالانہ
شاہ برطانیہ	۲۹ لاکھ روپیہ سالانہ۔	شاہ بیولڈن	۵ لاکھ روپیہ سالانہ
شاہ رومانیہ	۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ۔	شاہ ڈنمارک	۳ لاکھ روپیہ سالانہ
		شاہ ناروے	۴/۱ ۲ لاکھ روپیہ سالانہ

اور بعض حالیہ رپوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ انگلستان کے ماہواری مصارف ستر لاکھ پچاس ہزار روپیہ حسب تفصیل ذیل ہیں۔

جیب خرچ	ایک لاکھ دس ہزار پونڈ ماہوار۔
محلات شاہی کی آرائش کے لئے	۲۰ ہزار پانڈ ماہوار
ملازموں کی تنخواہ	ایک لاکھ ۲۵ ہزار آٹھ سو ماہوار۔
انعامات وغیرہ کے لئے	۱۳ ہزار دو سو ماہوار۔
گھر کا خرچ	ایک لاکھ ۹۳ ہزار پونڈ ماہوار۔
متفرق اخراجات	آٹھ سو پونڈ ماہوار۔
میزان کل مصارف	۴۷۰۰۰۰ پونڈ ماہوار۔
بحساب روپیہ	۷۰۵۰۰۰۰ روپیہ

یورپ اور دنیا کے موجودہ حکمران طبقہ کے ان شاہانہ مصارف کو سامنے رکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کیا دعویٰ کو حقیقت سے کوئی نسبت ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ موجودہ جمہوریتیں دھوکہ کی ٹٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ حقیقی جمہوریت اور صحیح عدل و مساوات صرف تعلیمات اسلام ہی کا حصہ ہے۔ جس میں کوئی اس کو مدمقابل نہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

❁❁❁❁❁

استخارہ کی حقیقت

ازافاضات فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

استخارہ کے معنی لغت میں طلبِ خیر کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں اس دعا کو کہتے ہیں جو کسی معاملہ کے مفید یا مضر ہونے میں تردد پیدا ہو جانے کی صورت میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کی جاتی ہے تا کہ تردد زائل ہو کر ایسی جانب متعین ہو جائے جس میں فائدہ ہو، اور نماز استخارہ وہ نفل نماز ہے جو اس دعا سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔

استخارہ درحقیقت مشورہ ہی کی ایک خاص نوع ہے۔ کیونکہ جس طرح مشورہ اپنے ابنائے جنس اور اقران و امثال سے اس لئے کیا جاتا ہے کہ تردد زائل ہو کر ایک جانب متعین ہو جائے اسی طرح استخارہ گویا جناب علیم و خبیر سے مشورہ ہے تا کہ معاملہ کی جانب حق تعالیٰ کے علم میں بہتر ہو اور خیر ہو وہ ہی متعین ہو جائے۔

کیونکہ انسان کتنا ہی عاقل و زیرک اور تجربہ کار ہو۔ بہت مرتبہ رائے میں غلطی کرتا ہے اور مفید کو مضر یا مضر کو مفید۔ دوا کو مرض اور مرض کو دوا سمجھ بیٹھتا ہے۔ اسی مضمون کو قرآن عزیز میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

عسی ان تکر ھوا شیئا وھو خیر لکم و عسیٰ ان تحبو ا شیئاً وھو شر لکم۔

عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور یہ بھی عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو اچھا جانو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہے۔

اسلامی تعلیمات کے وہ گرانمایہ اصول جو انسان کی دنیا و آخرت اور معاش و معاد کی درستی کے کفیل ہیں استخارہ بھی انھیں میں سے ایک زرین اصول ہے مضمون سابق میں آپ حدیث نبوی کا یہ جملہ پڑھ چکے ہیں۔

ما خاب من استخار ولا ندم من استشار ولا عال من اقتصد (رواہ الطبرانی عن انس کنز ۱۷۴/۴)

جو استخارہ کرتا ہے وہ ناکامیاب نہیں ہوتا اور جو مشورہ کرتا ہے وہ نادم نہیں ہوتا اور جو مصارف میں متوسط چال چلتا ہے محتاج و فقیر نہیں ہوتا۔

اس ایک مختصر حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اہم اور نہایت مفید چیزوں کی تعلیم فرمائی ہے۔

۱)......اہم کاموں میں مشورہ لینا۔

۲)......استخارہ کرنا۔

۳)......بخل و اسراف کے درمیان متوسط چال رکھنا۔

اور دوسری حدیث میں ہے۔

من سعادة ابن اٰدم استخارته اللّٰه ومن سعادة المرء رضاه بما قضى اللّٰه ومن شقاوة ابن اٰدم ترک استخارة اللّٰه ومن شقاوة ابن اٰدم سخطه بما قضى اللّٰه له.

(رواہ الترمذی و الحاکم عن سعید کنز ص ۱۷۴ ج ۴)

اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنا آدمی کی نیک بختی کی علامت ہے نیز اللہ کے حکم پر راضی رہنا بھی اس کے لئے سعادت ہے اور ترک استخارہ بدنیتی کی علامت ہے۔ اور اللہ کے حکم سے ناراض ہونا بھی شقاوت ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دعاء استخارہ کی اس طرح تعلیم فرماتے تھے جس طرح سورت قرآن کی تعلیم فرمایا کرتے تھے اور تمام کاروبار میں استخارہ کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ (احیاء العلوم مصری ص ۱۸۵ ج ۱)

بعض حکماء کا مقولہ ہے کہ جس کو منجانب اللہ چار چیزیں عطا ہو جائیں وہ چار چیزوں سے محروم نہ رہے گا یعنی جس کو حق تعالیٰ شکر کی توفیق عطا فرمائیں وہ زیادتی نعمت سے محروم نہ رہے گا۔ اور جس کو توبہ کی توفیق دی جائے وہ قبولیت سے محروم نہ ہوگا اور جس کو استخارہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے وہ صحیح رائے اور مفید نتیجہ سے محروم نہ کیا جائے گا۔ اور جس کو مشورہ کرنے کی عادت ہو وہ صحیح رائے کے سمجھنے میں دھوکہ نہ کھائے گا۔

استخارہ کس کام میں کیا جائے

استخارہ کی غرض چونکہ رفع تردد ہے اس لئے ایسے ہی کاموں میں استخارہ کیا جائے جن میں تردد ہو سکتا ہے۔ یعنی جن میں اچھے ہوئے اور برے ہوئے اور مضر یا مفید دونوں کا احتمال ہو سکے اس لئے عباداتِ واجبہ میں استخارہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا خیر اور بہتر ہونا متعین ہے ان کے برے یا مضر ہونے کا مطلقاً احتمال نہیں اسی مضمون کو مشہور اس ضرب المثل میں بیان کیا گیا ہے در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔

البتہ حج کے لئے اس بات میں استخارہ ہو سکتا ہے کہ کونسا برس اس کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور یہ کہ رفیق سفر اور راستہ کونسا اختیار کیا جائے۔

طریقِ استخارہ

استخارہ کے لئے لوگوں میں بہت سے طریقے تعویذ گنڈے والے عاملین مجوزہ مشہور ہیں جن میں سے اکثر اگر چہ قرآن و حدیث ہی کی دعاؤں سے مرکب ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس طریقے سے بہتر کوئی طریق نہیں ہو سکتا جو خود حضرت رسالتمآب صلی اللہ

علیہ وسلم کا تجویز کردہ ہے۔

اس لئے ہم صرف اسی کے نقل کردینے پر اکتفا کرتے ہیں حضرت جابر ﷜ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی مہتم بالشان کام کا اردہ کرے تو اس کو چاہئے کہ اول دو رکعت نماز بہ نیت نفل پڑھے۔ عام روایت حدیث میں اسی قدر مذکور ہے (کمارواہ البخاری) اور احیاء العلوم وغیرہ کی بعض احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکفرون پڑھے اور دوسری میں قل ھواللہ احد اور بہتر یہ ہے کہ دعاء کے اول وآخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھے۔ نماز کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَ اسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الامر.

اس جگہ اپنے مقصد کو ذکر کرے یا دل میں خیال کرے۔

خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدِرْهُ لِیْ وَیَسِّرْہُ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ .اَللّٰھُمَّ وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُهٗ شَرًّا لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ اَوْمَعَاشِیْ اَوْعَاقِبَهِ اَمْرِیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْه وَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَ اقْدِرْلِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ رَضِّنِیْ بِهٖ .

(راوہ احمد و البخاری عن جابر کذافی الکنز ص ۱۷۴ ج ۴)

ترجمہ۔ اے اللہ میں تیرے علم سے استخارہ کرتا ہوں (یعنی اپنے کام میں جانب خیر متعین کرنا چاہتا ہوں) اور تیری قدرت کاملہ سے قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں اور تیرے عظیم الشان فضل کی بنا پر تجھ سے

درخواست گزار ہوں اس لئے کہ تو قدرت رکھتا ہے اور مجھے کچھ قدرت نہیں اور تجھے علم ہے مجھے کچھ علم نہیں تو ہی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے۔ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام (اس جگہ اپنے مقصد کو ذکر کرے) میرے لئے بہتر ہے میرے دین میں اور معاش میں اور آخرت و عاقبت میں تو اس کام کو میرے لئے مقدر فرمادے اور مجھ پر آسان کردے اور پھر میرے اس کام میں برکت عطا فرما۔ یا اللہ اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لئے دین یا دنیا یا انجام کار میں اچھا نہیں مجھے اس کی طرف سے پھیر دے اور اس کو مجھ سے پھیر دے اور میرے لئے خیر اور بھلائی کو مقدر فرمادے جہاں کہیں ہو اور پھر مجھے اس چیز پر راضی کردے جس میں میری بھلائی اور بہتری ہے۔

اسی طرح سات مرتبہ استخارہ کرنے کے بعد سب سے اول جس جانب قلب کا میلان دیکھے اس پر بلا تأمل عمل کرے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں خیر ہوگی جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا هممت بامر فا ستخر ربک فیه سبع مرّات ثم انظر الی الذی یسبق الی قلبک فان الخیر فیه .رواه ابن السنی فی عمل الیوم واللیلة

جب کسی کام کا اردہ کرو تو سات مرتبہ اپنے پروردگار سے اس کے بارہ میں استخارہ کرو پھر دیکھو کہ سب سے پہلے قلب میں کیا خیال آتا ہے جو خیال آتا ہے جو خیال آئے اسی میں خیریت ہے۔

دوسرا مختصر طریقہ

اگر کام میں عجلت ہے اور اتنی مہلت باقی نہیں رہی کہ استخارہ مذکورہ کرسکے تو کام شروع کرنے سے پہلے گیارہ مرتبہ دعاء ذیل پڑھے:

اَللّٰهُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْلِیْ

یا اللہ میرے لئے خیر کر اور جو صورت بہتر ہو اس کو ظاہر فرما۔ (کنز العمال)

اور پھر جس طرف قلب کا میلان دیکھے عمل کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہی بہتر ہوگا۔

حق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس اسلامی تعلیم پر عمل کرے تو کبھی اور کسی حال میں پریشان نہ ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ آج ہم اپنے کاروبار میں ہر بچہ اور بڑے سے مشورے کرتے ہیں اور ظاہری تدبیروں اور ان کی فکروں میں ہزاروں پریشانیاں اٹھاتے ہیں۔ مگر چند منٹ اس سنت حسنہ کے لئے صرف نہیں کئے جاتے اور اسی لئے اکثر تدبیریں انہی پریشانیوں میں اضافہ کا سبب ہو جاتی ہیں۔

استخارہ کی بحث میں اسی قدر بیان پر اکتفا کرتے ہوئے حق تعالیٰ سے دعاء ہے کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دے اور ان تعلیمات اسلام کا نمونہ عمل بنا کر غیروں کے لئے شمع ہدایت بنائے۔

وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز و علیه التکلان وهو المستعان.

تمت بالخیر

۹۴

آداب الاخبار

تاریخ تالیف ______

مقامِ تالیف ______ غالباً دیوبند

موجودہ اخبارات کی خرابیوں پر حکیم الامۃ حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک مقالہ ''اخبار بینی'' کے نام سے تحریر فرمایا تھا جس میں اخبار بینی کے بےلذت گناہوں کی نشاندہی کی گئی تھی پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے شرعی اصول وضوابط جمع فرمائے جن کی پابندی کر کے اخبارات سے یہ خرابیاں دور ہوسکتی ہیں۔ان اصول وضوابط کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عبارات میں ضبط کر کے یہ مضمون مرتب فرمایا جس پر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے نظر ثانی بھی فرمائی۔

اخبارات وجرائد کی مذہبی ضرورت
اسلامی اخباروں کیلئے شرعی دستورالعمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفٰی و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی۔

مسلمان بھی کسی وقت ایک زندہ قوم تھی، دین و دنیا کی ساری ترقیات اس کے لئے وقف تھیں، اُس کا جو قدم اٹھتا تو ایک صحیح مقصد کی طرف جو حرکت ہوتی تو صراط مستقیم پر۔ غرض ہر حرکت وسکون میں ''زمن آں در وجود آید کہ باید'' کا نقشہ سامنے آجاتا تھا، اگر کبھی بظاہر کسی لغو یا عبث کام میں بھی مبتلا ہوتے، تو وہاں بھی کوئی ایسا اسلامی امتیازی نشان چھوڑ آتے تھے کہ وہ سب خرابیاں کافور ہو جاتیں، اور یہ نیکیوں سے مالا مال ہو کر آتے اور ان الحسنات یذھبن السیاٰت کا پروانہ براءت لے کر ہٹتے تھے، غرض نقصان کی جگہ میں بھی ان کے لئے نفع کے راستے کھلے ہوئے تھے۔

لیکن آہ کہ آج ہماری شامت اعمال سے عالم اسلام کا جغرافیہ ایسا بدلا ہے کہ شناخت مشکل ہوگئی، مسلمانوں کی دینی اور دنیوی زندگی کا نقشہ جو ہمارے سامنے ہے،

وہ اپنے ماضی کی صریح نقیض ہے:۔

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

نقصان کے کاموں سے نقصان پہونچنا اور برے اعمال سے برے نتائج پیدا ہونا، تو ایک طبعی اور فطری قانون ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج کم بخت مسلمان اگر کبھی بھولے سے کوئی نفع کا کام بھی کرتے ہیں، تو اس میں بھی اپنے (حسن سلیقہ) سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے، کبھی ایک نیکی کی توفیق ہو جاتی ہے، تو جب تک اس میں دس گناہ نہیں ملائے جاتے چین نہیں آتا۔ آج کوئی نیک سے نیک اور ضروری سے ضروری کام ایسا نہیں، جس کو ہماری بے پروائیوں نے بجائے ثواب کے ہمارے لئے صورت عذاب نہ بنادی ہو، آج اخبارات و جرائد اور اکثر مذہبی ادارے بھی اس غفلت شعاری کے بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

اخبارات و رسائل

اگر دنیاوی اصول پر نظر کی جائے، تو اخبارات و جرائد نہایت مفید اور کارآمد ذرائع اشاعت ہیں، بلکہ آج کل قومی اور اجتماعی زندگی کا جزو بن گئے ہیں، سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی اس کے لئے اسوۂ حسنہ موجود ہے، جگر پارہ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ بحوالہ ہند بن ابی ہالہ ایک طویل حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات وشمائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال فسالته عن مخرجه كيف كان يصنع فيه قال
كان رسول الله صلى الله عليه و سلم يحزن لسانه الا
فيما يعنيه و يولفهم و لا ينفرهم و يكرم كريم كل قوم و

یـولیـه عـلیهم و یحذر الناس و یحرس منهم من غیر ان یطوی علی احد منهم بشره و لا خلقه و یتفقد اصحابه و یسال الناس عما فی الناس و یحسن الحسن و یقویه و یقبح القبح و یوهیه الحدیث (شمائل ترمذی)

راوی کہتے ہیں کہ پھر میں نے سوال کیا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکان سے باہر تشریف لاتے تھے، تو کیا طرز عمل ہوتا تھا، حضرت ہند ابن ابی ہالہ نے فرمایا کہ حضور کی یہ عادت تھی کہ مفید اور ضروری کلام کے سوا ہر کلام سے اپنی زبان روکتے تھے، اور آپ صحابہ کے ساتھ الفت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے، ان کو متنفر ہونے کا موقعہ نہ دیتے تھے، ہر قوم کے بڑے آدمی کی تعظیم فرماتے تھے، اور اپنی طرف سے بھی اس کو قوم کا متولی اور امیر بنا دیتے تھے، لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے، اور لوگوں کے میل جول سے بچتے تھے، مگر اپنا حسن خلق اور خندہ پیشانی کسی سے نہ روکتے تھے، اور اپنے صحابہ کی خبر گیری فرماتے تھے، اور لوگوں سے ان واقعات کو دریافت کرتے تھے، جو لوگوں میں پیش آتے تھے، اور ان میں سے اچھی باتوں کی بھلائی اور بری کی برائی اور ضعف بیان کرتے تھے۔

اور حضرت انسؓ ایک روایت میں فرماتے ہیں:

کـان اذا فـقـد الـرجل من اخوانه ثلاثة ایام سأل عنه فـان کـان غـائبـا دعا له و ان کان شاهدا زاره و ان کان مریضا عاده. رواه ابویعلی فی مسنده.

(کنز العمال، ص: ۳۰، ج: ۴)

حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے کسی بھائی (صحابی) کو دیکھتے کہ تین روز سے ملے نہیں، تو لوگوں سے پوچھتے تھے، کہ وہ کہاں ہیں، پھر اگر

وہ سفر میں گئے ہوتے، تو ان کے لئے دعا فرماتے، اور اگر حاضر ہوتے تو ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے، اور مریض ہوتے تو مزاج پرسی کرتے تھے۔

(یہ دونوں حدیثیں اسوۂ نبوت میں خبروں کی تفتیش اور صحابہ کے واقعات اور حالات پر اطلاع کے) پورے اہتمام کا اعلان کر رہی ہیں، آج کل امت مسلمہ کے حالات پر اطلاع کا ذریعہ اخبار ہے۔

۱:......اس لئے سنت تفقد (خبر گیری اہلِ اسلام) کے تحت میں آ سکتا ہے۔

۲:......اس کے علاوہ مسلمانوں کی قومی شکایات و مظالم کو اس کے ذریعہ حکومت تک بآسانی پہونچایا جاسکتا ہے۔

۳:......مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ اس ذریعہ سے بسہولت کیا جاسکتا ہے۔

۴:......تبلیغی ضرورتیں اس کے ذریعہ سے بخوبی ادا ہوسکتی ہیں۔

الغرض اخبارات و جرائد کا وجود اپنے رنگ و روپ میں اور اپنے دنیاوی اصول کے مطابق ہو، تو بہت سے عظیم الشان فوائد کا مجموعہ بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کا رکن اعظم ہے۔

لیکن ہمارے شومی اعمال نے جہاں پر نفع کو نقصان سے اور نیکی کو بدی سے بدل کر رکھا ہے، اس مفید سلسلہ کو بھی نہایت مضر اور بدترین شکل میں تبدیل کر کے **اثمهما اکبر من نفعهما** [1] کے حکم میں کر دیا ہے، اور آج بہت سی دینی اور دنیوی مضرتوں کے علاوہ سب سے بڑی اور سب سے اہم مضرت وہ ہے جس سے کوئی اخبار خالی نہیں رہا اور جس کی وجہ سے اس کا طوفان عالمگیر ہو گیا ہے۔

(۱) ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے۔۱۲ ش

اول:......تو یہ کہ آج کل اخبار عموماً ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ جن کو نہ دین و مذہب سے کوئی واقفیت ہے، اور نہ ہمدردی اور اس کے ساتھ ہی مسئلہ پر مجتہدانہ رائے پیش کرنے کو تیار، جس کی وجہ سے لا مذہبی اور ہر قسم کی بے دینی اخباروں کی اشاعت کا لازمی نتیجہ بن گیا ہے۔

دوسرے:......یہ کہ اتحاد اسلامی اور باہمی یک جہتی، محبت واخلاص کو فنا کرنے میں آج کل اخبارات کا ایک بڑا حصہ ہے، فرقہ وارانہ جنگ وجدل جس نے ہندوستان کو اختلافات کا جہنم بنا رکھا ہے، اس کی بیشتر ذمہ داری انھیں اخبارات ورسائل پر ہے، اور اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس جنگ کا نشو ونما اخبارات کے ساتھ ساتھ ہوا، اور جوں جوں اخبارات نے ترقی کی، اختلافات ان کے نتائج لازمہ کی طرح ساتھ ساتھ بڑھے، آج سے پچاس برس پہلے ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہبی اصول و فروع پر قائم رہتے ہوئے باہم متحد ومتفق شیر وشکر ہو کر جس طرح زندگی بسر کر سکتے تھے، آج دو بھائی اور اولاد و والدین کو ایسا اتحاد نصیب نہیں، آج ہر اخبار کا ایڈیٹر جب کسی جلسہ کی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتا ہے، یا کسی اخبار کا مقالہ لکھنے بیٹھتا ہے، تو وہ اس فرقہ وارانہ جنگ اور باہمی اختلافات کا سخت ترین مخالف نظر آتا ہے، اور لوگوں کو اس سے بچانے کے لئے موٹے موٹے الفاظ کے بوجھ میں دبا دیتا ہے، لیکن کاش کوئی ان کی خدمت میں یہ تو عرض کر دیتا کہ:

تا کے ملامت نگہ اشکبار من   یکبار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش

بخدا اگر واقعی وہ قوم کے ہمدرد ہیں اور اس کو اختلافات کے طوفان سے نکالنا چاہتے ہیں، تو ذرا انصاف کے ساتھ اس کے اسباب پر نظر ڈالیں، تو انھیں مشاہدہ ہو جائے گا کہ ع : خود سنگ خودی ز راہ برخیز۔ اور وہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے:

درد سر ما ہمیں سر ما ست یارے کہ بدوش ماست دوش ست

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اپنی اسلامی برادری کے اخبار واحوال پر مطلع ہونے اور کرنے کا اہتمام اسلئے فرماتے تھے کہ مطلع ہوکر مظلوم کی داد رسی، بیمار کی عیادت، ضعفاء کی اعانت محتاجوں کی امداد کرنے کے لئے ہر قسم کی مادی اور روحانی ذرائع استعمال کئے جائیں، اور اگر کسی مادی امداد پر قدرت نہ ہو، تو کم از کم دعا سے اس کے شریک غم ہو جائیں، اور یہی تمام اسلامی تعلیمات کی روح اور مسلمانوں کی ترقیاتِ ماضیہ کا اصل راز ہے۔

لیکن آج اخبار و حالات اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں، کہ اگر کسی کا ایک عیب معلوم ہو، تو اس کو دس گنا کر کے شائع کیا جائے، دو شخصوں میں باہمی شکر رنجی معلوم ہو، تو کسی ایک جانب کے وکیل ہو کر اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کر دیں۔

الغرض جس اخبار کو اٹھایئے اس میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے تو جو مہمانی سب سے زیادہ اہتمام سے پیش ہوتی ہے، وہ کسی مسلمان کا گوشت (عیب اور عیب جوئی) سا کوئی جھوٹا پروپیگنڈا ہوتا ہے یا کسی کا دلخراش استہزاء اور تمسخر، جس کو لطائف یا افکار حوادث یا خواطر سوانح یا فکاہات کے عنوانات کے مہذب لباس میں پیش کیا جاتا ہے حالانکہ فرمان الٰہی **لایسخر قوم من قوم** صاف اس کا اعلان کر رہا ہے کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ دوسرے کا استہزاء و تمسخر کرے، اکثر جھوٹی افواہوں اور بلاتحقیق خبروں کی بناء پر ایک مسلمان بھائی کی جان و مال اور عزت و آبرو کے خلاف اعلان جہاد کر دیتے ہیں، نہ شریعت مطہرہ کا قانون مانع ہوتا ہے، نہ سیاسی مصالح اور اخوت واتحادِ اسلامی کا لحاظ حالانکہ خدائے تعالیٰ کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آخری خطبہ میں عرفات کے عظیم الشان مجمع کے سامنے اعلان فرما دیا ہے کہ مسلمان کی عزت و آبرو کی رعایت وحفاظت ہر مسلمان پر حاضر و غائب ایسی ہی فرض

ہے، جیسے اس کے جان و مال کی۔ لیکن آہ کہ آج تمام ارباب قلم واصحاب صحافت نے اپنے آپ کو ان تمام قوانین شرعیہ سے مستثنیٰ سمجھ لیا ہے، اور کبھی دھیان تک نہیں ہوتا کہ ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں، شاید کسی اخبار کا کوئی صفحہ بمشکل ان بے لذت گناہوں سے خالی ہوتا ہو، ورنہ عام طور پر یہی وہ چیز ہے، جس پر تمام زور صحافت ختم کیا جاتا ہے، ادھر اخبار بیں طبقہ کی بدمذاقی نے اسکو اور بھی فروغ دے دیا کہ ان کے یہاں اخبار کے مقبول ہونے کی سب سے پہلی شرط یہی چیز ہے، اور وہی اڈیٹر سب سے زیادہ اپنے فن کا ماہر سمجھا جاتا ہے، جو اپنی من مانی باتوں کا سکہ لوگوں کے قلوب پر بٹھانے میں اس کی پروانہ کرے کہ ہمارا خیال شرعاً صحیح ہے یا غلط اور مسلمانوں کے لئے مفید ہے، یا مضر اور جو اپنے مخالف کو نیچا دکھانے میں حلال وحرام کی بحث کو حرام سمجھتے ہیں۔

الغرض یہ مسلمانوں کی موجودہ بدمذاقی کی لمبی کہانی ہے جس کے لئے یہ صفحات نہ کافی ہیں، اور نہ موزوں اس لئے ہم اس کی تفصیل کو خود ناظرین کے انصاف پر چھوڑتے ہوئے صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ خود ملاحظہ فرمائیں کہ کیا واقعی آج کل کے اخبار اس طوفان بے تمیزی سے معمور ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کیا شریعتِ مطہرہ اس کو کسی حال میں جائز رکھ سکتی ہے، اور کیا مسلمان اسلامی اصول اساسی کو چھوڑ کر کوئی دینی یا دنیوی ترقی کر سکتے ہیں، اور کیا اتحاد اسلامی کا راگ الاپنے والے زعماء اس بے راہی کے ذریعے اپنے مقصد کے قریب پہنچ سکتے ہیں، یقین کیجئے کہ اگر پھر مسلمانوں کی قسمت میں عروج لکھا ہے، اور کسی وقت آنکھ کھولیں گے، تو بے تامل کہہ اٹھیں گے:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی ۔ کیں رہ کہ تو می روی بترکستان ست

یہ موجودہ اخبارات کی خرابیوں کا اجمالی خاکہ ہے اگر تفصیل مع دلائل دیکھنے ہوں، تو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب کا رسالہ اخبار بینی ملاحظہ فرمایا

جائے، اور اس کو بھی چھوڑیئے تو مشاہدہ اور تجربے سے زیادہ کوئی عادل گواہ نہیں، آج حشرات الارض کی طرح ہزار ہا اخبارات و رسائل کی اشاعت کے زمانہ کو اب سے پچاس برس پہلے زمانہ کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھئے کہ مسلمان کہاں سے کہاں پہنچ گئے، دین اور دینی تعلیمات مذہب اور مذہبی روایات گویا فنا ہو ہی گئیں، لیکن پوچھنا یہ ہے کہ کیا دنیا میں بھی کوئی ترقی کی، ان کی اقتصادی حالت کچھ درست ہوئی یا اور زیادہ خوفناک پستی ہی میں جا پڑی، اس کی پریشانیوں میں کمی آئی یا اور دس گنا اضافہ ہو گیا۔

اس کا جواب اگر آپ نہ دیں گے تو سینکڑوں تعلیم یافتہ بے کاروں کے غول اور روز افزوں فاقہ کشوں کی تعداد اور صدہا مصیبت زدوں کی خاک کے ڈھیر بول اٹھیں گے کہ یہ ترقی کے راگ محض بے ہنگامہ اور کوشش محض بے اصول اور غلط ہے، اگر ارباب صحافت اس کو بھی ترقی کہیں تو اس کی حقیقت اس سے زائد نہ ہوگی کہ:

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا جہلم اس کا پانیر لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مسلم بات ہے کہ فتنہ علم ہمیشہ فتنہ جہل سے زیادہ شدید ہوتا ہے، اخباری فتنہ چونکہ علمی فتنہ کے رنگ میں ہے اس لئے اس کی مضرتیں بھی دنیا اسلام کو زیادہ پہنچیں، انھیں مفاسد پر نظر کرتے ہوئے عرصہ ہوا کہ حضرت مجدد الملۃ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے ایک رسالہ اخبار بینی کے نام سے شائع کیا تھا، جس میں عوام کو ان دنیوی مفاسد اور مذہبی گناہوں پر دلائل کے ساتھ متنبہ فرمایا تھا، جس میں اخباری ادارے نہ خود تنہا گرفتار ہیں بلکہ ان کی اشاعت کے ذریعہ ہزار ہا مسلمانوں کو ان میں مبتلا کر کے مزید ذمہ داری اپنے سر لئے ہوئے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ جو اخبار ان مذہبی گناہوں اور دینی و دنیوی مفاسد سے خالی ہوں یا جو اخبار بین حضرات ان مفاسد سے بچ سکیں، ان کے لئے اخبار نویسی اور اخبار بینی کو

ناجائز نہیں کہا جا سکتا، مگر چونکہ عام طور پر ان مفاسد سے بچنا سخت دشوار تھا، اس لئے عوام کو یہی مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ بلا ضرورت اخبار بینی سے اجتناب کریں۔

لیکن دنیا کا مذاق بدل چکا ہے، اخبار ضروریات زندگی میں داخل کرلیا گیا ہے، اس مشورہ کا ان پر وہی اثر ہوا جو کسی حقہ یا سگار کے عادی پر اس کے چھوڑنے کی نصیحت کا اثر ہوسکتا ہے۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ ارباب صحافت کی خدمت میں ایک آخری گزارش مخلصانہ اور کی جائے کہ خدا کے لئے سنبھلو، اور مسلمانوں کو سنبھالو۔

اخبار کی ادارت کے لئے جس طرح اس کے اصول وضوابط اور پروپیگنڈے کے طریق آپ یورپین تعلیمات سے حاصل کرتے ہیں، اور حاصل کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح خدا کے لئے یہ بھی سوچئے کہ اشاعت وادارت کے کچھ مذہبی اور شرعی فرائض بھی ہیں، جن کی رعایت نہ کرنے سے اخبارات سینکڑوں مخربات اور گناہوں کا مجموعہ بن رہے ہیں، اس لئے اس وقت وہ آداب واصول قلمبند کئے جاتے ہیں، جو اخبار نویسی میں اہم ترین مذہبی فرض ہے، شاید اسی طرح ان بے لذت گناہوں کے عالمگیر طوفان سے دنیائے اسلام کو نجات ملے، جو اخباروں کی صورت میں بحر و بر پر تسلط کئے ہوئے ہیں ؎

گریہ شام سے تو کچھ نہ ہوا ان تک اب نالۂ سحر جائیں

دیکھئے کس نیک بخت کی قسمت میں یہ سعادت مقدر ہے کہ اخباری دنیا کے شرعی آداب واصول کی پابندی کر کے دنیا میں اس کی نظیر قائم کردے کہ مذہبی اصول کے ماتحت اس طرح اخبار چلایا جا سکتا ہے۔

آدابُ الاخبار

اس باب میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی بات کا قلم سے لکھنا

بعینہ وہی حکم رکھتا ہے، جو زبان سے لکھنے کا ہے جس کلام کا زبان سے ادا کرنا ثواب ہے، اس کا قلم سے لکھنا بھی ثواب ہے، اور جس کا بولنا گناہ ہے اس کا قلم سے لکھنا بھی گناہ ہے بلکہ لکھنے کی صورت میں ثواب اور گناہ دونوں میں ایک زیادتی ہو جاتی ہے، کیونکہ تحریر ایک قائم رہنے والی چیز ہے، مدتوں تک لوگوں کی نظر سے گذرتی رہتی ہے، اس لئے جب تک وہ دنیا میں موجود رہے گی، اور لوگ اس کے اچھے یا برے اثر سے متاثر ہوتے رہیں گے، اس وقت تک کاتب کے لئے اس کا ثواب یا عذاب برابر جاری رہے گا، جیسا کہ بعض روایات میں بتصریح مذکور ہے، کہ جو شخص کسی کاغذ میں درود شریف لکھتا ہے، تو جب تک یہ تحریر باقی رہے گی، اس وقت تک اس کو ثواب پہنچتا رہے گا، اسی طرح ناجائز کلام کے نتائج بد کا کاتب کے لئے پہنچتا رہنا بھی دوسری احادیث میں صاف مذکور ہے، اس لئے ہر مضمون نگار کا فرض ہے، کہ ہر مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کو مندرجہ ذیل معیار پر جانچ لے، اور درحقیقت یہی معیار تمام اُن آداب کی مجمل تصویر ہے، جن کی تفصیل ہم اس وقت ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہیں۔

ایک زریں اصول

مضمون نگاری اور اخبار نویسی میں مذہبی جرائم اور شرعی گرفت سے بچنے کا سب سے بہتر ذریعہ اور جامع مانع اصول یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کے لکھنے کا ارادہ کرے، پہلے اپنے ذہن میں استفتاء کر لے کہ اس کا لکھنا میرے لئے جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ثابت ہو، تو قدم آگے بڑھائے، ورنہ محض لوگوں کو خوش کرنے کے لئے گناہ میں ہاتھ رنگ کر برائی بدشگونی کے لئے اپنی ناک نہ کاٹے اور اگر خود احکام شرعیہ میں ماہر نہ ہو تو کسی ماہر سے استفتاء کرنا ضروری ہے، یہ ایک شرعی اجمالی قانون ہے، جو فقط اخبار نویسی میں بلکہ ہر قسم کی تحریر میں ہر مسلمان کا مطمح نظر ہونا چاہئے، اس کے بعد ہم اس کی تفصیل چند نمبروں میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

۱:...... جو واقعہ کسی شخص کی مذمت اور مصائب پر مشتمل ہو، اس کو اس وقت تک ہرگز شائع نہ کیا جائے، جب تک حجت شرعیہ سے اس کا کافی ثبوت نہ مل جائے، کیونکہ جھوٹا الزام لگانا یا افتراء باندھنا کسی کافر پر بھی جائز نہیں، لیکن آہ کہ آج اہل قلم اس سے غافل ہیں، اور اخبار کا شاید کوئی صفحہ اس سے خالی ہوتا ہو۔

۲:...... یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس معاملہ میں حجت شرعیہ کے لئے کسی افواہ کا عام ہونا یا کسی اخبار کا لکھ دینا ہرگز کافی نہیں، بلکہ شہادت شرعیہ ضروری ہے کیونکہ دورِ حاضر کے موجودہ تمام اخبارات کے صدہا تجربات نے اس بات کو ناقابل انکار کر دیا ہے کہ بہت سے مضامین اور واقعات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں، اور جس شخص کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں، اس غریب کو خبر تک نہیں ہوتی، اور یہ صورت کبھی تو قصداً کی جاتی ہے اور کبھی سہواً خطاً ہو جاتی ہے، اس لئے اگر کسی اخبار میں کسی شخص کے حوالہ سے کوئی مضمون یا واقعہ نقل کر دیا جائے، تو شرعاً اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر یہ واقعہ کسی کی مذمت یا مضرت وعیب جوئی پر مشتمل نہ ہو، تو پھر یہ ضعیف ثبوت بھی کافی ہے، اور اس کو نقل کر کے شائع کر دیا جائے۔

۳:...... کسی شخص کے عیب یا گناہ کا واقعہ اگر حجت شرعیہ سے بھی ثابت ہو جائے، تب بھی اس کی اشاعت اور درج اخبار کرنا جائز نہیں، بلکہ اس وقت بھی اسلامی فرض یہ ہے کہ خیر خواہی سے تنہائی میں اس کو سمجھایا جائے، اگر سمجھانے کو نہ مانے اور آپ کو قدرت ہو، تو بجبر اس کو روک دیں، ورنہ کلمہ حق پہنچا کر آپ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں، اس کی اشاعت کرنا اور رسوا کرنا علاوہ نہی شرعی کے تجربہ سے ثابت ہے کہ بجائے مفید ہونے کے ہمیشہ مضر ہوتا ہے، اور اس لئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی

ہے، کہ اگر اپنے بھائی مسلمان کا کوئی عیب یا گناہ ثابت ہو، تو اس کو رسوا نہ کرے، بلکہ پردہ پوشی سے کام لے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے ایک محرر نے ایک روز اُن سے بیان کیا کہ ہمارے بعض پڑوسی شراب پیتے ہیں، میرا خیال ہے کہ میں محکمۂ احتساب (پولیس) میں اس کی اطلاع کردوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو، بلکہ ان کو سمجھاؤ، اور ڈراؤ، محرر نے عرض کیا کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں، وہ باز نہیں آتے، اس لئے میں تو اب پولیس میں اطلاع کروں گا، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ:

من ستر عورة فكانما احيا موؤدة فى قبرها رواه ابوداؤد و النسائى و ابن حبان فى صحيحه و الحاكم و قال صحيح الاسناد . (ترغیب و ترہیب ص:۱۰۳، ج:۴)

جو شخص کسی کا عیب چھپاتا ہے، وہ اتنا ثواب پاتا ہے جیسے کوئی زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو دوبارہ زندہ کردے۔

حضرت مخلد بن مسلمہؓ فرماتے ہیں، کہ جب میں والیٔ مصر تھا تو ایک روز دربان نے مجھے اطلاع دی کہ ایک اعرابی دروازہ پر حاضر ہے اور آپ سے ملنے کی اجازت چاہتا ہے، میں نے آواز دے کر دریافت کیا کہ تم کون ہو، تو آنے والے نے جواب دیا کہ "جابر بن عبداللہ" میں حضرت جابرؓ کا نام سن کر بالا خانہ سے نیچے دیکھ کر کہا کہ یا تو آپ اوپر آجائیں یا میں نیچے آتا ہوں، حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ دونوں باتوں کی ضرورت نہیں میں تو صرف ایک حدیث کے متعلق آپ سے تحقیق کرنے آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کے متعلق روایت کرتے ہیں، مخلد بن مسلمہؓ نے فرمایا: ہاں! میں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے، تو گویا وہ ایک زندہ درگور کو اس کی قبر سے نکالتا ہے، حضرت جابرؓ یہ سنتے ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط (از ترغیب وترہیب، ص:۱۰۴)

اور حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں:

من ستر عورة اخيه ستر اللّٰه عورته يوم القيامة و من كشف عورة اخيه كشف اللّٰه عورته حتى يفضحه بها في بيته. رواه ابن ماجة باسناد حسن .

(ترغیب وترہیب، ص:۱۰۴)

جو شخص اپنے بھائی کا عیب چھپائے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب قیامت کے دن چھپائیں گے، اور جو شخص اپنے بھائی کے عیب کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے عیب کھول دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو گھر کے اندر بیٹھے ہوئے رسوا کر دیتے ہیں۔

الغرض کسی مسلمان کا کوئی عیب یا گناہ مشاہدہ یا حجت شرعیہ سے ثابت بھی ہو جائے، تب بھی پردہ پوشی سے کام لے، اور خفیہ اس کو سمجھائے کیونکہ یہی طرز زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔

۴:......البتہ اگر کسی مسلمان کا ایسا عیب یا گناہ حجت شرعیہ سے ثابت ہوا کہ جس کا نقصان اپنی ذات کو پہنچتا ہے، اور یہ اس سے مظلوم ٹھہرتا ہے، تو پھر اس کی برائی کو علانیہ شائع کر سکتا ہے، اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

لايحب اللّٰه الجهر بالسوء من القول الا من ظلم .

اللہ تعالیٰ برائی کے اعلان کو پسند نہیں فرماتے مگر جس پر ظلم کیا گیا۔ (وہ ظالم کے ظلم کا اعلان کر سکتا ہے)

امام تفسیر مجاہد کہتے ہیں کہ اس آیت کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے کہ کوئی شخص کسی کی مذمت یا شکایت کرے، لیکن اگر کسی پر ظلم ہو، تو اس کے لئے جائز ہے کہ ظالم کی شکایت کرے، اور اپنے معاملہ کا اعلان کرے، اور اس کے ظلم کو لوگوں پر ظاہر کرے، (روح المعانی) لیکن اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ عام اعلان و اشاعت کے بجائے صرف ان لوگوں کے سامنے بیان کرے، جو اس کی دادرسی کر سکیں۔

۵:...... اگر کسی اخبار میں کوئی قابل تردید غلط مضمون کسی شخص کے نام سے طبع ہوا ہو، تو اس کے جواب میں صرف اس پر اکتفاء کیا جائے کہ فلاں اخبار نے ایسا لکھا ہے، اس کا جواب یہ ہے اس شخص کی ذات پر کوئی حملہ نہ کیا جائے، کیونکہ ابھی تک کسی حجت شرعیہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ واقع میں یہ مضمون اُسی شخص کا ہے۔

۶:...... جو خبر کسی شخص کی مذمت اور ضرر پر مشتمل نہ ہو، اسکی اشاعت جائز ہے مگر اس شرط سے کہ اس کی اشاعت کسی مسلمان کی خاص مصلحت یا عام مصلحت کے خلاف نہ ہو، اور جس میں ایسا احتمال ضعیف بھی ہو، تو بجز ان لوگوں کے جو عقل اور شرع کے موافق اس معاملہ کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہوں، عام لوگوں پر اس کو ظاہر کرنا نہ چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے نقصانات کی طرف اس شخص کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ آیت: ''و اذا جآء هم امر من الامن او الخوف اذاعوا به'' میں ایسے ہی اخباروں اور جلسوں کی مضرت اور مذمت کو بیان فرمایا ہے لیکن مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ اس کو بھی محض خبر کی حیثیت سے نقل نہ کرے، بلکہ اس سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیدا کرے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ:

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه۔

انسان کے اچھا مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے۔

کوئی خبر خود مقصود نہیں ہوتی

ادھر یہ بھی عقلاً ثابت ہے کہ کوئی خبر خود مقصود و مطلوب نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ کسی انشاء کا ذریعہ ہو کر مقصود کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور دراصل مقصود کوئی کام ہوتا ہے، جو اس خبر سے متعلق ہو، اس لئے بہتر ہے، کہ نتائج اخبار کو بھی ذکر کر کے اس کے افادہ میں اضافہ کر دیا جائے، مثلاً آپ کسی شخص کے متعلق یہ خبر درج کرتے ہیں، کہ اس نے چند ہزار روپیہ کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی دوسرے نیک کام میں صرف کیا، تو اسکے بعد اس شخص کے لئے دعائے ترقی اور دوسرے مسلمانوں کے لئے اس کی ترغیب ذکر کر دی جائے، یا مسلمانوں کی کسی جماعت یا ایک شخص کی مصیبت کا ذکر آیا، تو خود بھی دعا کرے، اور مسلمانوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرے، نیز یہ کہ جس سے ہو سکے اس کی مادی امداد بھی کرے، کسی کی موت کا ذکر کیا ہے، تو لوگوں کو اس طرف متوجہ کرے کہ عبرت حاصل کریں، اور اپنے لئے اسی وقت کے واسطے سامان تیار کر لیں۔

الغرض روزمرہ کے واقعات و حوادث چشم بینا کیلئے بہترین وعظ ہیں، لیکن اس کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس پر متنبہ کیا جائے، حضرت شیخ العرب والعجم مولانا محمود حسنؒ صاحب محدث دیوبندی نے کیا خوب فرمایا ہے:

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں دیکھو ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

اول تو کوئی واقعہ اور کوئی خبر دنیا میں ایسی کم ہوتی ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو، یا جس سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصور نہ ہو، لیکن اگر کوئی خبر ایسی بھی ہو، تب بھی اس کو محض تفریح طبع کے مد میں ذکر کر دینا مضائقہ نہیں، بلکہ یہ بھی ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے، اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض اوقات مزاح (خوش طبعی) فرمانا اسی حکمت پر مبنی تھا، اور ایک حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت فرماتے ہیں کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

اجمعوا هذه القلوب فاطلبوا لها طرف الحكمة فانها تمل كما تمل الابدان رواه ابن عبد البر فی العلم و الخرائطی فی مكارم الاخلاق و ابن السمعان فی الدلائل (کنز العمال. ص:۱۳۶، ج:۲)

ان قلوب کو بھی تھوڑی دیر (غور وفکر) سے مہلت دیا کرو، اس طرح کہ ان کے لئے حکمت کی لطیف وعجیب باتیں تلاش کرلو، (جن سے قلبی تکان رفع ہو) اس لئے کہ قلوب بھی ایسے تھک جاتے ہیں، جیسے بدن تھکتے ہیں۔

۷:......خلاف شرع مضامین اور ملحدین کے عقائد باطلہ اول تو شائع نہ کئے جائیں، اور اگر کسی ضرورت سے اشاعت کی نوبت آئے، تو جس پرچہ میں وہ شائع ہوں، اسی میں ان کی تردید اور شافی جواب بھی ضرور شائع کردیے جائیں، آئندہ پرچہ پر اس کو حوالہ نہ کیا جائے، کیونکہ بہت سے آدمی وہ ہوتے ہیں جن کی نظر سے آئندہ پرچے نہیں گزرتے، خدانخواستہ اگر وہ اس سے کسی شبہ میں گرفتار ہوگئے، تو اس کا سبب شائع کرنے والا ہوگا۔

۸:......اگر مسلمانوں پر کافروں کے ظلم کی خبر شائع کرنا ہو، تو جب تک اس ظلم کی نسبت کافروں کی طرف حجت شرعیہ سے ثابت نہ ہو، اس طرح شائع کیا جائے کہ فلاں مقام کے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں، مسلمان ان مظالم کا انسداد کریں، اور جائز طریق پر ان کی جانی و مالی امداد کردیں۔

۹:......اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ ایسا شخص بنے جو تمام علوم اسلامیہ پر عبور رکھتا ہو، یا کم از کم علماء سے رجوع کرنے کا پابند ہو، اور مذہب سے ہمدردی رکھنے والا ہو، ورنہ

ظاہر ہے کہ اخبارات اشاعت بے دینی و بے قیدی کا ایک کامیاب آلہ ہے۔

۱۰:...... کسی ایسی کتاب کا جو دین کو مضر ہو یا ایسی دوا کا جو شرعاً حرام ہو، یا کسی ایسے معاملہ کا جو شرعاً فاسد ہو اشتہار نہ دیا جائے۔

یہ مختصر گزارش ہے جو محض دلسوزی اور ہمدردی پر مبنی ہے اگرچہ زمانہ کی مسموم ہوا میں کارگر ہونے کی توقع نہیں، لیکن بایں اُمید کہ شاید خدا تعالیٰ کسی نیک بندے کو عمل اور اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں۔

٩٥

ألأجرُ الجزل فی الغزل

چرخہ کی فضیلت

تاریخ تالیف ــــــــ ۲۸؍جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ (مطابق ۱۹۲۰ء)

مقامِ تالیف ــــــــ دارالعلوم دیوبند

نویں صدی کے مشہور و معروف محدث شیخ جلال الدین سیوطیؒ کے رسالہ ''الأجر الجزل فی الغزل'' کا حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے افادہ عام کے لئے سلیس اور عام فہم اردو ترجمہ مع فوائد اور مذہبی حیثیت سے تحریر فرمایا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

چند سال گذرے کہ نویں صدی ہجری کے مشہور ومعروف محدث مفسر نصف جلالین حضرت شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ الاجر الجزل فی الغزل (۱) نظر سے گذرا تھا جس کو شیخ موصوف نے آج سے چار سو برس پہلے تصنیف فرمایا ہے اور جس میں چرخہ کے فضائل کی حدیثیں جمع کی ہیں۔ اور جو اس کے علاوہ عورتوں کے علم وعمل اور ان کی دینی و دنیوی ترقی کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کی نصیحتوں کے انمول موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر اسی وقت خیال میں آیا تھا کہ اس کا ترجمہ عورتوں میں شائع کر کے چرخہ کی قدیم اور سادہ رسم پھر زندہ کی جائے جو سراسر خوبیوں سے بھری ہوئی ہے اور جو ہمارے بڑوں کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے۔ جس کو یورپین تمدن اور اس کی مہلک تہذیب نے ایسا مٹایا ہے کہ ہندوستان کی شریف زادیاں اس کو (خدا کی پناہ) ایک عیب سمجھتی ہیں۔ اگر چہ وہ ان کی ماؤں اور دادیوں کا بہترین مشغلہ تھا۔ اور ان سے آگے بڑھ کر

(۱) یہ رسالہ میرے مکرم دوست مولوی قاری محمد یوسف صاحب میرٹھی نے مجھ کو دیا تھا جس کا ترجمہ آپ کے زیر ملاحظہ ہے۔

امہات المومنین یعنی آنحضرت ﷺ کی نیک بیبیوں کا باعث فخر تھا نیز اس میں بعض ان خرابیوں کا بھی ازالہ ہے جو آج کل یورپ کے اثر سے ہندوستان میں پھیل چکی ہیں۔ لیکن خداوند عالم کے علم میں وہ اس کا وقت نہ تھا اس لئے آج تک ارادہ یوں ہی ٹلتا رہا۔

آج جبکہ ملک میں سودیشی کو رواج دینے کی ضرورت پیش آئی اور ملک کے مذہبی علما اور سیاسی لیڈروں نے باتفاق رائے یہ بات طے کر دی کہ موجودہ حالت میں اپنی دیس کی بنی ہوئی چیزیں چھوڑ کر ولایتی کپڑا اور دوسری اشیاء کا خریدنا اور بیچنا مذہب اور ملک کے لیے سخت نقصان پہونچانیوالا ہے ان کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سب چیزیں اپنی دیس کی بنی ہوئی استعمال کریں اور اسی کا نام سودیشی ہے اور اسی بناء پر اس کی ضرورت پیش آئی کہ ملک میں چرخہ کاتنے کا رواج عام کیا جاوے تاکہ اپنے دیس کے کتے ہوئے سوت سے اتنا کپڑا بنا جاسکے جو تمام ملک کے لئے کافی ہو جائے چنانچہ ملک کے ہر گوشہ سے یہ آواز اٹھی کہ قدیم چرخہ کو رواج دو اور اس کی تعلیم کو اہم سمجھو یہ دیکھ کر وہ اپنا پرانا خیال تازہ ہو گیا اور اس رسالہ کے ترجمہ کی ضرورت دوہری ہوگئی۔ تاکہ وہ لوگ جو چرخہ کی موجودہ تحریک پر یہ کہہ کر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں کہ یہ تو مسٹر گاندھی جی کی ایجاد کردہ تحریک ہے مسلمان بھی ان کے پیچھے ہو لئے سمجھ لیں کہ جس چیز کو انہوں نے گاندھی جی کی ایجاد سمجھی ہے وہ درحقیقت ان کے گھر کی پرانی صنعت ہے اور صنعت بھی وہ جو آج ۱۳۳۹ھ کی موجودہ کشمکش کو دیکھ کر ایجاد نہیں کی گئی بلکہ اس کی تعلیم ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرمائی تھی لیکن ہندوستانی مسلمان چونکہ ایک عرصہ دراز سے اپنے گھر کو چھوڑ کر انگلستان کی سیر کو گئے ہوئے تھے جس سے آج ڈیڑھ سو برس کے بعد واپس آئے ہیں اس لئے ان کو اپنے گھر کی چیزوں کی خبر نہیں اور وہ اپنے گھر کے اثاثہ سے

یہاں تک بے خبر ہیں کہ جب اس میں سے کوئی چیز ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کو پیش کرنے والے کی ملک سمجھتے ہیں جس چرخہ کو آج مسٹر گاندھی جی ہندوستان کے گھروں میں دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں مدینہ کی گلیوں میں ہم اس کی آواز تیرہ سو سال پہلے سے سنتے ہیں ہاں اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس وقت ذرا غیرت کرنی چاہیے اور مسٹر گاندھی کا احسان ماننا چاہیے کہ وہ ان کو انکے مذہبی احکام یاد دلاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بندہ شفیع عفا عنہ

۲۸ر جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ

الاجر الجزل فی الغزل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ و کفی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی .

هذا جزء جمعت فيه الاحاديث الواردة فى الغزل
سميته الاجر الجزل فى الغزل.

امام المحدثین والمفسرین حضرت شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور وہ کافی ہے اور سلام ہے اس کے مقبول بندوں پر یہ ایک رسالہ ہے جس میں میں نے وہ حدیثیں جمع کی ہیں جو چرخہ کاتنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور اس کا نام الاجر الجزل فی الغزل (چرخہ کاتنے میں ثواب عظیم) رکھا ہے۔

(۱) قال ابو نعيم فى المعرفة ثنا احمدبن حماد بن سفيان ثنا عمر وبن عثمان الحمصى ثناابن عباس عن سليم ابن عمرو الانصارى عن عم ابيه عن بكر ابن عبدالله ابن ربيع الانصارى قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم علموا ابناء كم السباحة والرماية ونعم لهو المومنة فى بيتها المغزل.

حدیث (۱)

ابن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے لڑکوں کو تیرنا اور تیراندازی سکھلاؤ، اور مسلمان عورت کا گھر بیٹھے بہترین مشغلہ چرخہ ہے۔

(۲) و قال ابن عدی ثنا جعفری بن سهل ثنا جعفر بن نصر ثنا حفص ابن غیاث عن لیث عن مجاهد عن ابن عباس رضی الله عنهما مرفو عالا تعلموانساء کم الکتابة ولا تسکنوهن العلالی و قال خیر لهو المومن السباحة و خیر لهو المرء ة المغزل.

حدیث (۲)

حضرت ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنی عورتوں کو لکھنا نہ سکھاؤ اور بالا خانوں میں نہ رکھو اور فرمایا کہ مسلمان مرد کے لیے بہتر دل بھلاوا تیرنا ہے اور مسلمان عورت کے لیے بہتر مشغلہ چرخہ کاتنا۔

فائدہ۔ اس حدیث میں مردوں اور عورتوں کے لیے چند بیش بہا تعلیمات ہیں۔ اول یہ کہ عورتوں کو لکھنا مت سیکھاؤ اور اسی معنی کی ایک صحیح الاسناد روایت آگے بھی آنیوالی ہے اور اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عام حکم فرما دیا کہ عورتوں کو لکھنا نہ سکھاؤ اور بالا خانوں میں نہ رکھو (روض الاخیار للشیخ محمد قاسم بن یعقوب) البتہ صحاح کی بعض روایات میں حضرت شفاء بنت عبداللہؓ سے مروی ہے

کہ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک روز میرے پاس تشریف لائے اور میں اس وقت حضرت حفصہؓ کے پاس بیٹھی تھی آپ نے مجھے فرمایا۔

الا تعلمین هذه رقية النملة كما علمتيها الكتابة

(رواه ابوداؤد فى الرقى)

اے شفاءتم حفصہ کو (قروح) نملہ کی دعا کیوں نہیں سکھا دیتیں جیسے تم نے انہیں لکھنا سکھایا ہے۔

نملہ اُن پھوڑیوں کو کہتے ہیں جو انسان کی بغل سے نیچے نکل آتی ہیں اور جن میں سوزش کے ساتھ چیونٹیاں سی چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں عرب کچھ دعاء پڑھکر ان پر دم کرتے تھے جس سے باذن اللہ یہ تکلیف دفع ہو جاتی تھی (کذا فی القاموس) حضرت شفاءؓ بھی یہ دعا جانتی تھیں اور اکثر دم کیا کرتی تھیں جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اس خیال سے کہ کہیں میں دعا میں کوئی گناہ نہ ہو آنحضرت ﷺ کو سنائی تو آپ نے اس کی اجازت دی اور فرمایا کہ یہ دعا حفصہؓ کو بھی سکھا دو۔

(کذا ذکرہ الخطابی فی حاشیہ ابی داؤد نقلاً عن ابن مندہ وابی نعیم)

پھر اس دعا کے بارہ میں خطابی نے شرح ابی داؤد میں اور علامہ دمیری نے حیوۃ الحیوان باب النمل میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں جن کے ذکر کرنے کی اس جگہ ضرورت نہیں۔

الحاصل ابوداؤد کی روایت مذکورہ سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت شفاءؓ لکھنا جانتی تھیں اور حضرت حفصہؓ کو بھی انہوں نے سکھایا۔ اور آپ نے دونوں میں سے کسی کو منع نہیں فرمایا۔

بہر حال اس حدیث سے عورتوں کے لئے تعلیم کتابت کی اجازت نکلتی ہے۔

اس لئے علماء محدثین وفقہا نے دونوں روایتوں کی تطبیق کے لئے فرمایا ہے کہ اگر کسی فتنہ کا خوف نہ ہو جیسا کہ حضرت حفصہؓ اور شفاءؓ کے لئے نہیں تھا تو اجازت ہے ورنہ نہیں اور پہلی روایت کو جو اس رسالہ میں ہے خوف فتنہ پر محمول کیا ہے۔ (۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کو لکھنا سکھانے میں فتنہ کا خوف ہے یا نہیں بعض حضرات جو اس میں کوئی فتنہ نہیں سمجھتے وہ اس کی اجازت دیتے ہیں لیکن اس زمانہ اور بلکہ اس سے پہلے زمانہ کے اکثر علماء کی بھی یہی رائے ہے کہ اب عورتوں کو لکھنا سکھانا فتنہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ حکیم ترمذی نوادر الاصول میں اور ابن ملک شرح مصابیح میں اور طیبی شرح مشکوٰۃ میں اور شیخ ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اشعۃ اللمعات میں اپنے زمانہ کے متعلق بھی یہی فیصلہ دیتے ہیں کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا ہرگز مناسب نہیں۔ اور مولانا سید نعمان آلوسی زادہ مفتی بغدادؒ نے جو میرے استاذ الاستاذ بھی ہیں اس بحث میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ آج کل عورتوں کے لئے لکھنا سیکھنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور حضرت مولانا ومرشدنا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے اس بارہ میں یہ الفاظ ہیں: ''اس زمانہ میں تعلیم کتابت عورتوں کو مکروہ تحریمی ہے'' بلکہ وہ لوگ جو

(۱) مولانا عبدالحی لکھنوی اپنے فتاویٰ میں یہ دونوں متعارض حدیثیں نقل کر کے فرماتے ہیں۔
شراح حدیث محققین بمقتضائے احتیاط وتحقیق در ہر دو حدیث تطبیق فرمودہ اند وحدیث نہی را معمول بہ قرار دادہ اند وحدیث ثانی را بنا بر چند احتمال قابل استدلال نداشتہ اند، الی قولہ بہر حال بقاعدہ اصول حنفیہ ترجیح نافی بر مبیح باید نمود ونہی تا وقتیکہ رجحان معارض او از اباحت ثابت نشود یا محمول بر حرمت است فی الغالب یا بکراہت تحریمی کما ہو مصرح فی الفقہ والاصول وحال ازمنہ متاخرہ را بر ازمنہ صحابہ ودیگر متقدمین قیاس نمودن بیجا است پس اگر یکے را از متقدمان حدیثے رسیدہ وثانیا بر حمل بر یک احتمال کدامی فعل از ایشاں بظہور آمدہ بود از ان فعل حجت تامہ آوردن بر جواز کتابت واستحباب واباحت آں در حق زناں برائے جملہ زنان خطا است پس اہل اسلام را بمقتضائے احتیاط اسلامی احتراز از ارتکاب ہمچو امر لازم واللہ اعلم بالصواب (خلاصۃ الفتاویٰ ص ۸۲۳ ج ۴)

اپنے آپ کو قید مذہب سے بھی آزاد رکھتے ہیں وہ بھی عورتوں کی تعلیم کتابت میں فتنہ سمجھ کر منع فرماتے ہیں مثلاً کشکول بہاؤالدین میں حکیم سقراط سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ایک عورت کو دیکھا کہ لکھنا سیکھتی ہے تو کہا

عقرب تزداد سمّاً الی سمّها

یہ ایک بچھو ہے جو اپنے زہر میں اور زہر بڑھا رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت اول تو خود ہی فتنہ ہے اور لکھنا سیکھنا اس فتنہ کو اور سخت کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ درحقیقت انسان کی تحریر اس کی ایک خموش آواز ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے۔

القلم لسان الید

قلم ہاتھ کی زبان ہے

بلکہ یہ آواز اکثر زبان کی آواز سے زیادہ دلکش ہوتی ہے تو جس طرح تعلیمات شرعیہ اور غیرت فطریہ اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اجنبی مرد عورتوں کی آواز سنیں اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ عورتوں کی تحریر کاغذ میں ثبت ہو جس پر اغلباً اجنبی مردوں کی بھی نظر پڑتی ہے۔ نیز عورتوں کی تحریر اکثر بڑے بڑے فتنوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بہرحال اول تو حدیث کی صریح ممانعت اور پھر اختلاف علماء اور پھر کثرت سے ان کا ممانعت کی طرف مائل ہونا ان سب باتوں کو دیکھ کر تعلیم کتابت کا ترک کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس کی کوئی سخت ضرورت بھی نہ ہو ہاں اگر کوئی ضرورت شدید پیش آئے اور کسی فتنہ کا خوف نہ ہو تو پھر مضائقہ نہیں لیکن ترک تعلیم کتابت کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں بالکل جاہل رہیں یا شریعت عالم

نسواں کو جاہل رکھنا چاہتی ہے۔ بلکہ شریعت غراء تو ہر مرد و عورت پر تحصیل علم کو واجب قرار دیتی ہے۔ چنانچہ اسی رسالہ میں آپ پڑھیں گے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو سورۂ نور پڑھاؤ۔ اور اسی لئے اسلاف امت کی تاریخ میں صدہا تعلیم یافتہ عورتوں کے وہ نمایاں کارنامے موجود ہیں کہ مردوں کو ان پر رشک آتا ہے۔ علماء نے ان عورتوں کی مستقل تواریخ لکھی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کی بداخلاقی اور بے دینی اور پابندی رسوم جاہلانہ کا سبب یہی بے علمی ہے۔ اگر عورتیں تعلیم پائیں تو توقع ہے کہ یہ سب خرابیاں اُن سے دور ہو جائیں۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ تعلیم ایسی نہ ہو کہ جو ان کے اخلاق کو خراب کرنے والی ہو۔ اور اس لیے آج علماء کرام عورتوں کے لئے تعلیم انگریزی اور عشقیہ غزلوں اور ناولوں وغیرہ کے مطالعہ کو ناجائز فرماتے ہیں۔ کیونکہ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ان کے لئے مخرب اخلاق ہے بلکہ ان کے لئے صرف مذہبی تعلیم ہونی چاہیے۔ اور پھر کچھ صنعت و حرفت۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

دوسری تعلیم اس حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ عورتوں کو بالاخانوں میں نہ رکھو جہاں بے پردگی کا خوف ہے جس سے پردہ کی سخت تاکید سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ بالاخانہ میں رہنے سے بے پردگی یقینی نہیں بلکہ اس کا فقط احتمال ہے لیکن آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی جائز نہیں رکھا کہ عورتوں کو ایسی جگہ رکھا جائے جہاں بے پردگی کا خطرہ و گمان ہو۔ اب وہ عورتیں اپنی حالت پر غور کریں جو پردہ میں کوتاہی کرتی ہیں کہ کل قیامت کے روز آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دیں گی۔

تیسری تعلیم اس حدیث میں مردوں کے متعلق ہے کہ ان کے لئے بہترین دل بہلاؤ پانی میں تیرنا ہے اور اس سے پہلی حدیث میں اس کے ساتھ تیر اندازی بھی مذکور

ہے۔ مسلمان اسی وقت سے بزدل اور بے دست و پا ہوئے جب سے ان پاک تعلیمات کو چھوڑا جوان کے دین اور دنیا میں اُن کے لئے بہتری اور بھلائی کا راستہ بتاتی ہیں۔ آج مسلمانوں کے بچے اسکولوں میں کیا سیکھتے ہیں۔ چڑیا، طوطے بنانا، رسے کھینچنا، اور اعلیٰ درجہ کی ترقی ہے کہ فٹ بال اور کرکٹ تک پہنچ جائیں۔ اللھم اھدنا و ایاھم۔

(۳) و قال الدیلمی اخبرنا ابو علی الحداد عن ابراھیم عن ابی نعیم الحافظ عن ابی بکر عمر بن محمد السری بن سھل بن عبداللہ ابن احمد الجصاص عن یزید بن عمر والعشوری عن احمد ابن الحارث النستائی عن سام بن عبدالرحمٰن عن ابن سیناسی عن انس بن مالک رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ ﷺ نعم لھو المرأة مغزلھا.

حدیث (۳)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عورت کا بہترین مشغلہ چرخہ ہے۔

(۴) و قال ابن عساکر اخبرنا ابو محمد ابن الاکفانی اخبرنا ابوالحسن احمد بن عبدالواحد بن ابی الحدید اخبرنا ابو محمد بن ابی نصر اخبرنا ابو علی عبدالسلام بن احمد بن محمد بن الحارث القرشی الدمشقی و قال فی تمام فوائده اخبرنا عبدالسلام ابو حصیر محمد بن عبداللہ الخراسانی الزاھد ثناموسی بن ابراھیم المروزی ثنا مالک بن انس عن ابی حازم

عن سهل ابن سعد قال قال رسول الله ﷺ عمل الابرار من الرجال الخياطة و عمل الابرار من النساء الغزل.

حدیث (۴)

حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ مردوں میں سے نیک آدمیوں کا کام سینا ہے اور عورتوں میں نیک بیبیوں کا کام چرخہ کاتنا۔

(۵) و قال الخطيب اخبرنا الحسن بن محمد الجلال اخبرنا على بن عمر بن الحافظ ثنا اسمٰعيل بن العباس بن فهران ثنا عبادبن الوليد ثنا مسلم بن المغيرة ثناد اودالنخعى عن ابى حازم عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ عمل الابرار من رجال امتى الخياطة و اعمال الابرارمن النساء الغزل.

حدیث (۵)

حضرت خطیب نے بھی حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے نیک مردوں کا کام سینا ہے اور نیک عورتوں کا کام چرخہ کاتنا۔

(۶) و قال الخطيب فى تاريخه اخبرنا محمدبن الحسين بن الفضل القطان اخبرنا عثمان بن احمد

الدقاق حدثنا سهل بن احمد الواسطی ثنا عمرو بن علی سمعت محمد بن زیاد صاحب میمون ابن مهران یقول حدثنا میمون بن مهران عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ زینوا مجالس نساء کم بالمغزل.

حدیث (۶)

خطیب بغدادی اپنی کتاب تاریخ بغداد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اپنی عورتوں کی مجلسوں کو چرخہ سے زینت دو۔

تنبیہ : افسوس کہ جس چیز کو سردار دو جہاں جناب رسول اللہ ﷺ عورتوں کے لئے زینت فرماتے ہیں اس کو اس زمانہ کی شریف زادیاں عیب سمجھتی ہیں۔

(۷) واخرج ابن عساکر من طریق محمد بن بکار السکسکی ثنا موسی بن عوف ثنا النّفیلی زیاد بن السکن قال دخلت علی ام سلمة و بین یدیها مغزل تغزل به فقلت کلما اتیتک وجدت فی یدیک مغزلاً فقالت انه یطرد الشیطان و یذهب حدیث النفس وانه بلغنی ان رسول الله ﷺ قال ان اعظمکن اجراً اطولکن طاقة.

حدیث (۷)

حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز ام

المومنین حضرت ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ان کے سامنے ایک چرخہ رکھا ہوا ہے اور وہ کات رہی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب کبھی میں آپ کے پاس آتا ہوں تو آپ کے سامنے چرخہ دیکھتا ہوں انہوں نے فرمایا کہ چرخہ شیطان کو دفع کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زیادہ ثواب والی عورت وہ ہے جس کا طاقہ زیادہ لانبا ہو (طاقۃ دراصل بٹے ہوئے ڈورے یا رسی کے ایک تار کو کہتے ہیں (لسان العرب) اور حدیث میں اس سے چرخہ کا تار مراد ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چرخہ شیطان کو دفع کرتا ہے اور برے وسوسوں کو دور کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کے نفس کو خاصہ ہے کہ جب تک وہ کسی دھندہ میں لگا رہے تو اس کے خیالات منتشر نہیں ہوتے اور جہاں اسے فرصت ملی اسکے خیالات بلند ہونا شروع ہوئے اور چونکہ انسان کا طبعی میلان گناہوں کی طرف ہے اس لئے بیکار ہونے کی حالت میں خواہ مخواہ انسان گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: اشغِل نفسكَ فان لم تُشغِله اشغَلتكَ نفس کو تم اپنے کام میں مشغول رکھو ورنہ وہ تمہیں اپنے کام میں مشغول کر لے گا (جو شر کے سوا کچھ نہیں) اور عورتوں کے لئے بہترین مشغلہ چرخہ ہے وہ اگر اور کاموں سے فرصت پا کر اس کی طرف لگ جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت سے ان گناہوں سے جن میں وہ مبتلا ہیں بچ جائیں۔

(۸) و اخرج ابن عساکر من طریق یزید بن مروان عن زیاد بن عبداللہ القرشی قال دخلت علی ھند بنت

المهلب ابن ابی صفرة وهی امراة الحجاج بن یوسف فرایت فی یدیها مغزلاً تغزل به فقلت اتغزلین وانت امراة امیر المئومنین فقالت سمعت ابی یقول قال قال رسول الله ﷺ اطو لکن طاقة اعظمکن اجرا وهو یطرد الشیطان و یذهب حدیث النفس.

حدیث (۸)

ابن عساکر نے زیاد ابن عبداللہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت مہلب ابن ابی صفرہ کی بیٹی ہندہ کے پاس گیا جو حجاج حاکم عراق کے نکاح میں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں چرخہ ہے اور وہ کات رہی ہیں میں نے کہا کہ آپ بادشاہ کی بیگم ہو کر کاتتی ہیں انہوں نے فرمایا میں نے اپنے باپ (یعنی حضرت مہلب ابن ابی صفرہؓ) سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کا تار زیادہ لانبا ہوگا وہ ہی ثواب زیادہ پانے والی ہے اور چرخہ شیطان کو دفع کرتا ہے اور نفس کے وسوسہ کو دور کرتا ہے۔

فائدہ : حضرت مہلب ابن صفرہ ایک صحابی ہیں جن کے متعلق حضرت عمر فاروق نے ان کے والد سے کہا تھا۔ کہ یہ یہ تمہاری اولاد میں افضل ہیں (کذافی اسد الغابہ) اور جنہوں نے ۶۴ھ میں عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں ہندوستان پر جہاد کیا ہے اور کابل اور ملتان کے درمیان ایک زبردست معرکہ کے بعد فتح پائی اور سندھ میں تشریف لائے (الفتوحات الاسلامیہ لابن الشیخ زینی وخلان) اور حجاج بن یوسف عبدالملک کے زمانہ میں عراق کا گورنر تھا جس نے اپنے جابرانہ مظالم کی

بدولت عالم میں ایسی شہرت حاصل کر لی ہے کہ محتاج بیان نہیں لیکن با ایں ہمہ اس کا حرم سرائے چرخہ سے آباد ہے۔ اب وہ ہندوستان کی شریف زادیاں جن کی عزت میں چرخہ کاتنے سے بٹہ لگتا ہے ذرا غور فرمائیں ۔ ادھر تو دو جہاں کے بادشاہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہؓ اور ایک زبردست گورنر کی بیوی ھندہؓ کی عزت کو خیال کریں اور پھر اپنی عزت کا اس سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ واللہ اگر تمام دنیا کی عورتوں کی عزتیں ایک پلّہ میں رکھی جائیں اور فقط ام سلمہؓ یا ہندہ کی عزت ایک پلّہ میں تو یقیناً ان کی عزت کا پلہ جھک جائے گا۔

(۹) و قال الحاکم فی المستدرک انا ابو علی الحافظ ثنا محمد بن محمد بن سلیمان ثنا عبدالوھاب بن الضحاک ثنا شعیب بن اسحاق الدمشقی عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تسکنوھن الغرف ولا تعلموھن الکتابۃ و علموا المغزل و سورۃ النور . قال الحاکم صحیح الاسناد و اخرجہ البیھقی فی شعب الایمان عن الحاکم.

حدیث (۹)

حاکم نے مستدرک میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو اور ان کو لکھنا نہ سکھاؤ بلکہ چرخہ کاتنا سکھاؤ۔ اور قرآن مجید میں سے سورہ نور ان کو خصوصیت کے ساتھ پڑھاؤ۔

اس حدیث کو حاکم نے روایت کر کے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ اور امام بیہقی نے بھی اس کو اپنی کتاب شعب الایمان میں حاکم سے روایت کیا ہے۔

فائدہ: اور اسی حدیث کو محدثین میں سے حضرات ذیل نے بھی روایت کیا ہے۔

ابن مردویہ، قرطبی، ابن حجر ہیثمی، واحدی، ثمر بنی، بغوی، ملا علی قاری اور حکیم ترمذی نے اس معنی کی ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی نقل کی ہے بہر حال اس روایت کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔ جو حضرات اس زمانہ میں عورتوں کے واسطے کتابت جائز کرنے کے لئے حدیث کی صحت میں کلام کرتے ہیں وہ ان روایات کے ساتھ جن کی اسناد میں کوئی سقم ہے اس روایت کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ تاکہ مجموعہ سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ اس حدیث میں علاوہ تعلیم کتابت کی ممانعت کے عورتوں کو سورہ نور پڑھانے کا حکم ہے کیونکہ اس سورہ میں زیادہ تر عورتوں کے متعلق احکام ہیں اور اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اہل کوفہ کو خط لکھا جس میں اس کی تاکید کی تھی کہ عورتوں کو سورۂ نور پڑھاؤ۔ اور سعید بن منصور اور بیہقی اور ابن منذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ علموا رجالکم سورة المائدة و علموا نساء کم سورة النور (تفسیر الدر منثور للسیوطی مؤلف الرسالۃ) اپنے مردوں کو سورۂ مائدہ پڑھاؤ اور عورتوں کو سورۂ نور۔

مگر افسوس کہ آج عورتیں اکثر تو جاہل ہیں اور جو کچھ پڑھی ہوئی بھی ہیں تو ان کا نصاب تعلیم ہی کچھ اور ہے۔ کسی کو تعلیم انگریزی کا شوق ہے اور کسی کے ہاتھ میں ناول اور غزلوں کی کتابیں جو ان کے اخلاق کو خراب کرنے والی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی طرف توجہ نہیں۔ لکھنا سیکھنے کا شوق بہت عورتوں میں پایا مگر سورۂ نور کا ترجمہ یا تفسیر پڑھنے کی طرف کسی کی رغبت نہ دیکھی۔ اللھم حبب الینا مرضاتک و مرضاة رسولک.

(۱۰) و اخرج ابن سعد عن ام صلبة خولة بنت قیس قالت کنا نکون فی عهد رسو الله ﷺ و ابی بکر و صدراً من خلافة عمر فی المسجد نسوة قد تحاللن ور بما غزلنا و ربما عالج بعضنا فیه الحیض فاخرجنا منه. وهذا آخره والله سبحانه وتعالیٰ ولوحول ولاقوة الا بالله العلی العظیم اعلم بالصواب.

حدیث (۱۰)

ابن سعد نے حضرت ام صلبہؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم چند عورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور پھر ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں اور پھر کچھ دنوں تک حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں بھی مسجد میں بھی جا اُتری تھیں اور کبھی کبھی چرخہ کا تا کرتی تھیں۔ اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم میں سے کسی کو وہیں حیض شروع ہو جاتا تھا۔ پس ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد سے نکال دیا۔

واللہ اعلم بالصواب۔ فقط

احقر محمد شفیع غفرلہ،

سودیشی کی ضرورت

مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ ہر زمانہ میں اپنا ایک با اقتدار خلیفہ قائم رکھیں جو ان کے اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت کرے اور اسلامی شہروں کو کفار کے حملہ سے بچائے اور ان کا فرض ہے کہ جزیرہ عرب کو کفار کی مداخلت سے پاک رکھیں اور ان کا فرض ہے کہ اگر کوئی طاقت اسلامی شہروں پر حملہ کرے تو وہ اس کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش عمل میں لائیں اور ان کا فرض ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان پر ظلم کرے تو وہ اپنے بھائی کو ظلم سے بچانے میں ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کریں۔ اور یہ سب وہ فرائض ہیں جو باتفاق امت قرآن وحدیث سے ثابت ہیں اور جن کو حال میں علماء نے مستقل رسالوں کے ذریعہ سے واضح کر دیا ہے۔ اور آج کل سب جانتے ہیں کہ نصاریٰ کی مجموعی طاقتوں نے ہماری خلافت (یعنی ترکی سلطنت) کو تباہ و برباد کر دیا اور جزیرۃ العرب پر ایک طرح سے قبضہ جما لیا ہے اور تمام اسلامی شہروں کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال کر اپنے قبضہ میں لے لیا اور جو مسلمان بھائی ان شہروں میں آباد تھے ان پر وہ ستم ڈھائے کہ جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ چھتیس گھنٹہ (۱) تک قتل عام رکھا، سینکڑوں پاک دامن اور شریف عورتوں کی پردہ دری کی، ننھے ننھے یتیم بچوں کو ان کی ماؤں کی گود (۲) سے لیکر برچھیوں سے بیندھا۔ اور ان کاموں میں انگریزی گورنمنٹ نے یا تو صراحۃً شرکت کی ہے اور یا شرکت کرنے

(۱)......اخبار زمیندار ۲۳ فروری ۱۹۲۱ء

(۲)......اخبار منصور بجنور۔ ۴ مارچ ۱۹۲۱ء

والوں کی مادی یا اخلاقی حمایت کی ہے اور ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو وہ بے چین نہ ہو جائے لیکن ہندوستان کے نہتے مسلمان جو اپنی جان کے بھی مالک نہیں۔ چونکہ ان فرائض کے ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے مذہبی علماء اس وقت یہ فتویٰ نہیں دیتے کہ وہ تلوار لیکر اٹھیں یا عالم میں خونریزی اور بدامنی پھیلائیں بلکہ وہ ان سے فقط یہ کہتے ہیں کہ اے غیرتمند اور حیادار مسلمانو! اگر تم میں یہ طاقت نہیں کہ اپنی خلافت اور مقامات مقدسہ کو دشمنوں کے پنجہ سے نکال سکو اور اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کر سکو تو کم از کم اس کی طاقت تو ہے کہ ان ظالموں کو جو تمہاری خلافت اور مقامات کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں تم اپنے گھر سے مدد مت پہنچاؤ۔ اور اسی کا نام ترک موالات یا ترک تعاون رکھا ہے جس کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک شخص جو تمہارے جھونپڑی میں آگ لگانا چاہتا ہے تم اس کو اپنے چولھے میں سے آگ مت دو کہ وہ تمہارے جھونپڑا پھونک دے اس کے بعد یہ گذارش۔ ہے کہ آج کل تمام یورپ کی حکومتیں تجارت پر چل رہی ہیں ان کی بہت بڑی امداد یہ ہے کہ ان کی تجارت کو فروغ دیا جائے اس لئے اس وقت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام اپنے دیس کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کریں ولایتی چیزوں کو خرید کر اپنی جیب کا روپیہ دشمنوں کی جیب میں نہ ڈالیں کہ وہ اس سے توپیں اور گولے بنا کر ان کی خلافت کا سینہ پاش پاش کریں خصوصاً کپڑے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ہم جو ولایتی کپڑا خریدتے ہیں اس سے دشمنوں کو بہت بڑی مدد پہنچتی ہے۔ مسٹر مدن موہن مالوی نے ناگپور میں بیان کیا ہے کہ وہ روپیہ جو فقط کپڑے کی خریداری میں ہر سال ہندوستان سے انگلستان جاتا ہے اس کی تعداد ساٹھ کروڑ ہے اب دوسری چیزوں کو اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے گذارش

ہے کہ ہندوستانی مسلمان اگر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد نہیں کر سکتے ہیں تو ان کے دشمنوں کی بھی ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ سے امداد نہ کریں بلکہ اپنے دیس کے کپڑے پر قناعت کریں اور اسی کا نام سودیشی ہے اور اس میں عورتیں اور مرد سب برابر ہیں لیکن چونکہ سودیشی کے عام رواج کے لئے بہت زیادہ سوت کی ضرورت ہے اس لئے بالخصوص عورتوں سے اتنی گذارش ہے کہ وہ سب تکلفات چھوڑ کر اپنا چرخہ سنبھالیں اور مفت میں جہاد کا ثواب کمائیں۔

موجودہ جنگ نے خدا کی قدرت کے ہزاروں کرشمے چشم عبرت کے سامنے رکھدیئے جس میں ایک بلند کو پست کیا گیا اور پست کو بلند ۔قوی کو ضعیف بنایا گیا اور ضعیف کو قوی۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں کا نام ونشان نہ رہا اور ضعفاء نے ان کی جگہ لے لی۔ ایک وہ وقت تھا کہ جب ۳ھ میں بعض لوگ غزوۂ احد سے بھاگ کر مدینہ منورہ میں داخل ہورہے تھے تو راستہ میں ام ایمنؓ مل گئیں جو آنحضرت ﷺ کی مولاۃ ہیں اور ابتداءً اس غزوہ میں میدان حرب کے اندر موجود تھیں زخمیوں کو پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت آپ کے سپرد تھی اور اسی جہاد میں ایک تیر بھی کھا چکی تھیں۔ حضرت ام ایمن نے جب ان لوگوں کو دیکھا کہ جہاد سے بھاگ کر آرہے ہیں تو چیخ اٹھیں کہ ’’اے نامردو! یہ میرا چرخہ تم لو اور اپنی تلوار میرے حوالہ کرو تمہارے ہاتھ تلوار اٹھانے کے قابل نہیں‘‘ (سیرت حلبیہ)

اسی طرح جب ۱۶۴۱ھ میں یورپ کے صلیب پرست نصاریٰ میں سے کانرڈ شاہ جرمنی اور لوئیس شاہ فرانس اپنی اپنی زبردست طاقتوں کے ساتھ ایک شدید صلیبی جنگ (کروسیڈ) کے لئے آمادہ ہوئے۔ ایک فرانسیسی مورخ کا بیان ہے کہ جب یہ صلیب پرست جنگ سے سخت ناکامی کے ساتھ اس طرح واپس آئے کہ ان کی کثرت ترکوں کے مقابلہ میں مچھروں کی کثرت ہوئی تو جن لوگوں نے اس جنگ میں ان کی مدد نہیں کی

تھی ان میں سے ہر ایک کے پاس چرخے اور تکلے بھیجے گئے اور کہا گیا کہ جب تم کروسیڈ (صلیبی جنگ) کے قابل نہیں ہو تو (چوڑیاں پہن لو اور) چرخے کا تا کرو محاوص ۴۳

خدا کی قدرت آج وہی چرخہ ہے جو انہیں صلیب پرستوں کے مقابلے میں توپ کا کام دے رہا ہے اور وہی چرخہ جس سے بزدلوں اور جہاد سے بھاگنے والوں کو عار دلایا جاتا تھا اور بصورت سزا ان کے سامنے رکھا جاتا تھا آج اس کا استعمال عین جہاد ہے اور اور اس کو موجودہ زمانہ کے عقلاء اپنی مشین گن کہتے ہیں مولانا محمد علی صاحب نے اودھ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ آج چرخہ کے نام سے لوگ چونکتے اور ہنستے ہیں لیکن جو آخر میں ہنستا ہے اسی کا ہنسنا ٹھیک ہوتا ہے۔ آج مانچسٹر اور ہم پر ہنس رہے ہیں لیکن جس وقت ہم سوراجیہ لے لیں گے وہ منہ بسور بسور کر روئیں گے جب سوت کاتے جانے کی خبر انگلستان پہنچے گی تو وہ سمجھ لیں گے کہ یہ لوگ آزادی حاصل کرنے پر تل گئے ہیں۔ ہمارا چرخہ ہمارا مشین گن ہے۔ ہماری گولی کی مار سات ہزار میل پر ہوگی۔ لوہے کی مشین گن انگریزوں کو مبارک رہے۔''

چرخہ کاتنے کی موجودہ تحریک اگر ایک طرف یورپ کے لئے عذاب ہے تو دوسری جانب ہندوستانیوں کے لئے بھی تازیانہ عبرت ہے اور ان کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے شریعت کی پاک تعلیمات کو چھوڑ کر اپنے آپ کو عورتیں بنالیا ہے تو اب وہی کام کرو جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

العبد الضعیف محمد شفیع الدیوبندی

غفرلہ ولوالدیہ خادم جمعیۃ الطلبہ دیوبند